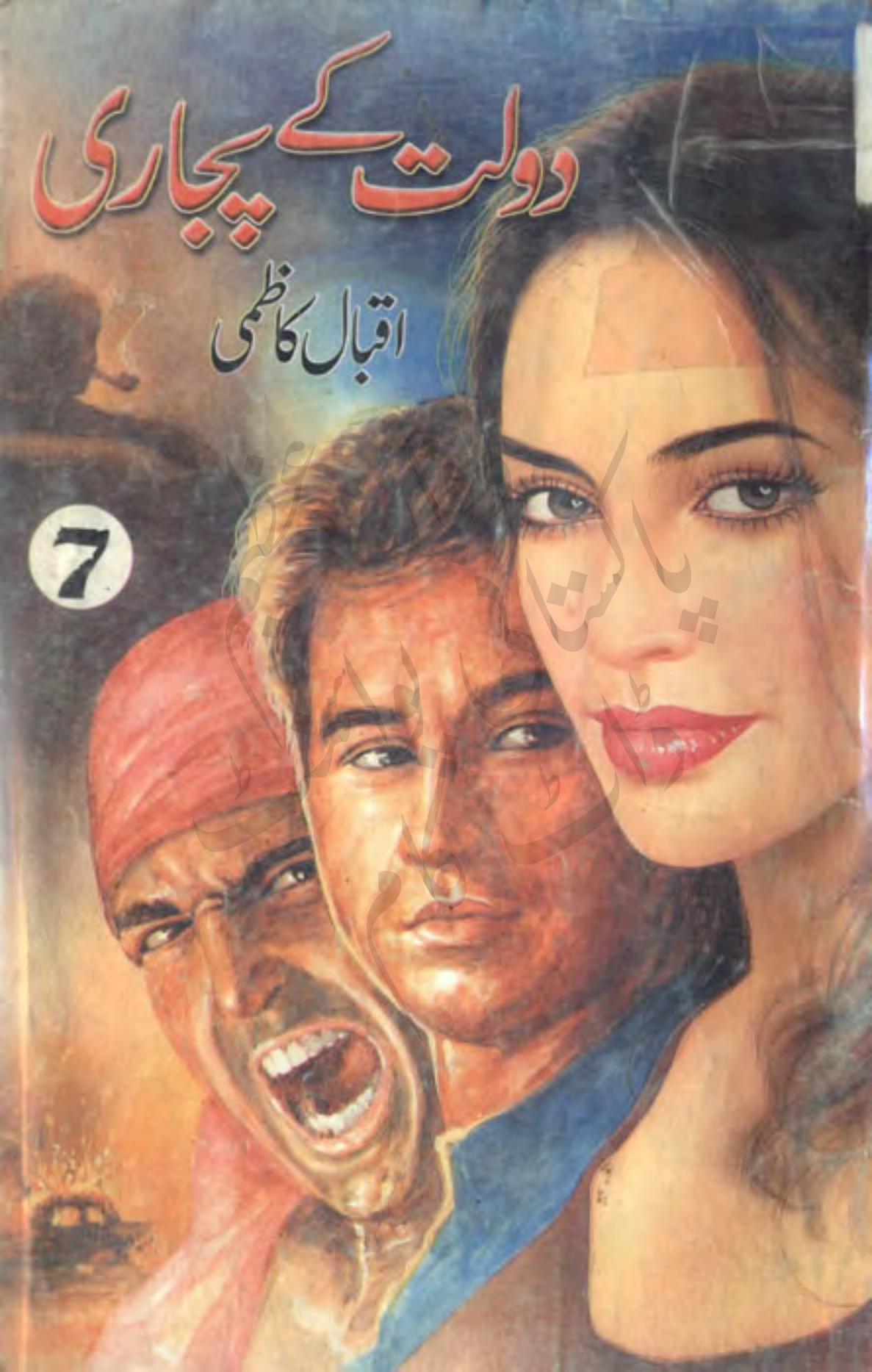


دولت کے پجاری

اقبال کاظمی

7



آئیڈیل پبلک لائبریری

0301-7283296

0334-9630911

عظیم احمد طارق

حاجی عبداللہ بری طرح بلبلایا ہوا تھا۔ اس روز جب اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ شارق اور ثمنہ گبرگ کی ایک کوٹھی میں جل کر راکھ ہو گئے ہیں تو اسے اس خبر پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کوٹھی کے کیراج میں اس کی بیوی کا جلا ہوا ڈھانچہ اور تہہ خانے سے سونے کے چند ٹکڑے بھی ملے تھے۔ یہی قیمتی بیوی شارق اور اس کے ساتھیوں نے اس کے داماو سے چھینی تھی اور اس میں سونے کے بسکٹوں سے بھری ہوئی پٹیاں بھی تھیں۔ سونے کے پچھلے ہوئے چند ٹکڑے اور بیوی کا جلا ہوا ڈھانچہ اگرچہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ثمنہ اور شارق اس کوٹھی میں تھے لیکن اسے اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں آگ میں جل کر مر گئے ہوں گے۔ یقین نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوٹھی کو آگ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی۔ حادثاتی طور پر لگنے والی آگ اس طرح اچانک نہیں پھیلی۔ اس عمارت میں رہنے والوں کو جان بچانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن یہ آگ اس طرح لگی تھی کہ اس نے چند سیکنڈ کے اندر اندر چاروں طرف سے پوری کوٹھی کو لپیٹ میں لے لیا تھا اور بعد میں یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ آگ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی بلکہ پڑول چھڑک کر لگائی گئی تھی۔ پڑول پوری کوٹھی میں اور چاروں طرف چھڑکا گیا ہو گا، اس لیے پوری کوٹھی آنا فانا آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

حاجی عبداللہ یہ سوچتا رہا کہ آگ اگر شارق نے لگائی تھی تو کوٹھی سے برآمد ہونے والی وہ دو لاشیں کس کی تھیں جو جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔

اسے یقین تھا کہ وہ لاشیں شارق اور ثمنہ کی نہیں تھیں۔ وہ دونوں اس طرح آسانی سے مرنے والے نہیں تھے۔ جس نے پورے ضلع کی پولیس اور اپنے مخالف گروہوں کے آدمیوں کو نچا رکھا تھا، وہ اس طرح آسانی سے کیسے مر سکتا تھا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ کوٹھی میں آگ لگنے سے پہلے سونا وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ کوٹھی کو آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ ممکن ہے پولیس کو اس کوٹھی پر شبہ ہو گیا ہو اور شارق نے اپنے خلاف تمام ثبوت مٹانے کے لیے کوٹھی کو آگ لگا دی ہو۔

ایک اور خیال بھی حاجی کے ذہن میں آیا تھا۔ ماجھا گجر کا ایک آدمی مجید بھی پچھلے دنوں شارق سے ٹکرایا تھا اور شارق نے اس کا ایک بندہ بھی مار دیا تھا۔ ہو سکتا ہے مجید نے موقع پا کر شارق کی کوٹھی کو آگ لگا دی ہو لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا کہ پچھلے چند روز میں شارق اور مجیدے میں کوئی جھڑپ ہوئی ہو۔

حالی، شارق اور شبنم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے تمام ذرائع استعمال کر رہا تھا۔ اس کے آدی پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے لیکن کسی طرف سے کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔

اور پھر حالی کو اس حلوے کی اطلاع بھی ملی تھی جس میں دلاور نامی ایک غنڈہ ہلاک ہو گیا تھا۔ دلاور کے بارے میں حالی کو اتنا معلوم تھا کہ وہ مانجھے گجر کے ساتھ کلام کرتا رہا تھا لیکن کچھ عرصہ سے روپوش تھا۔ اس حلوے میں ایک مزدور بھی زخمی ہوا تھا لیکن حالی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس حلوے کے دوسرے دن جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ٹیکسی کے حلوے میں زخمی ہونے والا مزدور شارق تھا جو ٹانگ ٹوٹ جانے کے بلوجود اسپتال سے فرار ہو گیا تھا تو حالی چونکا تھا۔ اس خبر سے اس کے ان خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ کوٹھی کی آگ میں مرنے والے شبنم اور شارق نہیں تھے۔

حالی کے آدی ایک بار پھر پورے شہر میں پھیل گئے تھے لیکن کئی روز گزر جانے کے بعد بھی وہ شارق کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ اسے حیرت تھی کہ شارق زخمی ہونے کے بلوجود کہاں عتاب ہو گیا۔ اس کے آدی شہر کے تمام پرائیویٹ اسپتالوں اور ڈاکٹروں کو بھی چیک کرتے پھر رہے تھے۔ شارق زخمی تھا اور اسے علاج کی ضرورت تھی اور وہ یقیناً کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرے گا لیکن اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

حالی نے اپنے ایک آدی کی ڈیوٹی اسپتال میں بھی لگا دی تھی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ شارق زخمی ہونے کے بلوجود اسپتال سے فرار کیسے ہوا تھا۔ آیا باہر سے کوئی آدی اسے لینے آئے تھے یا اس کے فرار میں اسپتال کے عملے کا کوئی آدی شامل تھا۔ حالی کو حالانکہ پولیس کی رپورٹ مل چکی تھی لیکن وہ اپنے طور پر بھی اطمینان کر لینا چاہتا تھا مگر دوسرے روز اس کے آدی نے جو رپورٹ دی وہ پولیس کی رپورٹ سے مختلف نہیں تھی۔

حالی عبداللہ جیسے جیسے اس معاملے پر سوچتا مزید الجھتا جاتا۔ حالی کے اپنے آدی شارق کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے تھے اور پھر اسے ایک اور خیال آگیا۔ چند روز پہلے شارق کی مجیدے سے کچھ جھڑپیں ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے مجیدہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ یہ خیال آتے ہی حالی نے اپنا ایک آدی مجیدے کو بلائے کے لیے بھیج دیا۔

حالی کے بلوے پر مجیدہ انکار نہیں کر سکا اور خاص طور پر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ حالی شارق کے معاملے پر بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اسی وقت اس آدی کے ساتھ چل پڑا تھا۔

حالی اس وقت اقبل ٹائون والی اسی کوٹھی میں تھا جو پہلے اس نے شارق کو دی تھی اور پھر دھوکے سے واپس لے لی تھی۔ مجیدے کا استقبال حالی نے بڑی گرجوشی سے کیا تھا۔ وہ کچھ دیر لوہرا دھر کی باتیں کرتے رہے، پھر حالی اصل موضوع پر آگیا۔

”شارق نے مجھے کے ساتھ جو کچھ بھی کیا“ اس کا مجھے افسوس ہے۔“ حالی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ شارق بت چلاک آدی ہے۔ وہ ایک سے دشمنی رکھتا ہے تو دوسرے سے دوستی تاکہ اسے صرف ایک ہی حلوے پر لڑنا پڑے۔ مانجھے سے جب اس کی حلوے آرائی ہو رہی تھی تو شارق نے مجھ سے دوستی رکھی تاکہ میں اس معاملے میں مداخلت نہ کروں اور یہ میری بہت بڑی غلطی تھی جس کا اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔ اب شارق ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ وہ میرے کئی بندے مار چکا ہے اور اس کے علاوہ مجھے کروڑوں روپے کا نقصان بھی پہنچا چکا ہے۔ اس نے تمہارا بھی ایک بندہ مارا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ مل کر اس کے خلاف کارروائی کریں۔ اگر ہم بکھرے رہے تو وہ ہمیں نقصان پہنچاتا رہے گا۔“

”اس نے میرے دو بندے مارے ہیں جی۔“ مجیدے نے کہا۔ ”میں تو چاہتا تھا کہ ہم مل کر کلام کریں گے مگر آپ کے پاس آنے سے جھجک رہا تھا۔ اب آپ نے بلایا ہے تو میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ہم الگ الگ رہ کر کچھ نہیں کر سکتے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں دوسروں کو بھی ساتھ ملا لینا چاہیے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے لیکن ہمارے ساتھ اور کون مل سکتا ہے۔“ حالی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کئی چھوٹے گروپ ہیں جو اپنے طور پر کلام کر رہے ہیں اور ان سب کو کسی نہ کسی موقع پر شارق سے نقصان پہنچا ہے۔ وہ سب شارق کے خلاف ہمارے ساتھ مل سکتے ہیں۔“ مجیدے نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم ان سب سے بات کر لو۔ دو دن بعد ہم ایک میٹنگ رکھ لیتے ہیں جس میں شارق کے خلاف ایک مشترکہ لائحہ عمل طے کر لیا جائے گا۔“ حالی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”لیکن کیا تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ شارق کہاں چھپا ہوا ہوگا۔“

”چند روز پہلے میں نے اسے ملکن روڈ پر دیکھا تھا۔ تیم خانے والے چوک سے تقریباً ایک میل آگے۔“ مجیدے نے کہا اور پھر اسے اسی واقعہ کی تفصیل بتانے لگا۔ جب اتفاقاً شارق سے آمنا سامنا ہوا تھا اور اس کا ساتھی شارق کو پکڑنے کی کوشش میں بس کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس واقعہ کے بعد میں تو تین چار روز تک روپوش ہی رہا تھا اور

جب پولیس نے ایک اتفاقی حادثہ قرار دے کر بات ختم کر دی تھی تو اس کے بعد میں گھر سے نکلا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ شارق نے اس علاقے میں اپنا کوئی اڈا بنا رکھا ہے۔ میں کئی روز تک اوھر ٹوہ لگاتا رہا لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میرا خیال ہے کہ شارق اتفاقاً اس طرف گیا ہوگا۔ اگر اس کا کوئی ٹھکانہ ہوتا تو وہ دوبارہ بھی اس طرف ضرور جاتا۔

”مجھے اس جگہ کے بارے میں بتاؤ۔ میں بھی ذرا اپنے طور پر اس علاقے کو چیک کروں گا۔“

حاجی نے کہا۔

تک وہ اپنے مختلف ٹھکانوں پر گھومتا رہا۔ پھر اپنے سینما والے دفتر میں آگیا۔ وہاں تین چار آدمی اس کے شکر بیٹھے تھے۔ دراصل چند ہفتے پہلے حاجی نے ایک فلم بنانے کا پروگرام بنایا تھا اور اس سلسلے میں انڈسٹری کے ایک دو فلم ڈائریکٹروں سے بھی بات کی تھی۔ ان سب ہی نے مشورہ دیا تھا کہ وہ پنجابی فلمیں شروع کرے۔ اردو فلموں کے مقابلے میں پنجابی فلمیں زیادہ بزنس کرتی تھیں اور ظاہر ہے حاجی کو پیسہ کماتا تھا۔ اس نے بیک وقت دو پنجابی فلموں کا پروگرام بنایا تھا اور اس وقت فلم انڈسٹری کے آدمی ہی وہاں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

حاجی تقریباً ایک گھنٹے تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے دو آدمیوں کو بڑی بڑی رقموں کے چیک بھی دیئے تھے تاکہ جن لوگوں سے ایگرمنٹ کرنے ہیں، انہیں ایڈوانس بھی دیا جاسکے۔

حاجی رات دس بجے تک سینما ہی میں رہا اور پھر اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں واپس آگیا۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کے وہ دونوں آدمی بھی آگئے جو صبح ملتان روڈ گئے تھے۔

”کچھ پتا چلا؟“ حاجی نے پوچھا۔

”ایک ایسی جگہ کا پتا چلا ہے جس پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔“ جیلے نامی کارندے نے جواب دیا۔

”تفصیل سے بتاؤ۔“ حاجی نے اسے گھورا۔ ”تم جانتے ہو میں اوھوری بات سننے کا عادی نہیں ہوں۔“

”بتاتا ہوں جی۔“ جیلا گڑبڑا گیا۔ ”ہم صبح سات بجے ہی اس علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں بہت سے مکان بن رہے ہیں۔ ہم ایک ایک مکان کے بارے میں معلوم کرتے رہے۔ بہت لمبا چوڑا علاقہ ہے جی۔ چند ہی گھروں میں لوگ رہ رہے ہیں۔ ہم ایک ایک سے پوچھتے پھرے لیکن کوئی مشتبہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ رات آٹھ بجے کے قریب اس طرف سے گزرنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے وہاں ایک حویلی میں کچھ لوگوں کو آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی لیکن کئی روز سے وہاں کوئی نہیں آیا، حویلی میں تالا لگا ہوا ہے۔“

”وہ حویلی کس کی ہے؟“ حاجی نے پوچھا۔

”ٹھوکر نیاز بیگ کا کوئی چودھری ہے جی۔ آس پاس کی زمینیں بھی اسی کی تھیں جن میں سے بیشتر زمینیں وہ بچ چکا ہے۔“ جیلے نے جواب دیا۔

”تم نے وہ حویلی دیکھی ہے؟“ حاجی نے پوچھا۔

”دیکھی ہے جی۔ بہت پرانی حویلی ہے۔ دیواریں بھی بہت اونچی ہیں۔“ جیلے نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ حاجی بولا۔ ”کرامت اور خورشید کو ساتھ لے جاؤ اور معلوم کرو، حویلی میں

مجیدے نے اس علاقے کی نشاندہی کر دی۔ اس کے بعد بھی وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر ان کی یہ مینٹگ ختم ہو گئی۔ حاجی نے مجیدے کو تاکید کر دی تھی کہ جیسے ہی شارق کا کوئی سراغ ملے، وقت ضائع کیے بغیر مجھے اطلاع کر دیتا۔ حاجی سے اس مینٹگ میں مجیدے نے کچھ فائدہ بھی اٹھایا تھا۔ ایک تو یہ کہ حاجی نے اسے آدمی قیمت پر ہیروئن سپلائی کرنے کا وعدہ کیا تھا اور دوسرا وعدہ یہ کیا تھا کہ وہ اس کے علاقے میں واقع اپنے پرچوں کے دونوں اڈے بند کر دے گا اور اس طرح ان اڈوں کا گاہک بھی اسی کے پاس آئے گا۔ مجیدہ جب حاجی کی کوٹھی سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ شارق کے خلاف کوئی کارروائی ہو یا نہ ہو، اس نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔

مجیدے کے جانے کے بعد حاجی نے اپنے دو آدمیوں کو بلا لیا۔ مجیدے نے ملتان روڈ کی نئی بستی میں شارق کے کسی ٹھکانے کے بارے میں جو شبہ ظاہر کیا تھا، حاجی اپنے طور پر بھی اس کے بارے میں تحقیق کر لینا چاہتا تھا۔

”تم دونوں کل صبح ملتان روڈ چلے جاؤ۔“ حاجی نے اپنے دونوں آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں ایک نئی کالونی بن رہی ہے۔ آبادی تو اکا دکا مکانوں میں ہوگی جبکہ زیادہ تر مکان ابھی زیر تعمیر ہیں۔ وہاں جو لوگ رہ رہے ہیں، ان کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور ان لوگوں کے بارے میں بھی جو وہاں اپنے مکان وغیرہ بنا رہے ہیں۔ جیسے ہی کوئی خاص بات معلوم ہو، مجھے اطلاع دیتا۔“

”اور اگر شارق کیس نظر آجائے تو؟“ ایک آدمی نے پوچھا۔ ”کیا اسے ختم کر دیا جائے؟“

”نہیں۔“ حاجی نے کہا۔ ”میرا تین کروڑ کا سونا اس کے قبضے میں ہے۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ سونا حاصل کرنے کے بعد ہی اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے جی۔ ہم صبح سویرے ہی اس طرف چلے جائیں گے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ جاؤ۔“ حاجی نے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔

حاجی اس رات اسی کوٹھی پر رہا تھا۔ صبح دس بجے کے قریب وہ کوٹھی سے نکل گیا۔ دوپہر

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بھی وہ خاصے محتاط تھے۔ پہلے کمرے میں پہنچ کر انہیں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں کسی قسم کی دھینگا مشق ہوئی تھی۔ دو چارپائیاں تھیں اور کھانے کے جھوٹے برتن ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک چارپائی کے قریب فلائٹین پین بھی پڑا ہوا ملا تھا۔

”دوسرے کمرے دیکھو۔“ جیلا دروازہ کی طرف مڑ گیا۔

”کھانے کے یہ جھوٹے برتن بتا رہے ہیں کہ یہاں کوئی آیا تھا اور شاید ان میں آپس میں کوئی جھگڑا بھی ہوا تھا۔“ کرامت نے کہا۔

”ہوا ہو گا۔“ جیلا بولا۔ ”ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں کون آیا تھا۔ پہلے دوسرے کمرے دیکھ لیں۔ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

وہ حویلی کے دوسرے کمرے دیکھنے لگے۔ راہداری میں ایک جگہ انہیں مردانہ جوتے بھی پڑے ہوئے ملے۔ وہ موکیشن تھے۔ ایک جوتا دوسرے سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔

حویلی کے تمام کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک اور کمرے میں دو چارپائیاں ملی تھیں۔ ایک چارپائی پر زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا بھی رکھا تھا۔

”یہاں کوئی عورت بھی رہتی تھی۔“ کرامت کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں کبھی کبھار دو تین آدمی آتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی ضرور ہوتی تھی۔ آخری مرتبہ دو عورتوں کو دیکھا گیا تھا اور پچھلے چند روز سے تو یہاں کوئی نہیں آیا۔“ جیل نے جواب دیا۔

”عیش کرتے ہوں گے وہ لوگ۔“ کرامت بولا۔ ”ویسے اس مقصد کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔“

وہ اس کمرے سے نکل آئے۔ اب وہ اس کمرے کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ جیل نے پہلے والا طریقہ اختیار کرتے ہوئے تالا توڑ دیا اور جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو پنل ٹارچ کی محدود روشنی میں لکڑی کی پیٹیاں دیکھ کر جیلے کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

اب تک انہوں نے کسی کمرے کی عقی نہیں جلائی تھی لیکن یہاں لکڑی کی پیٹیاں دیکھ کر جیلا ٹارچ کی روشنی میں دیواروں پر سوچ بورڈ تلاش کرنے لگا۔ دروازے والی دیوار پر سوچ بورڈ دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکا اور بیک وقت دو سوچ آن کر دیئے۔ کمرہ بلب کی تیز روشنی سے بھر گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ تینوں اچھل پڑے۔

کوئی رہ رہا ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے حویلی کا مالک ہی وہاں آتا جاتا ہو لیکن میں کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ آج رات میں بھی بیٹھ رہوں گا۔ مجھے بارہ بجے سے پہلے معلوم ہو جانا چاہیے۔“

”ہم اس سے پہلے ہی واپس آجائیں گے جی۔“ جیل نے کہا۔

”تم جاؤ۔ اب دیر مت کرو۔“ حلی بولا۔

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ کرامت اور خورشید بھی اسی کونجی میں موجود تھے۔ جیل نے ان لوگوں کو ساتھ لیا اور کار میں بیٹھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔

وہ لوگ تقریباً پونے گیارہ بجے وہاں پہنچے تھے۔ کار انہوں نے کچی گلی کے باہر ہی جھوڑ دی تھی۔ ایک آدمی کار میں بیٹھا رہا تھا۔ جیلا، کرامت اور خورشید گلیوں میں چلتے ہوئے حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔

”یہ ہے وہ حویلی۔“ جیل نے کرامت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اندر کوئی نہیں ہے۔ پھانک پر چڑھ کر آسانی سے دوسری طرف اترا جاسکتا ہے۔“

”تو پھر چڑھو اوپر۔ دیکھ کیا رہے ہو۔“ کرامت نے کہا۔

جیلا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تاریکی اور سناٹے میں جھینگروں کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جیلا پھانک پر چڑھ گیا۔ اوپر وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر بڑی احتیاط سے دوسری طرف اتر گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ حویلی کی عمارت بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے پھانک کی جھری سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔

”آجائے۔ حویلی میں سناٹا اور تاریکی ہے۔“

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد کرامت اور خورشید بھی پھانک پر چڑھ کر اندر آگئے اور جیلے کے قریب کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ان تینوں نے پستول نکل لیے۔

”میری اطلاع کے مطابق یہ حویلی عام طور پر خالی ہی رہتی ہے۔ یہاں کبھی کبھار ہی کوئی آتا ہے۔ اس وقت بھی یہاں کوئی نہیں ہے مگر پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ آہستہ آہستہ آگے چلو۔“ جیل نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

وہ تینوں دائیں بائیں پھیل کر آگے بڑھنے لگے لیکن انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بڑی آسانی سے برآمدے میں پہنچ گئے۔ جیلے نے ٹٹول کر دیکھا تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے پنل ٹارچ نکل لی اور اس کی روشنی میں جائزہ لینے لگا۔ دسی قسم کا تالا تھا۔ اس نے پستول کی ٹال تلے پر پھنسا کر زوردار جھٹکا دیا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔

چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی کیونکہ رضیہ نے کبھی یہاں فون نہیں کیا تھا بلکہ اس وقت تو وہ سو رہی ہوتی تھی۔

”ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ ویسے کل تم لوگ جو سالان لے کر گئی تھیں، وہ بہت خراب حالت میں اسپتال پہنچ گیا ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”کیا؟“ ثینہ اچھل پڑی۔ رضیہ کا مطلب سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔ ”تم کہاں سے بول رہی ہو رضیہ؟“

”ایک میڈیکل اسٹور سے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”تم اپنے کوارٹر پر پہنچو۔ میں آرہی ہوں۔“ ثینہ نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور شاہ پری کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا..... کس کا فون تھا؟“ شاہ پری نے پوچھا۔ ثینہ کے چہرے کے تاثرات سے وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی گریز ضرور ہے۔

”گریز ہو گئی۔“ ثینہ نے جواب دیا۔ ”رفیق کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی ہے۔“

”کیا.....؟“ شاہ پری اچھل پڑی۔ ”لیکن وہ لاش کیسے ملی؟“

”نرس رضیہ کا فون تھا۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور سے بات کر رہی تھی اور ظاہر ہے فون پر

کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم رضیہ کے گھر جا رہے ہیں۔“

”میں تیار ہوں، صرف چادر اوڑھنی ہے۔“ شاہ پری نے کہا۔

”اپنے لباس میں پستول بھی رکھ لو۔ آج شاید اس کی ضرورت پڑ جائے۔“ ثینہ کہتے ہوئے

نوٹکھا والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے نوٹکھا کو بھی اس نئی صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

”یہ تو بڑی گریز ہو گئی۔“ نوٹکھا بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ شارق اور رضیہ کی زندگی بھی

خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

”ہاں۔ میں اور شاہ پری اسی لیے وہاں جا رہی ہیں کہ شارق کو وہاں سے نکال سکیں۔“ ثینہ

نے کہا۔

”لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ رفیق کی لاش کا پتہ کیسے چلا۔ اسے تو ہم نے باندھ کر کنویں

میں پھینک دیا تھا۔“ قریب کھڑی ہوئی شاہ پری نے کہا۔

”اگر کنویں سے لاش دریافت ہو سکتی ہے تو کمرے میں بھرا ہوا اسلحہ اور ہیروئن کے پیکٹ

بھی محفوظ نہیں رہے ہوں گے۔ کروڑوں کا مال ہے وہ شاہ پری۔ سب سے پہلے ہمیں شارق کو

رضیہ کے کوارٹر سے نکالنا ہے اور اس کے بعد ہی معلوم کرنا ہے کہ کوئی اس حویلی تک کیسے

وہ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹیوں کی طرف دیکھتے رہے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ پھر وہ تینوں بیک وقت آگے بڑھے اور ایک ایک بیٹی کھول کر دیکھنے لگے۔

اسلحہ سے بھری ہوئی پیٹیاں اور ہیروئن سے بھرے ہوئے پیکٹ۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہونے والا حویلی شارق ہی کا خفیہ اڈا ہے لیکن انہیں حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ یہاں کروڑوں کا مال تھا اور اس کی حفاظت کے لیے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

”شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شارق کو اس اڈے کے محفوظ ہونے کا یقین ہو گا۔“ جیلے نے کہا۔ ”تم لوگ یہاں سے ایک رات نقل اٹھا لو اور یہاں پہرہ دیتے رہو۔ میں جا کر حاجی کو اطلاع دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ..... ہم یہاں موجود ہیں۔“ کرامت نے کہا۔

نبیلا تیزی سے کمرے سے نکلا۔ پھر گیٹ پر چڑھ کر وہ گلی میں کود گیا۔ کار تک پہنچنے میں اسے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شیدے کو کوٹھی چلنے کو کہا۔ کار گلی سے نکل کر سڑک پر آگئی اور طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔



صبح کے دس بجے تھے۔ رات کو حویلی سے واپس آنے کے بعد بھی ثینہ اور شاہ پری نوٹکھا کے کمرے میں بیٹھی دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں اور پھر تین بجے کے قریب وہ اپنے کمرے میں آکر سو گئی تھیں۔

شاہ پری تو صبح جلدی اٹھ گئی تھی لیکن ثینہ ابھی تک سو رہی تھی۔ رضیہ سودا وغیرہ لینے کے لیے مارکیٹ گئی ہوئی تھی۔ شاہ پری کبھی نوٹکھا کے پاس آکر بیٹھ جاتی، کبھی ماں جی کے پاس اور کبھی برآمدے میں آکر کرسی پر بیٹھ جاتی۔ وہ اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

سوا دس بجے کے قریب ثینہ جاگ گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور برآمدے میں آکر شاہ پری کے پاس بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی تو وہ دونوں اٹھ کر اندر آگئیں۔ فون کا ریسیور ثینہ ہی نے اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔ میں رضیہ بول رہی ہوں۔ نرس رضیہ۔“ ریسیور پر آواز ابھری۔

”رضیہ؟ خیریت تو ہے۔ کیا بات ہے؟“ ثینہ نے پوچھا۔ نرس رضیہ کی آواز جتنے ہی اس کی

پہنچا۔

”ہو سکتا ہے تم لوگوں کے آنے کے بعد کوئی شخص چوری کی نیت سے حویلی میں داخل ہوا ہو اور اس نے۔۔۔۔۔“

”چوری تو گھروں میں کی جاتی ہے، کتوں میں نہیں جھانکا جاتا۔“ ثینہ نے نوکھا کی بات کٹ دی۔ ”یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ پولیس وہاں تک کیسے پہنچی۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی، پھر بولی۔ ”اوہ۔ ایک منٹ۔ میں انسپکٹر عثمان سے بات کرتی ہوں۔“

وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگئی اور فون کا ریسیور اٹھا کر انسپکٹر عثمان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لائن ملنے پر ریسیور کسی بچے نے اٹھایا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انسپکٹر عثمان کی آواز سنائی دی۔

”میں ثینہ بول رہی ہوں عثمان صاحب۔“ ثینہ اس کی آواز پہچان کر بولی۔

”اوہ شکر ہے رابطہ تو ہوا۔“ عثمان بولا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس تم لوگوں کا کوئی کوٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔ کسی ایمرجنسی میں تم لوگوں سے رابطہ نہیں ہو سکتا۔“

”میں نے ایک اہم کام کے لیے فون کیا تھا۔ بہر حال پہلے آپ بتائیں کہ ایمرجنسی کیا ہے؟“ ثینہ بولی۔

”مگز شب رات حاجی کے آدمیوں نے ملتان روڈ کے قریب واقع ایک حویلی پر چھاپہ مار کر وہاں سے کروڑوں روپے مالیت کا اسلحہ اور ہیروئن برآمد کی ہے۔۔۔۔۔“

”اوہ۔“ ثینہ نے اس کی بات کٹ دی۔ ”تو یہ حاجی کی حرکت ہے۔ بہر حال تفصیل سے بتاؤ۔ میں نے بھی اسی چکر میں فون کیا تھا۔“

”مجھے یہ سب کچھ آج صبح ہی معلوم ہوا ہے۔“ انسپکٹر عثمان نے کہا۔ ”حاجی کے آدمی تم لوگوں کی تلاش میں تو تھے ہی، کل رات اس نے مجیدے کو بلایا تھا اور مجیدے نے اسے بتایا تھا کہ شارق کو ملتان روڈ کے علاقے میں دیکھا گیا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ شارق نے اس علاقے میں کوئی خفیہ اڈا بنا رکھا ہے۔ حاجی کے آدمی اس علاقے کو چیک کرتے ہوئے کل رات کسی طرح اس حویلی تک پہنچ گئے جہاں ایک کمرے میں ہیروئن کے پکٹ اور اسلحہ کی پٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فوراً حاجی کو اطلاع دیدی۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی حاجی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی حاجی کے ساتھ حویلی گیا تھا۔ مزید اسلحہ یا ہیروئن کی تلاش میں انہوں نے اس کتوں کو بھی چیک کیا تھا جس میں ایک لاش پڑی تھی۔ لاش کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ حاجی نے اسلحہ وغیرہ تو اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر منتقل کر دیا اور پولیس کو اس لاش کے بارے میں گم نام اطلاع

دیدی۔ پولیس نے وہ لاش کتوں سے نکل کر اسپتال بھجوا دی ہے۔ حاجی نے پولیس کو ابھی یہ نہیں بتایا کہ وہ حویلی تم لوگوں کا خفیہ ٹھکانا تھا لیکن مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد پولیس کو یہ بھی بتا دے گا تاکہ پولیس تم لوگوں کی تلاش میں زیادہ سرگرم ہو جائے۔ شارق کہاں ہے؟“

”وہ زخمی ہے اور ایک محفوظ جگہ پر ہے۔“ ثینہ نے جواب دیا۔ ”تم حاجی پر نگاہ رکھو۔ میں بعد میں تمہیں فون کروں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ اسی وقت رضیہ بھی مارکیٹ سے واپس آگئی۔

”رضیہ! یہ برقع اتار کر مجھے دو۔ جلدی کرو۔“ ثینہ بولی۔

”خیریت!“ رضیہ پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”خیریت ہی نہیں ہے۔ جلدی کرو۔“ ثینہ بولی۔

ثینہ اپنا برقعہ ہٹے ہوئے تھی۔ شہ پری بھی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ رضیہ نے اپنا برقعہ اتار کر ثینہ کے حوالے کر دیا۔ ثینہ نے برقعہ لپیٹ کر پلاسٹک کے ایک تھیلے میں ٹھونس لیا اور باہر آگئی۔ کوحی سے نکلنے سے پہلے اس نے طفیل کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

ان کے پاس آج کل کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ رکشہ ٹیکسیوں پر ہی سفر کر رہے تھے لیکن اس وقت انہیں کسی گاڑی کی ضرورت تھی۔ ثینہ نے طفیل کو اس ضرورت سے آگاہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کوئی مسئلہ ہی نہیں ثینہ بی بی۔“ آپ لوگ ادھر کی گلی سے نکل کر مین روڈ پر میرا انتظار کریں، میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔“

طفیل بائیں طرف مڑ گیا تھا اور رضیہ اور شہ پری دائیں طرف کی گلی میں مڑ گئیں۔ مین روڈ پر پہنچ کر وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ انہیں تقریباً دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ نیلے رنگ کی ایک کار ان کے قریب آکر رکی تو اسٹیرنگ کے سامنے طفیل کو دیکھ کر ثینہ نے جلدی سے دروازہ کھولا اور دونوں بچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ طفیل نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”کہاں جانا ہے ثینہ بی بی؟“ طفیل نے سامنے والا آئینہ ایڈجسٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہسپتال، رہائشی علاقے میں۔“ ثینہ نے جواب دیا۔ ”یہ گاڑی کہاں سے ملی؟“

”ایک گلی میں کھڑی تھی۔“ طفیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اگر گاڑی کی گمشدگی کا پتہ چل گیا تو۔۔۔۔۔“

”پتا نہیں چلے گا ثینہ بی بی۔“ طفیل نے اس کی بات کٹ دی۔ ”اس لیے کہ ڈرائیور بھی گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔ اس کا منہ اور ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ وہ بیچارہ کسی کو کیا بتا سکتا

ہے۔“

ثینہ نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ تقریباً چالیس منٹ میں وہ اسپتال پہنچ گئے۔ طفیل گاڑی کو رہائشی علاقے والے گیٹ کے اندر لیتا چلا گیا اور پھر ثینہ کی ہدایت پر اس نے گاڑی رضیہ کے کوارٹر کے سامنے اس طرح روکی کہ اس کا پچھلا دروازہ کوارٹر کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ پڑوس والے کوارٹر کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے۔ ثینہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں رفیق کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وہ کار سے اتر آئیں۔ ثینہ نے دروازہ کھٹکھٹایا تو چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی رضیہ نے دروازہ بند کر لیا۔

”میرا خیال ہے کہ لاش کی شناخت ہو گئی ہے۔“ ثینہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں۔ اسپتال کا پورا اسٹاف اسے جانتا ہے لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ رفیق کی بیوی نائٹ ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد آٹھ بجے گاؤں چلی گئی تھی۔ وہ شام تک واپس آئے گی۔“ نرس رضیہ نے بتایا۔

”تم پر تو کسی کو شبہ نہیں ہوا؟“ ثینہ نے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”ہم شارق کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ تم بھی اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لو اور ہمارے ساتھ چلو۔“ ثینہ نے کہا۔

”میرا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ رضیہ نے کہا۔ ”اگر میں غائب ہو گئی تو مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔ اس لیے میرا یہاں رہنا ہی بہتر ہے۔“

”پولیس کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا جس حویلی سے رفیق کی لاش برآمد ہوئی ہے، اس سے شارق کا کوئی تعلق ہے لیکن پولیس بہت جلد یہ معلوم کر لے گی کہ رفیق اس حویلی میں کس طرح پہنچا تھا۔ ایسی صورت میں.....“

”اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں فوراً یہاں سے نکل جاؤں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔ شارق کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“ رضیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے رضیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”رضیہ کا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں رہ کر یہ حالات پر نگاہ تو رکھ سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ثینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر تم چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور رضیہ تم۔“ وہ رضیہ کی طرف گھوم گئی۔ ”تم اپنے آپ کو تہامت سمجھنا۔ اگر تمہیں ذرا بھی شبہ ہو کہ تمہارا نام اس معاملے میں لیا جا رہا ہے تو فوراً گلبرگ والی کوٹھی آجانا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم میری فکر مت کرو۔“ رضیہ نے کہا۔

شارق اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے پستول بھی نکل کر قبض کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

”لو..... یہ برقع پہن لو۔ اس کے بغیر تو تم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔“ ثینہ نے تھیلے سے برقع نکال لیا۔

”یہ وقت بھی آتا تھا کہ مجھے برقع پہننا پڑے۔“ شارق مسکرایا۔

ثینہ نے اسے سارا دے کر کھڑا کر دیا اور شارق کو برقع پہننے میں مدد دینے لگی۔ اس دوران رضیہ نے ہر وہ نشان مٹا دیا جس سے یہاں شارق کی موجودگی ثابت ہوتی ہو۔ اس نے شارق کی دوائیں بھی ایک تھیلے میں ڈال کر شاہ پری کے حوالے کر دی تھیں۔

پچھلے دس بارہ دن مکمل آرام کی وجہ سے شارق کی ٹانگ خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ وہ بغیر سہارے کے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ گاڑی دروازے کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ ان کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ رضیہ نے دروازہ کھولا تو اپنی ماں اور بہن کو دیکھ کر وہ کسی قدر گزبوا سی گئی۔ شارق کے چہرے پر غائب گرا ہوا تھا جبکہ ثینہ اور شاہ پری کی صرف آنکھیں برہنہ تھیں۔

”یہ میری سیلیاں ہیں اماں۔“ رضیہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہت دیر سے آئی ہوئی تھیں، واپس جا رہی ہیں۔ آپ اندر چل کر بیٹھئے، میں انہیں رخصت کر کے آتی ہوں۔“

رضیہ کی ماں اور بہن کمرے کی طرف چلی گئیں۔ پہلے شاہ پری دروازے سے نکل کر سامنے کھڑی ہوئی کار میں بیٹھی، پھر شارق گاڑی میں کھس گیا اور آخر میں شارق کے ساتھ ثینہ بیٹھی تھی۔ رضیہ کار کی کھڑکی پر جھکی مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ طفیل نے کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا اور جب گاڑی حرکت میں آئی تو رضیہ سیدھی ہو کر ہاتھ ہلانے لگی۔ گاڑی مڑ کر گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ رضیہ نے رفیق کے کوارٹر کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ان لوگوں کے پاس دو پولیس والے بھی کھڑے تھے۔ ایک آدمی نے رضیہ کے کوارٹر کی طرف اشارہ کیا اور پولیس والے اس کی طرف آئے لگے۔ رضیہ دروازے میں داخل ہونا چاہتی تھی کہ ایک پولیس والے نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ رضیہ مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ ان پولیس والوں میں ایک اے ایس آئی تھا اور دوسرا ہیڈ کانسیبل۔

”معاف کیجئے سسر۔“ اے ایس آئی اس کے قریب آکر بولا۔ ”آپ کے پڑوس میں رہنے

”ٹھیک۔ آپ کا بہت شکریہ۔“ اے ایس آئی نے کہا اور دوبارہ اس طرف چلا گیا جہاں اب بھی محلے کے لوگ کھڑے تھے۔
رضیہ نے اندر آکر دروازہ بند کر دیا اور کمرے میں ماں اور بہن کے پاس آگئی۔



وہ سب شارق والے کمرے میں جمع تھے۔ انہیں کوٹھی میں چھوڑنے کے بعد طفیل اس گاڑی کو اس علاقے سے بہت دور چھوڑ آیا تھا۔ کار کا مالک بندھا ہوا ڈکی میں پڑا ہوا تھا۔ طفیل نے اس کے ہاتھ پیر تو نہیں کھولے تھے البتہ ڈکی کا ڈھکنا کھول دیا تھا تاکہ اوہر سے گزرنے والا کوئی شخص اسے دیکھ کر بندشوں سے آزاد کر دے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا تھا اور اس نے ٹینے کو بتایا تھا کہ گاڑی اس نے کہاں چھوڑی تھی۔

شارق کو ٹینے والے کمرے میں بستر پر لٹا دیا گیا۔ نوکھا بھی اسی کمرے میں آگیا تھا۔ رضیہ ان کے لیے چائے بنا لائی تھی۔ شارق نے رضیہ اور ماں جی کو اگرچہ ہر معاملے سے الگ رکھا تھا لیکن کچھ عرصہ سے صورتحال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ وہ رضیہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھ پا رہا تھا۔ رضیہ محض باتوں کی حد تک ان کی شریک تھی۔ عملی طور پر شارق اسے کبھی آگے نہیں لایا تھا اور نہ ہی وہ ایسا چاہتا تھا۔ باتوں کی حد تک وہ اس وقت بھی ان کی شریک تھی۔ گفتگو کا موضوع وہ حویلی ہی تھی۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حاجی کے آدمی اس حویلی تک کیسے پہنچے تھے؟“ شارق نے کہا۔

”مجھے انسپکٹر عثمان نے بتایا تھا۔“ ٹینے نے کہا۔ ”حاجی نے مجیدے کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ مجیدے نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ اس علاقے میں شارق کا کوئی خفیہ ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے وہ حویلی تلاش کر لی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش رہی، پھر عثمان سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔“ شارق اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”حاجی کے آدمی وہاں پہنچ گئے تھے، انہوں نے کنویں میں پڑی ہوئی لاش کے بارے میں تو پولیس کو بتا دیا۔ اسلحہ اور ہیروئن کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟“

”کیسے بتا سکتا تھا شارق باؤ۔“ نوکھا نے کہا۔ ”یہ اسلحہ اور ہیروئن ہی تو اس کا ایمان ہے۔ کروڑوں کے اس مال کے بارے میں وہ پولیس کو کیسے بتا سکتا ہے۔“

والی نرس صائمہ... کیا آپ انہیں جانتی ہیں۔“

”عجیب سا سوال کیا ہے آپ نے۔“ رضیہ نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کی پڑوشیں ہیں اور ایک ہی جگہ کالم کرتی ہیں۔ پھر نہ جاننے کا کیا سوال۔“

”میرا مطلب ہے آپ بتا سکیں گی کہ سسٹر صائمہ کہاں گئی ہوئی ہیں اور کب تک واپس آئیں گی؟“ اے ایس آئی بولا۔

”وہ صبح سات بجے میرے ساتھ ہی ڈیوٹی سے واپس آئی تھی۔ شاید گاؤں گئی ہے، اپنے گھر والوں سے ملنے۔ شام تک آجائے گی۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”کون سے گاؤں؟“

”اس کے والدین لکھنؤ میں رہتے ہیں لیکن گھر کا پتا مجھے معلوم نہیں۔“ رضیہ نے کہا۔ ”لکھنؤ میں تو بہت بڑا گاؤں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ایڈریس کے بغیر کسی کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال۔“ اے ایس آئی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو آپ کو پتا چل گیا ہو گا کہ صائمہ کے شوہر رفیق کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی لاش یہاں سے میلوں دور ایک حویلی کے کنویں سے ملی ہے۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ اسے قتل بھی کہا جاسکتا ہے۔ آپ تو ان کے پڑوس میں رہتی ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کیسے تھے؟“

”آپ کو اور بھی بہت سے لوگوں نے بتایا ہو گا کہ رفیق کھٹو تھا۔ اپنی بیوی کی کمائی پر پل رہا تھا۔ بیوی کو مارتا پیتا بھی تھا اور دوسری عورتوں کے پیچھے بھی بھاگا پھرتا تھا۔“

”کہا آپ کے خیال میں اس کی موت میں بیوی کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”میں ایسا نہیں سمجھتی۔“ رضیہ نے کہا۔ ”صائمہ کا شمار ایسی عورتوں میں ہوتا ہے جو شوہروں کا ظلم تو برداشت کر لیتی ہیں لیکن احتجاج نہیں کرتیں۔ ویسے بھی وہ رات کو ڈیوٹی پر تھی۔“

”ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ رفیق کا آپ سے بھی کچھ ملنا چلتا تھا؟“

”جی ہاں۔ کبھی کبھار آتے جاتے گپ شپ ہو جاتی تھی۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”آپ سے اس کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“ اے ایس آئی نے پوچھا۔

”کل شام کو جب میں ڈیوٹی پر جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی تو وہ اپنے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا البتہ صبح ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد میں سو رہی تھی کہ انہی کو انٹروں میں رہنے والے ایک آدمی نے جگا کر بتایا کہ رفیق کی لاش ملی ہے اور اس کی بیوی صائمہ گھر پر نہیں ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بولی۔ ”اب میں اجازت چاہوں گی آفیسر۔ میری والدہ اور بہن آئی ہوئی ہیں۔ مجھے شاید ان کے ساتھ گھر جانا پڑے۔“

”تصویریں بھی ہیں اور نیگیٹو بھی لیکن اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”وہ بڑے کام کا آدمی ہے اور میں اس سے کچھ اور کام لینا چاہتی ہوں۔ بہر حال اب یہ موضوع ختم۔ اب کسی اور موضوع پر بھی کچھ باتیں ہو جائیں۔“ ٹینہ نے کہا اور پھر واقعی اس موضوع پر انہوں نے مزید کوئی بات نہیں کی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ تاش لے کر بیٹھ گئے اور شام چھ بجے تک تاش کھیلتے رہے۔ اس دوران ٹینہ نے دو تین مرتبہ انسپکٹر عثمان کو فون کیا تھا لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ سات بجے کے قریب انسپکٹر عثمان فون پر مل گیا۔

”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں عثمان۔“ ٹینہ نے کہا۔ ”آج رات ساڑھے آٹھ بجے مال روڈ پر ٹیزان میں میرا انتظار کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”میں پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں حاجی کے بارے میں کچھ باتیں بھی بتانا چاہتا ہوں۔“

”تمام باتیں ملاقات پر ہوں گی۔“ ٹینہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس نے شاہ پری سے تیار ہونے کو کہا اور پھر خود بھی کمرے میں آکر اس نے دروازہ بند کر لیا اور کپڑوں والی الماری کھول لی۔ کئی روز پہلے اس نے انارکلی سے دو تین ساڑھیاں خریدی تھیں اور بلاؤز وغیرہ بھی سلوائے تھے لیکن اس کے بعد حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا تھا کہ وہ ساڑھی کا شوق پورا نہیں کر سکی تھی اور آج وہ ساڑھی پہننے کے موڈ میں تھی۔

چینی کوٹ اور بلاؤز پہننے کے بعد وہ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی اور چہرے پر میک اپ کرنے لگی۔ اس نے ہونٹوں کے دائیں کنارے کے قریب مسور کے دانے کے برابر ایک تل بھی بنا لیا تھا جو خوب چم رہا تھا۔ میک اپ کر کے اس نے دراز میں سے سفید شیشوں والی ایک عینک بھی نکال کر آنکھوں پر لگائی۔ فریم بہت خوبصورت تھا۔ پھر اس نے ساڑھی اپنی اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

ٹینہ نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اس میں رکھی ہوئی چیزیں چیک کیں، پھر میز کی دراز سے کچھ رقم اور پستول نکال کر بیگ میں رکھا اور بیگ کا اسٹریپ کندھے پر لٹکا کر کمرے سے باہر آگئی۔ جب وہ شارق کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

”اس نے ابھی تک پولیس کو یہ نہیں بتایا کہ اس حویلی سے ہمارا کوئی تعلق ہے لیکن پولیس جلد یہ معلوم کر لے گی۔ رفت کی لاش حویلی کے کنویں سے ملی ہے۔ رفت اسپتال کی ایک نرس کا شوہر تھا اور میں زخمی حالت میں اسپتال سے فرار ہوا تھا۔ پولیس یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرے گی کہ رفت کا اس حویلی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ پولیس کی تحقیق کسی ایک جگہ نہیں رکتی۔ تحقیق و تفتیش کا دائرہ مزید وسیع ہوگا تو بات نرس رضیہ تک پہنچے گی اور اس طرح وہ خطرے میں پڑ جائے گی۔ ویسے میں نے تو کہا بھی تھا کہ اس جنجال میں پڑنے کی بجائے ہمارے ساتھ ہی نکل چلے لیکن تم نے ہی میری بات کی مخالفت کی تھی۔“

”رضیہ نے ویسے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کا غائب ہو جانا اسے مشتبہ بنا دے گا۔“ شارق نے کہا۔ ”پولیس اگر رفت کا حویلی سے کوئی ناٹھ قائم کرے گی تو یہ شبہ تو ضرور کیا جائے گا کہ شارق وارڈ سے فرار ہو کر اسپتال کی حدود میں کسی جگہ روپوش رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ پولیس والے سیدھے رضیہ کے پاس پہنچ جائیں۔ حویلی کے کنویں سے رفت کی لاش ملی ہے تو پولیس یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ اس کا شارق سے کوئی تعلق تھا۔ پولیس یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ رفت ہی نے شارق کو پناہ دی تھی اور اسے کہیں چھپائے رکھا تھا۔ پھر وہ کسی طرح شارق کو وہاں سے نکال کر اس حویلی میں لے گیا ہوگا۔ وہاں اس کا شارق یا اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہو گیا ہوگا جس پر انہوں نے رفت کو باندھ کر کنویں میں پھینک دیا۔ رفت اور شارق کا تعلق جوڑ لینے کے بعد پولیس رفت کی بیوی کو پریشان کرے گی۔ ضمنی طور پر ہو سکتا ہے کہ رضیہ سمیت دوسرے پڑوسیوں سے بھی رابطہ کیا جائے لیکن وہ براہ راست کسی پر شبہ نہیں کر سکتے۔“

”یہ تو خیر الگ بحث ہے۔“ ٹینہ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”لیکن ایک بات طے ہے کہ حاجی نے ہمیں چپت لگا دی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے چپت لگائی ہے، میں اسے ایسا تھپڑ لگاؤں گا کہ وہ ناچ کر رہ جائے گا۔“

”تم ابھی کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔“ ٹینہ نے اسے گھورا۔ ”حاجی کو یہ تھپڑ میں لگاؤں گی۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ اب میرا کام دیکھو کہ میں کیا کرتی ہوں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی۔ ”چند روز میں ہی حاجی اگر تمہارا نام نہ بھول جائے اور میرے نام کی دہائی نہ دینے لگے تو میرا نام بدل دینا لیکن پہلے ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھو۔“ شارق نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”انسپکٹر عثمان کی تصویریں تمہارے پاس موجود ہیں یا ضائع کر دیں؟“ ٹینہ نے پوچھا۔

”پکرا گئے نا؟“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس وقت تو میں واقعی چکرا گیا تھا۔ اس روپ میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے تمہیں۔“ شارق نے اس کے سر ہلکا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”عورت کے کئی روپ ہوتے ہیں۔“ ثینہ مسکرائی۔ ”تم میرے کئی روپ دیکھ چکے ہو۔ اب دیکھنا اس روپ میں کیا گل کھلاتی ہوں۔“

”کہاں جا رہی ہو؟“ شارق نے پوچھا۔

”میں نے انسپکٹر عثمان کو ساڑھے آٹھ بجے شیزان میں وقت دیا ہے۔ شاہ پری میرے ساتھ جا رہی ہے۔ واپسی پر دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔“ ثینہ نے کہا۔ اس دوران شاہ پری بھی وہاں آگئی۔ اس نے اگرچہ شلوار سوٹ پہنا تھا لیکن بالوں کے بدلے ہوئے اسٹائل سے اس میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ کوٹھی سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہی انہیں ٹیکسی مل گئی تھی اور جب وہ شیزان کے سامنے ٹیکسی سے اتریں تو ٹھیک ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وہاں پر اس وقت بڑی چل پھل تھی۔ خصوصاً شیزان کے سامنے تو بڑی رونق تھی۔ ریسٹورنٹ کے سامنے بھی کچھ بے فکرے کھڑے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔

ریسٹورنٹ کے اندر کا ماحول بڑا خوبصورت تھا۔ مدھم روشنیاں تھیں۔ مرکزی دروازے سے چند قدم آگے شیشے کا بہت بڑا ایکویریم تھا جس میں رنگ برنگ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ ہر میز پر کوئی نہ کوئی عورت ضرور نظر آرہی تھی۔ ان میں اوجڑ عمر بھی تھیں اور جوان بھی لیکن زیادہ تعداد جوان لڑکیوں کی تھی جن کا تعلق ایسے دولت مند گھروں سے تھا جن میں رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنے اور بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومنے پھرنے پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔

ثینہ ایکویریم کے قریب رک کر متحس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ انسپکٹر عثمان شیشے کے قریب والی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا اور بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ثینہ نے اسے ساڑھے آٹھ کا وقت دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ آٹھ بجے سے ہی یہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔

ہال میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ ثینہ اور شاہ پری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دیے ریسٹورنٹس میں عام طور پر گگے بندھے گاہک ہی آتے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں اکثریت ایسے ہی گاہکوں کی تھی اور انہوں نے ان دو حسیناؤں کو پہلی بار دیکھا تھا۔

ثینہ نے شاہ پری کو اشارہ کیا اور وہ دونوں نے تانے قدم اٹھائی ہوئی عثمان والی میز کی طرف

چلے گئیں۔ انسپکٹر عثمان بھی ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی تھی۔ وہ دونوں اس کی میز کے قریب رک گئیں۔

”کیا ہم یہاں بیٹھ سکتی ہیں؟“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”اوہ۔۔۔ ضرور۔۔۔“ انسپکٹر عثمان نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کچھ اور گہری ہو گئی تھی اور وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”آپ کو شاید کسی کا انتظار ہے؟“ ثینہ نے کہا۔

”جی۔۔۔ ہاں۔ وہ آئے ہی والی ہے۔“ انسپکٹر عثمان بولا۔

”یعنی وہ کوئی خاتون ہے؟“ ثینہ مسکرائی۔ ”ہو سکتا ہے وہ نہ آئے۔ اس وقت تو ہم آپ کے مہمان ہیں، ایک نہیں دو ہیں۔ ہر میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی خواہش ہوگی کہ ہم ان کی میز پر بیٹھیں۔ آپ شاید الجھن محسوس کر رہے ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ انسپکٹر عثمان کھیانا سا ہو گیا۔ ”مجھے دراصل ایک ایسی خاتون کا انتظار ہے جو۔۔۔“

”اور غالباً آپ اسے پہچانتے بھی نہیں۔“ ثینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”جی ایسی بات نہیں ہے۔ میں بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں اسے۔“ انسپکٹر عثمان نے کہا۔

”پھر غور سے میری طرف دیکھو مسٹر عثمان۔“ ثینہ نے کہتے ہوئے عینک اتار لی۔ انسپکٹر عثمان اپنا نام سن کر اچھل پڑا۔ اس نے غور سے ثینہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

”میں تمہیں واقعی نہیں پہچان سکا تھا مس ثینہ۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں جب بھی دیکھا جیز اور ٹی شرٹ میں دیکھا۔ بالوں کا اسٹائل بھی مختلف تھا۔ اس لباس میں تو تم بالکل ہی بدل گئی ہو اور یہ۔۔۔“ وہ سوالیہ نگاہوں سے شاہ پری کی طرف دیکھنے لگا۔

”میری دوست ہے شاہ پری۔“ ثینہ نے اس کا تعارف کرایا۔ ”اس وقت تم اسے دیکھ رہے ہو۔ کل یہ تمہارے پاس کھڑی ہوگی تو تم اسے نہیں پہچان سکو گے۔“

”اوہ۔“ انسپکٹر عثمان کے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے کافی منگوائی۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ وہ لوگ شیشے کے ساتھ جس میز پر بیٹھے تھے، وہاں سے باہر سڑک پر دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

”ہاں۔ اب بتاؤ۔ وہ کیا باتیں ہیں جو تم مجھے بتانا چاہتے تھے۔“ ثینہ نے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

حاجی نے پولیس کو یہ اطلاع فراہم کر دی تھی کہ وہ حویلی بہت عرصہ سے شارق کے استعمال میں تھی۔ حویلی کے کنویں سے رفت کی لاش ملی ہے اور رفتی صائمہ نامی ایک نرس کا شوہر ہے جو اسپتال ہی کے کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ اس لیے پولیس کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہو گیا ہے کہ شارق کو اسپتال سے فرار کرانے میں رفت کا ہاتھ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے سے شارق کے لیے کام کر رہا ہو یا شارق نے اسے دولت کا لالچ دے کر اپنی مدد کے لیے آمادہ کیا ہو۔ بہر حال پولیس کو یقین ہے کہ وارڈ سے فرار ہونے کے بعد شارق اسپتال کے کسی رہائشی کوارٹر ہی میں چھپا ہوا تھا۔ پولیس نے اس سلسلے میں نئے خطوط پر تفتیش شروع کر دی ہے اور اسپتال کے ان تمام ملازمین سے پوچھ گچھ شروع کر دی گئی ہے جو اس رات ڈیوٹی پر تھے۔ ان میں کچھ نرسین بھی شامل ہیں۔ رفت کی بیوی صائمہ کو پولیس نے حراست میں لے لیا ہے اور اس سے رفت اور شارق کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔

”اوہ۔“ ثینہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”صائمہ بے گناہ ہے۔ وہ شارق کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”کیا تم اسے جانتی ہو؟“ انسپکٹر عثمان نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ثینہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن شارق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شارق سے تو رفت کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس کی لاش حویلی کے کنویں سے کیسے ملی؟“

”ہو سکتا ہے پولیس کو الجھانے کے لیے یہ سارا ڈرامہ حاجی نے رچایا ہو اور رفت اتفاق سے اس کے ہاتھ لگ گیا ہو جسے حویلی میں لے جا کر کنویں میں پھینک دیا ہو اور پولیس کو اطلاع دیدی ہو۔“ انسپکٹر عثمان نے کہا۔

”بہر حال۔“ ثینہ گھرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”اسپتال کے اور کون کون سے ملازمین شے کی زد پر ہیں؟“

”چار پانچ ہیں۔“ انسپکٹر عثمان نے جواب دیا۔ ”اس رات سرجیکل وارڈ میں رضیہ نامی نرس کی ڈیوٹی تھی۔ اس سے بھی پوچھ گچھ کی جا رہی ہے اور وارڈ بوائے سے بھی جو اس روز شام کی ڈیوٹی پر آنے کے فوراً بعد چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ پولیس نے مشتبہ افراد کے گھروں کی تلاشی بھی لی ہے لیکن ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے ثابت ہو سکے کہ شارق یہاں رہ چکا ہے۔“

”حاجی کے بارے میں اور کیا اطلاع ہے؟“ ثینہ نے پوچھا۔

”مجیدے کے علاوہ وہ کچھ اور پارٹیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رہا ہے تاکہ سب لوگ مل کر شارق اور تمہیں تلاش کر سکیں۔ وہ سب بے وقوف ہیں۔“ انسپکٹر عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ سمجھتے ہیں کہ حاجی ان پر مہربان ہو گیا ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ مطلب پورا ہو جانے کے بعد حاجی ان سب کو جوتے مار کر بھگا دے گا۔“

”اب ایک اور اہم بات۔“ ثینہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”حاجی نے حویلی سے جو مال نکالا ہے، وہ کہاں رکھا گیا ہے؟“

”اقبل ٹاؤن والی کوٹھی میں۔“ انسپکٹر عثمان نے جواب دیا۔ ”حاجی کا زیادہ وقت آج کل اسی کوٹھی میں گزر رہا ہے۔ میں بھی حاجی کے ساتھ چپکا رہتا ہوں۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں نے اس کے خلاف جو کارروائی کی تھی، وہ غلط تھی اور اب اس کا وفادار ہوں۔“

”تھنیا یہ کفرم ہے کہ مل اسی کوٹھی میں رکھا گیا ہے؟“ ثینہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ انسپکٹر عثمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ جب حاجی کو اس مال کے بارے میں اطلاع ملی تھی تو اس وقت بھی میں وہاں موجود تھا اور حاجی کے ساتھ جو آدمی حویلی گئے تھے، ان میں بھی شامل تھا اور وہ ٹرک بھی میں ہی چلا کر لایا تھا جس پر حویلی سے مال لادایا گیا تھا۔“

”وہ مال کیسے اور تو منتقل نہیں ہوا؟“ ثینہ نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی وہیں ہے۔“ انسپکٹر عثمان نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تمہیں ایک کام اور کرنا ہے۔“ ثینہ بولی۔

”وہ کیا؟“ عثمان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک گاڑی چاہیے کیونکہ آج کل ہمارے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔“ ثینہ نے کہا۔

”میری گاڑی باہر کھڑی ہے، وہ لے جاؤ۔“

”نہیں۔ کوئی ایسی گاڑی جسے ٹریس نہ کیا جاسکے۔“ ثینہ نے کہا۔

”یہ ایسی ہی گاڑی ہے۔“ انسپکٹر عثمان نے جواب دیا۔ ”تقریباً دو مہینے پہلے یہ گاڑی پولیس نے ڈکیتی کے ملزم سے پکڑی تھی۔ اصولی طور پر اسے گمشدہ گاڑیوں کے پول میں جمع کر دینا چاہیے تھا لیکن یہ گاڑی ابھی تک میرے پاس ہے۔ اس کا کیس اندراج بھی نہیں ہے۔ اگر کیس پکڑی بھی گئی تو ٹریس نہیں ہو سکے گی۔“

”تمہارا نام تو نہیں آئے گا؟“ ثینہ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ عثمان مسکرایا۔ ”ایسی بہت سی گاڑیاں پولیس والوں کے استعمال میں ہیں۔ انہیں

ی جی جی۔ لوگ ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ شاہ پری اور ٹینہ وغیرہ نے بھی اپنی کار کی آڑ سے سامنے والی کار پر فائرنگ شروع کر دی۔

اس کار میں تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور دو فائرنگ کر رہے تھے۔ دونوں کے پاس پستول یا ریوالور تھے۔ جوابی کارروائی ہوتے دیکھ کر وہ کار حرکت میں آگئی اور طوفانی رفتار سے ریگل چوک کی طرف چلی گئی۔

”کون تھے یہ لوگ؟“ ٹینہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”پتہ نہیں کون تھے۔ گاڑی میں بیٹھو۔ جلدی کرو اور تم لوگ نکل جاؤ یہاں سے۔“ انسپٹر عثمان نے کہا۔

”اور تم.....؟“ ٹینہ بولی۔

”میری فکر مت کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ۔“ عثمان بولا۔

ٹینہ اور شاہ پری گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ٹینہ نے انجن اشارت کیا اور ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی اور اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔



اخبار میں شائع ہونے والی وہ خبر خاصی دلچسپ تھی۔ ایک سابق پولیس افسر پر اس وقت قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مال روڈ کے ایک ریستورنٹ سے نکل کر کار کی طرف جا رہا تھا۔ پولیس کے ذرائع نے بتایا تھا کہ یہ پولیس آفیسر آج کل اگرچہ معطل ہے لیکن اس سے پہلے اپنی ڈیوٹی کے دوران جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کرتا رہا ہے اور اس پر حملہ کسی ایسے ہی جرائم پیشہ شخص نے کیا تھا جو اس کے ہاتھوں کسی وقت زک اٹھا چکا تھا۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق ایک گولی سابق پولیس آفیسر کے بازو کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی اور اسے مزہم پٹی کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔ پولیس نامعلوم حملہ آوروں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔

یہ اگرچہ سادہ خبر تھی۔ اس خبر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص یہی سمجھے گا کہ کسی جرائم پیشہ نے کوئی بدلہ لینے کے لیے پولیس آفیسر پر قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن شارق وغیرہ کے لیے سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا اور وہ لوگ بہت دیر سے بیٹھے اسی خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔

”یہ انسپٹر عثمان کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔“ نوٹکھا کہہ رہا ہے۔ ”وہ جانتا ہے کہ تمہارے پاس اس کی ایسی تصویریں ہیں جو اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی ہیں۔ ان تصویروں کی وجہ

کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ٹینہ نے کہا۔ ”میں وہ گاڑی ابھی لے جاؤں گی اور کل رات گیارہ بجے تم مجھے اچھرہ موڑ پر ملو گے۔ ٹھیک گیارہ بجے۔“

”کوئی خاص بات؟“ انسپٹر عثمان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ حاجی کو یہ بتانا ہے کہ شارق اور ٹینہ سے چھینا ہوا مل آسانی سے ہضم نہیں ہو سکتا۔ ویسے اقبال ٹاؤن والی کو بھی میں عام طور پر کتنے آدمی ہوتے ہیں؟“

”تین چار تو ہر وقت موجود رہتے ہیں۔“ انسپٹر عثمان نے جواب دیا۔

”رات گیارہ بجے اچھرہ موڑ پر آنے سے پہلے تم یہ معلوم کر لو گے کہ وہاں کتنے آدمی ہیں۔“

”تو کیا تم.....“

”ہاں۔“ ٹینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”فوری جوابی کارروائی سے میں حاجی کو یہ بھی باور کرا دیتا چاہتی ہوں کہ ہم غافل نہیں ہیں۔ شارق اگر زخمی ہو کر پڑا ہوا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ بے دست و پا ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل رات گیارہ بجے مقررہ جگہ پر ملوں گا۔“ عثمان نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ اب چلنا چاہیے۔“ ٹینہ نے کہا۔

انسپٹر عثمان نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور وہ تینوں میز سے اٹھ گئے۔ ریستورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ اب بھی ٹینہ اور شاہ پری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انسپٹر عثمان کی گاڑی ریستورنٹ سے چالیس پچاس گز دور کھڑی تھی۔ وہ تینوں گاڑی کی طرف چلنے لگے۔ وہ سفید رنگ کی نسان سیڈان تھی۔ عثمان نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ٹینہ کی طرف بڑھا دیا۔

”ویسے میرا مشورہ ہے کہ تم اس طرح آزادی سے مت پھرا کرو۔“ وہ ٹینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم مجھے نہیں پہچان سکتے تھے تو کوئی اجنبی کیا پہچانے گا۔“

ٹینہ نے دروازے کا لاک کھول دیا۔ وہ دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایک گولی انسپٹر عثمان کے بائیں بازو پر لگی اور وہ چیخ کر نیچے گرا۔ ٹینہ اور شاہ پری بڑی پھرتی سے نیچے گر گئی تھیں۔ ان دونوں نے فوراً اپنے اپنے ہینڈ بیگز سے پستول نکال لیے تھے۔ انسپٹر عثمان نے بھی پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔

فائرنگ سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ایک کار سے کی جا رہی تھی۔ فائرنگ سے بھگدڑ

کہا۔ ”بیسویں لوگوں کو جیل بھجوا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے انہی میں سے کوئی ہو جو رہا ہونے کے بعد مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہو۔“

”وہ حاجی کے آدمی تو نہیں تھے۔“ ثینہ نے سوال کیا۔
 ”حاجی کے آدمی! تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا کہ وہ حاجی کے آدمی ہو سکتے ہیں۔“ عثمان بولا۔

”ہو سکتا ہے حاجی کو تم پر شبہ ہو گیا ہو اور اس نے تمہاری نگرانی شروع کر رکھی ہو۔“ ثینہ نے کہا۔

”نہیں۔ وہ حاجی کے آدمی نہیں ہو سکتے۔“ انسپکٹر عثمان نے پروتھو لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر وہ حاجی کے آدمی ہوتے تو ہم تینوں کا خاتمہ کیسے بغیر وہاں سے نہ جاتے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ ثینہ بولی۔ ”اس وقت میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہم نے آج رات گیارہ بجے والا پروگرام فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔“
 ”کیوں؟“ عثمان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اب اس پروگرام پر اس وقت عمل کیا جائے گا جب تمہارے بازو کا زخم ٹھیک ہو جائے گا۔“ ثینہ نے کہا۔

”لیکن اس دوران اگر حاجی نے وہ مال کہیں اور منتقل کر دیا تو؟“
 ”اس کی تم فکر مت کرو۔ ہم اس کا سراغ لگا لیں گے۔ ویسے تم بھی تو موجود ہو حاجی پر نگاہ رکھنے کے لیے۔“ ثینہ ہنسنے لگی۔ ”میں ایک دو دن بعد تمہیں فون کروں گی۔“ اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر دیا۔

ثینہ نے وہ سارا دن کوٹھی میں گزارا تھا۔ شام کو اس نے گاڑی کا جائزہ لیا۔ گزشتہ رات فائرنگ کی وجہ سے اس کی کھڑکیوں کے دو شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے علاوہ گاڑی کو اور کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ رات کو گاڑی چلاتے ہوئے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گاڑی کا انجن بہترین حالت میں تھا اور ثینہ کو یقین تھا کہ کسی موقع پر یہ گاڑی پریشان نہیں کرے گی۔

رات کو ٹھیک گیارہ بجے ثینہ اور شاہ پری طفیلی کو ساتھ لے کر کار میں کوٹھی سے نکل گئے۔ ایک پٹرول پمپ پر کار کی ٹینکی فل کروائی گئی اور پٹرول کے تین فاضل گیلن بھی گاڑی میں رکھوا لیے گئے۔

اقبل ٹائون پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ طفیل کو پورا منصوبہ سمجھا دیا گیا تھا۔ اس نے حاجی کی اقبل ٹائون والی کوٹھی میں دیکھی تھی۔ ثینہ اسے راستہ سمجھا رہی تھی۔

سے وہ براہ راست تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا لیکن ایک تلوار تو اس کے گھلے پر لٹکی ہوئی ہے نا۔۔۔۔۔ اس سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ تم لوگوں کا ہمدرد بننا شروع کرے اور تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش بھی کرے۔“

”اس امان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ شارق بولا۔ ”ثینہ نے پہلے سے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ساڑھے آٹھ بجے شیراز میں اسے ملے آئے گی اور ہو سکتا ہے عثمان نے پہلے سے آدمیوں کی بندوبست کر رکھا ہو اور انہیں سمجھا دیا ہو کہ کس وقت کیا کرنا ہے، لہذا موقع پا کر انہوں نے کارروائی کر دی۔ یہ تو خوش قسمتی تھی کہ تم دونوں بچ گئیں۔“ وہ ثینہ اور شاہ پری کی طرف دیکھنے لگا۔

”سوچنے کی بات اور بھی ہے۔“ ثینہ نے کہا۔ ”گوئی اس کو لگی تھی اور پھر اس نے میرے وہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے پاس پستول بھی تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا کر الزام حملہ آوروں پر عاید کر سکتا تھا۔“

”ثینہ بی بی۔“ نوکھانے کہا۔ ”ایسے کھیلوں میں تو بڑی لمبی لمبی چالیں چلی جاتی ہیں۔ تمہارا ذہانت میں کوئی شبہ نہیں لیکن تم ان باتوں کو ابھی نہیں سمجھ رہی ہو۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ انسپکٹر عثمان پر زیادہ اعتماد نہ کیا جائے۔“

”میں تم سے اتفاق کرتی ہوں۔“ شاہ پری نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔
 ”بہر حال جو کچھ بھی ہو، حاجی کے خلاف آج ہی کارروائی ہوگی اور اس کارروائی میں عثمان شریک نہیں ہوگا۔ اسے فون کر کے بتا دیا جائے گا کہ ہم نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔“ ثینہ نے کہا۔

توقع کے عین مطابق انسپکٹر عثمان گھر پر ہی موجود تھا اور فون کال اسی نے ریسیو کی تھی۔ ”میرے ثینہ بول رہی ہوں مسٹر عثمان۔“ ثینہ نے اس کی آواز سننے کے بعد کہا۔ ”تمہارے بازو کا زخم کیسا ہے اب۔ رات کو تو میں گھبرا گئی تھی لیکن ابھی اخبار میں پڑھا تو پتہ چلا کہ گولی صرف گوشہ چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔“

”ہاں۔ معمولی زخم ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ پولیس سروس میں رہ کر تو ایسے کئی زخم لگے ہیں جن کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ بہر حال یہ زخم ہمارے کسی کام میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔“ انسپکٹر عثمان نے جواب دیا۔

”کون تھے وہ لوگ، کچھ پتہ چلا؟“ ثینہ نے پوچھا۔
 ”پولیس سروس میں رہتے ہوئے میں نے دوست کم اور دشمن زیادہ بنائے ہیں۔“ عثمان نے

پانی پینا اچھا نہیں لگتا۔“ گمن مین نے کہا۔ وہ دونوں اگرچہ برقع پہنے ہوئے تھیں مگر شاہ پری نے نقاب اٹھا رکھا تھا اور گمن مین بڑی لپٹائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اندر خواتین اور بچے تو ہوں گے نا؟“ ثینہ بولی۔

”یہاں کوئی خواتین اور بچے نہیں ہیں۔ یہاں صرف میں ہوں اور منظور ہے۔ ہم دونوں شریف آدمی ہیں اور آج تو یہاں ہمارا راج ہے۔ میں تمہیں پانی بھی پلاؤں گا اور۔۔۔ اور جو کو۔“

ثینہ اور شاہ پری نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور گیٹ کے اندر آگئیں۔ گمن مین نے گیٹ بھیڑ دیا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ برآمدے میں آگئیں۔ اسی طرح اندر سے ایک اور آدمی بھی نکل آیا تھا۔ اس کے کندھے پر بھی کلاشکوف لٹکی ہوئی تھی۔

”اوئے منظور۔“ پہلے گمن مین نے دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جا فرج میں سے ٹھنڈا پانی نکال کر لا۔ یہ میسٹراں نہیں کب سے پیاسی ہیں۔ بی بی اندر آجاؤ تم لوگ۔“

ثینہ اور شاہ پری راہداری میں آگئیں۔ ان کے ہاتھ برقعوں کے اندر تھے۔ ان دونوں نے اپنے اپنے پستول نکال لیے تھے۔ ثینہ نے شاہ پری کو اشارہ کیا اور پھر انہوں نے بیک وقت پستول نکال لیے۔ دونوں کے پستولوں پر سائلنزر لگے ہوئے تھے۔

”ہاتھ اٹھا لو۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو میسجہ اڑ جائے گا۔“ ثینہ غرائی۔

اس نے اس گمن مین کو زد پر لے رکھا تھا جس نے انہیں اندر بلایا تھا۔

”بڑی دلیر ہو بھی۔“ گمن مین ہنسا۔ ”مجھے ڈراتی ہو۔“ ثینہ نے کہا۔ ”اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی کلاشکوف اتارنے کی کوشش کی مگر ثینہ نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور وہ چیخ اٹھا۔“

ثینہ نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔

”مجھے اچھی طرح پہچان لو۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں ثینہ ہوں جس کی حاجی کو تلاش ہے۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گی تاکہ تم حاجی کو بتا سکو کہ شارن اور ثینہ غافل نہیں ہیں۔ حاجی اگر ہماری حویلی سے مال اٹھا لیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے، مال اسی کو خشی میں ہے لیکن چند منٹ بعد یہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

ان دونوں نے گمن مین اور اس کے ساتھی منظورے کو غیر مسلح کر دیا۔ ثینہ نے آواز دے کر طفیل کو بھی بلالیا۔ وہ پٹرول کے گیلن اٹھا لیا تھا۔

شاہ پری ان دونوں کو پستول کی زد پر لیے رہی اور طفیل انہیں رسیوں سے باندھنے لگا۔ پھر وہ

یہ علاقہ انڈر ڈولپمنٹ تھا۔ کہیں ایک گھر آباد ہو چکا تھا تو اس کے آگے پیچھے چار چھ گھر زیر تعمیر تھے۔ اس طرح آبادی بہت پھیل رہی تھی۔ ایک کچی گلی میں مڑتے ہی کار کا انجن پچکولے کھانے لگا اور بالآخر کار گلی کے کونے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس سے آگے دائیں طرف وہی گلی تھی جس کے سامنے والی لین میں تیسرے نمبر پر ایک خوبصورت دو منزلہ کوٹھی تھی۔

اس کوٹھی کو دیکھ کر ثینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو حاجی نے اسے دی تھی اور اس نے رضیہ کے نام ٹرانسفر کرا دی تھی لیکن بعد میں حاجی نے دھوکے سے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ ثینہ سرگوشیوں میں شاہ پری کو اس کوٹھی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

طفیل میسر بدل بدل کر ایک سیلیئر دبا رہا تھا لیکن کار آگے بڑھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بالآخر وہ انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور باہر بونٹ کھول کر انجن دیکھنے لگا۔

ثینہ کوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی کلاشکوف بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ کوٹھی کے اندر صرف برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی جبکہ اندر کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

”بی بی۔ ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو گیا ہے۔“ طفیل نے اس قدر بلند آواز میں کہا کہ کوٹھی کے گیٹ کے سامنے بیٹھے ہوئے گمن مین نے بھی آواز سن لی۔

ثینہ اور شاہ پری نیچے اتر آئیں۔ وہ بھی چند لمبے انجن کو دیکھتی رہیں، پھر کوٹھی کے گیٹ کے سامنے آگئیں۔

”بھائی صاحب۔“ ثینہ گمن مین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”ہماری گاڑی میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ اگر تھوڑا سا۔۔۔“

”میری کوئی بہن نہیں ہے بی بی، اس لیے مجھے بھائی صاحب مت کہو۔“ اس آدمی نے ثینہ کی بات کٹ دی۔

”اچھا جناب۔“ ثینہ زیر لب مسکرا دی۔ ”گاڑی کے لیے پانی مل جائے گا؟“

”میں ابھی لاتا ہوں۔ یہیں کھڑی رہو۔“ وہ آدمی اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد ایک ڈبے میں پانی لے آیا۔ ثینہ نے طفیل کو بلا کر ڈبے اس کے حوالے کر دیا اور گمن مین کی طرف دیکھتے ہو۔

بولی۔

”پینے کے لیے بھی ٹھنڈا پانی مل جائے گا؟“

”جتنا مرضی۔۔۔ اندر آجاؤ۔ میں تمہیں فرج کا ٹھنڈا پانی پلاتا ہوں۔ باہر گلی میں کھڑے ہو۔“

تعلق نہیں رہا تھا۔

پولیس افسران جانتے تھے کہ حاجی کوٹھی کی ملکیت سے انکار کیوں کر رہا تھا۔ بات کوئی معمولی نہیں تھی۔ کوٹھی میں اسلحہ اور گولہ بارود کا انبار لگا ہوا تھا۔ اگر حاجی کوٹھی کی ملکیت قبول کر لیتا تو اسے یہ بھی جواب دینا پڑتا کہ وہ اسلحہ کہاں سے آیا تھا لیکن حاجی سے پہلے اس کے کارندے یہ بیان دے چکے تھے کہ کوٹھی حاجی عبداللہ کی ملکیت تھی اور شارق کی ساتھی ٹینہ نے آگ لگائی تھی۔ حاجی عبداللہ کے نمک خوار پولیس افسران کو شش کر رہے تھے کہ اس معاملے میں حاجی کا بیان نہ آنے پائے لیکن اخبارات کے رپورٹر حاجی کے دونوں کارندوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ان کے بیان لے اڑے تھے۔

اخبارات نے شارق اور ٹینہ کے ناموں کو تو کورج دی ہی تھی لیکن حاجی عبداللہ کے نام کو بھی خوب اچھالا تھا اور پہلی مرتبہ اس کے خلاف کھل کر لکھا تھا اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ امی عبداللہ کو گرفتار کر کے اس واقعہ کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کرائی جائیں۔

حاجی عبداللہ سن پورہ میں اپنے ایک معتمد کارکن کے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ اب تک اپنے آدمیوں کو بیسیوں مرتبہ فون کر چکا تھا۔ اسمبلیوں میں اس کے نمک خوار وزیر تھے اور وہ ٹیلی فون پر حاجی کو یقین دلا رہے تھے کہ اسے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔

حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ رات ٹینہ کی اس کارروائی سے حاجی عبداللہ نہ صرف بوکھلا گیا تھا بلکہ پہلی مرتبہ وہ کچھ خوف بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے آدمیوں کی پوری فوج شہر میں پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ شارق اور ٹینہ کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ اس روز حویلی سے اسلحہ اور گولہ بارود کی پٹیاں اور ہیروئن کے پیکٹ اپنے قبضے میں لینے کے بعد اس کا خیال تھا کہ شارق کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ وہ اس کامیابی پر بہت خوش تھا لیکن اس کے جواب میں ٹینہ نے جو کچھ کیا تھا اس نے نہ صرف حاجی کے ہوش اڑا دیئے تھے بلکہ اسے خوفزدہ ہو کر روپوش ہونے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ ٹینہ کے بارے میں سوچ کر وہ بار بار دانت کچکا رہا تھا۔ اگر اتفاق سے یہ لڑکی اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کی اتنی بوٹیاں کر دے کہ انہیں گننا بھی مشکل ہو جائے۔ دوسری طرف اسے اپنے آدمیوں پر بھی غصہ آ رہا تھا جنہیں دو لڑکیاں بے وقوف بنا گئی تھیں۔ وہ انہیں گولی سے لڑا دینا چاہتا تھا لیکن ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ شبیر اور منظور دونوں پولیس کسٹڈی میں تھے۔

حاجی عبداللہ نے اگرچہ یہ کہہ دیا تھا کہ اس کوٹھی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس علاقے کے لوگ گواہی دیں گے کہ اسے وہاں آتے

ان دونوں کو اٹھا کر باہر لے گیا اور گاڑی میں ٹھونس دیا۔

ٹینہ اور شاہ پری پوری کوٹھی میں پٹرول چھڑک رہی تھیں۔ کچھ پٹرول انہوں نے گیٹ پر بھی چھڑکا تھا۔ ٹینہ نے دونوں کی کلاشکوفس بھی اٹھالی تھیں۔

باہر آکر ٹینہ نے برقعے کی جیب میں رکھی ہوئی پاجاموں اور تیل جلا کر گیٹ کی طرف اچھال دی۔ گیٹ پر چھڑکے ہوئے پٹرول نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ وہ دونوں دوڑ کر کار میں اگلی سیٹ پر بٹھ گئیں۔ کار کا انجن اشارت تھا۔ طفیل نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھادی۔

آگ بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تیسری گلی میں مڑتے ہی طفیل نے کار روک لی اور نیچے اتر کر اس نے کوٹھی کے دونوں محافظوں کو کھینچ کر نیچے پھینک دیا اور دوبارہ انجینرنگ کے سامنے بیٹھ کر کار آگے بڑھادی اور مختلف گلیوں میں گھماتا ہوا سڑک پر لے آیا۔



اخبارات ایک بار پھر چیخ اٹھے تھے۔

اس رات اقبال ٹاؤن کا علاقہ دھماکوں سے گونجنا رہا تھا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ اسلحہ کی پٹیاں کوٹھی کے پچھلے کمرے میں رکھی ہوئی تھیں اور کوٹھی کے پچھلی طرف دور تک گمراہ کھڈ اور ویرانہ تھا۔ کوٹھی کو آگ لگنے کے بعد قرب و جوار کے لوگ شور مچاتے ہوئے وہاں جمع ہو گئے تھے لیکن دھماکے شروع ہوتے ہی لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی کوٹھی کی پچھلی دیوار ڈھس گئی تھی اور اس کمرے میں ایک کھڈ پڑ گیا تھا اور پھر وہ کھڈ پھیلتا ہوا کوٹھی کے پچھلی طرف واقع کھڈ سے مل گیا۔ اس طرح اسلحہ اور گولہ بارود کی تمام پٹیاں اس کھڈ میں جا گری تھیں اور اس کھڈ ہی میں دھماکے ہوتے رہے تھے۔ اگر کوٹھی کی پچھلی طرف بھی آبادی ہوتی تو بہت بھاری جانی نقصان ہوتا لیکن جانی نقصان تو کوئی نہیں ہوا البتہ وہ کوٹھی جل کر راکھ ہو گئی تھی اور اس کے دائیں بائیں دو اور زیر تعمیر کوٹھیوں کو نقصان پہنچا تھا۔

آگ لگنے کی اطلاع ملنے پر پولیس نے بھی وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ پولیس ایک گلی میں کوٹھی کے دونوں محافظ بھی بندھے ہوئے مل گئے تھے۔ انہوں نے چھوٹے ہی پولیسر کو یہ بیان دیا تھا کہ یہ کوٹھی حاجی عبداللہ کی ملکیت تھی اور اسے آگ شارق کی ساتھی ٹینہ نے لگائی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور خوبصورت لڑکی بھی تھی۔

لیکن حاجی نے کوٹھی کی ملکیت ہی سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق یہ کوٹھی بنوائی اسی نے تھی لیکن بعد میں شارق کو دے دی تھی۔ اس کے بعد اس کا اس کوٹھی سے کوئی

جاتے اور رہتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

عوام کا دیاؤ بھی حکومت پر بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ ایک بار پھر سڑکوں پر نکل آئے تھے اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے حاجی عبداللہ کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔

دوسری طرف حاجی کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ ٹینہ کو یہ پتہ کیسے چلا تھا کہ حویلی سے چرائی جانے والی ہیروئن اور اسلحہ اس کو بھی میں موجود ہے۔ اگر انہیں اس کو بھی میں اسلحہ کی موجودگی کا پتہ چل گیا تھا تو عین ممکن ہے انہیں دوسرے ٹھکانوں کا بھی علم ہو لیکن نہیں، حاجی نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر شاروق وغیرہ کو کسی اور اڈے کا پتہ ہوتا تو پہلے وہیں کارروائی کرتے جبکہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کو بھی کے بارے میں کسی طرح پتہ چل گیا ہو گا اور انہوں نے فوری کارروائی کر دی۔

دفترا ایک اور خیال حاجی کے ذہن میں ابھر آیا۔ یہ خیال ایسا خوفناک تھا کہ وہ کانپ اٹھا۔ منظور اور شیرا پولیس کی حراست میں تھے اور وہ دونوں حاجی کے بہت ہی قابل اعتماد محافظ تھے۔ انہیں تمام گوداموں کے بارے میں معلوم تھا۔ پولیس ان پر تشدد کر کے راز انکشاف کر سکتی تھی اور اگر ان میں سے کسی نے زبان کھول دی تو نہ صرف کروڑوں روپے کا مال اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا بلکہ اسمبلیوں میں بھی کھل کر اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی اور پھر وہ بے دست و پا ہو جائے گا اور اس کے بھاگنے کا راستہ بھی نہیں رہے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے فون کر ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جلد ہی لائن مل گئی۔

”غلام حیدر!“ حاجی آواز سنتے ہی بولا۔ ”یہ معلوم کرو کہ شیرے اور منظورے کو کہاں رکھا تھا۔“

”میرا مطلب ہے وہ کس تھانے میں ہیں۔“

”ابھی معلوم کرتا ہوں جی۔“ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

”میں انتظار کر رہا ہوں۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔“ حاجی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔

”لیس!“

”میں نے ان دونوں کے بارے میں معلوم کر لیا ہے جناب۔ وہ.....“

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔“ حاجی نے غراتے ہوئے بات کٹ دی۔ ”ان دونوں“

ختم کرا دو۔ میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کروں گا اور اس وقت میں ان کی موت کے علاوہ اور کوئی

جواب نہیں سنتا چاہوں گا۔“

دوسری طرف سے کچھ کہا جا رہا تھا لیکن حاجی نے فون بچ دیا اور پہلے کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔

پینتالیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ حاجی عبداللہ اس وقت کمرے کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ واپس مڑا اور آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔

”لیس۔“

”شہباز بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ان دونوں کو اوپر پہنچا دیا گیا ہے۔“

”گڈ۔“ حاجی کے منہ سے ایک لفظ نکلا اور اس نے فون بند کر دیا۔ ”اوئے لطیف۔“ اس نے نوکر کو آواز دی۔ ”چائے لے کر آؤ۔“

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔



یہ واقعہ دن کو گیارہ بجے پیش آیا تھا اور دوپہر ایک بجے اخبارات نے ضمیمے شائع کر دیئے تھے۔ تمام ہی اخبارات نے گزشتہ رات اقبال ٹاؤن میں حاجی کی کوٹھی میں آتشزدگی اور دھماکوں کی خبریں بھی دوبارہ شائع کی تھیں اور تھانے میں قتل کی اس دوہری واردات کو نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔

اخبارات کے مطابق گزشتہ رات کوٹھی کو آگ لگنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تھی تو حاجی کے دو کارندوں منظور اور شیر کو ایک قریبی گلی میں بندھے ہوئے پایا تھا۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ یہ کوٹھی حاجی عبداللہ کی ملکیت ہے اور اس میں آگ شاروق کی ساتھی ٹینہ نے لگائی تھی جو ایک اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ انہوں نے دھوکے سے انہیں باندھ دیا اور پٹرول چھڑک کر کوٹھی کو آگ لگا دی۔

بعد میں حاجی عبداللہ نے کوٹھی کی ملکیت ہی سے انکار کر دیا تھا کیونکہ کوٹھی میں اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیرے میں بھی آگ لگ گئی تھی اور دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ دراصل حاجی اس الزام سے بچنا چاہتا تھا کہ اس نے کوٹھی میں ناجائز اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔

شیر اور منظور حاجی کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ وہ اس کیس کے اہم گواہ تھے اور پولیس نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا لیکن آج دن کے گیارہ بجے تین نامعلوم آدمی داخل ہوئے اور

انہوں نے آتے ہی سب مشین گنوں سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور حوالات میں بڑے شیرے اور منظورے کو گولیوں سے چھلٹی کر دیا۔ نامعلوم حملہ آوروں کی اس کارروائی میں ایک کانسٹیبل بھی جاں بحق ہوا تھا جبکہ تین سپاہی زخمی ہوئے تھے۔

اخبارات نے حاجی کے خلاف ایک بار پھر کھل کر لکھا تھا کہ شیر اور منظور کو اسی نے مروایا نہ تاکہ وہ اس کے خلاف کوئی بیان نہ دے سکیں۔ بعض اخباروں نے اسمبلیوں میں ان نمائندوں کے خلاف بھی لکھا تھا جو عوام کی نمائندگی کرنے کی بجائے صرف اور صرف حاجی عبداللہ کے مفادات کا تحفظ کر رہے تھے۔ اخبارات نے ایک بار پھر حاجی عبداللہ کی گرفتاری کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی پولیس کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں نے تھانے میں گھس کر حوالات میں بند کیس کے دو اہم گواہوں کو گولیوں سے چھلٹی کر دیا تھا۔ یہ پولیس کی نااہلی کا کھلم کھلا ثبوت تھا۔ پولیس اپنی اور اپنے تھانے کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھی تو وہ عوام کو کیا تحفظ فراہم کر سکتی تھی۔

اس واقعہ کے فوراً بعد اس تھانے کے پورے عملے، ڈی ایس پی اور ایس پی تک کو معطل کر دیا گیا تھا اور پورے شہر کی پولیس کو ملزمان کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا تھا۔

عوام میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ لوگ عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تھے۔ پولیس تھانے ہی محفوظ نہیں رہے تھے تو کوئی عام آدمی اپنے آپ کو کیسے محفوظ سمجھ سکتا تھا۔

حاجی عبداللہ کی گرفتاری کے لیے عوام کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ چیف منسٹر ہاؤس اور گورنر ہاؤس کے گھیراؤ ہو رہے تھے۔ پولیس مظاہرین پر لاشی چارج کر رہی تھی لیکن حاجی عبداللہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

حاجی عبداللہ اپنی پناہ گاہ میں بیٹھا ایک ایک لمحہ کی صورت حال سے باخبر تھا اور عوام کی بے بسی پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔



صورتحال خاصی سنگین ہو گئی تھی۔ شارق اور ثمنہ وغیرہ کو اگرچہ فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ثمنہ کی کارروائی سے حاجی عبداللہ بوکھلا گیا تھا۔ عوام بھی اس کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے اور وہ روپوش ہو گیا تھا اور پھر اس روز پولیس کی حراست میں شیرے اور منظورے کو گولیوں سے چھلٹی کر دیا گیا۔ اخبارات اور عوام حاجی کے خلاف شور مچانے لگے لیکن قانون حاجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں

کی گئی۔ اس کے برعکس پولیس اپنی تمام تر توانائی شارق اور ثمنہ کی تلاش میں صرف کر رہی تھی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ زیر زمین دنیا سے تعلق رکھنے والے کئی لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان پر تشدد کر کے ان سے شارق اور ثمنہ کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ اس واقعہ کو تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ عوام کا جوش و خروش دم توڑ گیا تھا لیکن پولیس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ شارق اور ثمنہ کی تلاش میں اب بھی جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔

اس رات نوبتے شارق وغیرہ کھانا کھا رہے تھے کہ کل بیل کی آواز نے ان سب کو متوجہ کر لیا۔

”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ شارق بڑبڑاتے ہوئے اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ وہ سب لوگ اس وقت گھر میں موجود تھے۔ طفیل بھی ان کے قریب ہی کھڑا تھا۔

”میں دیکھتا ہوں جی۔“ طفیل بولا۔

”نہیں۔ تم ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔“ ثمنہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

”نو لکھا!“ شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ اس نے طفیل کو بھی اشارہ کر دیا تھا۔

نو لکھا اب بہت بہتر ہو چکا تھا۔ وہ شارق کا اشارہ سمجھ گیا تھا اور اٹھ کر کمرے سے کلاشکوف رائفلیں لے آیا تھا۔ اب سب کے ہاتھوں میں ایک ایک رائفل نظر آرہی تھی۔ وہ لوگ اگرچہ کھانے کی میز پر ہی بیٹھے رہے تھے لیکن رائفلیں گھنٹوں پر رکھ لی تھیں اور ایسی پوزیشن اختیار کر لی تھی کہ رائفلیں فوری طور پر استعمال کر سکیں۔ یہ غنیمت تھا کہ ماں جی نے کھانا آٹھ بجے کھا لیا تھا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں ورنہ یہ صورتحال دیکھ کر پریشان ہو جاتیں۔ البتہ رضیہ ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی لیکن شارق نے اسے بھی کمرے میں بھیج دیا تھا۔

ثمنہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی گیٹ کے پاس پہنچ گئی۔ اس درمیان بیل ایک مرتبہ اور بجائی گئی تھی۔

”کون ہے؟“ ثمنہ نے گیٹ کی جھری میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”دروازہ کھولے۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔“ باہر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ثمنہ کو یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اس نے ایک بار پھر جھری میں سے جھانکا لیکن باہر جو

کوئی بھی تھا، ایک سائیڈ میں کھڑا تھا اور جھری میں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

ثمنہ نے چھوٹا دروازہ کھول دیا اور پھر سامنے کھڑے، ہوئے شخص کو دیکھ کر اس کا دل اچھل

کر حلق میں آگیا۔

وہ انسپٹر عثمان تھا۔

”نت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ ٹینہ ہکلائی۔ ”تم یہاں کیسے آئے؟“

”مجھے اندر تو آنے دو ٹینہ بی بی۔“ انسپٹر عثمان آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”بڑی مشکل سے چھپتا چھپاتا یہاں تک پہنچا ہوں۔“

ٹینہ ایک طرف ہٹ گئی۔ انسپٹر عثمان جیسے ہی اندر داخل ہوا، اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے عثمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں یہاں کا پتا کیسے چلا؟“ اس نے پوچھا۔

”یہاں کا پتا مجھے پندرہ بیس دن پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”ٹینہ بی بی۔ تم شاید یہ بھول گئی ہو کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور اگر کوئی پولیس والا چاہے تو کسی کو زمین کی تہوں میں سے بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔“ پچھلے دنوں تم آدھا آدھا گھنٹہ مجھ سے فون پر باتیں کرتی رہی ہو۔ فون ٹیپ کر کے نمبر اور پھر ایڈریس معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل تو نہیں تھا۔“

”اوہ۔“ ٹینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”چلو۔ اندر چلو لیکن یہ بتا دوں کہ اگر اس وقت ہمارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تو تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔“

”مطمئن رہو۔ میں اکیلا ہی آیا ہوں۔“ انسپٹر عثمان نے جواب دیا۔

ٹینہ اسے اندر لے آئی۔ انسپٹر عثمان کو دیکھ کر شارق بھی چونک گیا۔ ٹینہ نے اسے بتا دیا کہ اسے یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا تھا۔

”میں ایک اہم اطلاع لے کر آیا ہوں۔“ انسپٹر عثمان نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ اہم اطلاع تم فون پر بھی دے سکتے تھے جبکہ تم نمبر معلوم کر چکے تھے۔“ شارق نے اسے گھورا۔

”میں دو گھنٹوں سے فون پر کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ شاید تمہارا فون خراب ہے۔ اس لیے مجھے خود آنا پڑا۔“ عثمان نے کہا۔

ٹینہ اور شارق ابھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دوسرے کے بعد سے فون استعمال نہیں کیا تھا۔ ٹینہ نے آگے بڑھ کر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ فون بے جان پڑا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو اب بھی میرے اوپر یقین نہیں آیا۔“ انسپٹر عثمان، شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری وفاداری کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہو کہ مجھے یہاں کا نمبر

اور ایڈریس پندرہ بیس دن پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اس دوران اگر میں چاہتا تو پولیس یا حاجی کو بتا کر تم لوگوں کو یہیں پر ختم کروا دیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ میری وفاداری کا ثبوت ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”حاجی نے میرا کیریئر تباہ کر دیا ہے۔ میں اس سے اپنا انتقام لینا چاہتا ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے طور پر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ تم واحد شخص ہو جو حاجی کو کیفر کروا کر تک پہنچا سکتا ہے۔ میں معافی طلبی کے بدلے حاجی کے ساتھ اس لیے لگا ہوا ہوں کہ اس کے بارے میں تمہیں اطلاعات فراہم کر سکوں اور اب تک میں نے جو بھی اطلاع دی ہے، وہ سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔“

”اب کوئی اہم اطلاع لے کر آئے ہو؟“ شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”حاجی تم لوگوں کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔“ انسپٹر عثمان نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ شارق چونک گیا۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ پولیس کے علاوہ حاجی کے آدمی بھی تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ چند روز پہلے اس کے کسی آدمی نے ٹینہ کو لیٹی مارکیٹ میں گھومتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ اس وقت ٹینہ اس کی نگاہوں سے اوچھل ہو گئی تھی لیکن اس اطلاع کے بعد حاجی کو یقین ہو گیا ہے کہ تم لوگ اسی علاقے میں کیسے موجود ہو اور وہ لوگ پاگل کتوں کی طرح تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کچھ عورتوں کو بھی کام پر لگا رکھا ہے۔ عورتیں چیزیں بیچتے، کرائے کا مکان تلاش کرنے یا کسی اور بدلے سے گھروں میں گھس کر معلومات حاصل کر رہی ہیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ ایک دو دن بعد وہ تمہارا یہ ٹھکانہ معلوم کر لے گا۔ اس لیے جتنی جلد ممکن ہو سکے تم لوگ یہاں سے ہٹ جاؤ۔“

اس کے خاموش ہونے پر شارق کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کل نیل ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس مرتبہ انہوں نے طفیل کو باہر بھیجا کیونکہ طفیل کو حاجی کے گردہ کا کوئی آدمی نہیں جانتا تھا۔

طفیل دو منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ نرس رضیہ کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر چونک گئے۔

”کیا بات ہے۔ تم لوگ کچھ پریشان سے لگ رہے ہو؟“ نرس رضیہ نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بات ہی کچھ ایسی ہے۔“ ٹینہ نے کہا۔ ”تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟“

”آج میں ڈیوٹی سے آف ہوں۔ سوچا تم لوگوں سے مل لوں۔“ نرس رضیہ نے جواب دیا۔

”لیکن یہاں معاملہ کیا ہے؟“

ثینہ نے شارق کی طرف دیکھا اور پھر نرس رضیہ کو صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

”اس اطلاع کو خطرے کی گھنٹی سمجھنا چاہیے۔“ نرس رضیہ نے ثینہ کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”اس سے پہلے کہ یہ صورتحال مزید سنگین ہو جائے، میں ایک تجویز دینا چاہتی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا گھوڑے شاہ روڈ والا مکان خالی ہے۔ اگر تم لوگ چاہو تو آج ہی رات وہاں منتقل ہو سکتے ہو۔“ نرس رضیہ نے جواب دیا۔

”تم پر کسی کو شبہ تو نہیں ہوا۔ میرا مطلب ہے رفیق والے کیس میں؟“ شارق نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نرس رضیہ نے جواب دیا۔ ”پولیس کو صائمہ کے گھر سے رفیق کے ہاتھ کی وہ تحریر مل گئی ہے جس میں اس نے صائمہ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے ہاں جا رہا ہے۔ رات کو واپس نہیں آئے گا۔ اس تحریر سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اگر رفیق کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا یا شارق سے اس کا کوئی تعلق تھا تو صائمہ اس سے لاعلم تھی۔ گھر کی تلاشی لینے پر بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے صائمہ پر کوئی شبہ ہو سکتا ہو۔ ہم سے کچھ سوال جواب ہوئے تھے لیکن بات ختم ہو گئی ہے۔“

”تم سب انسپکٹر سلمان کی۔۔۔۔۔“

انسپکٹر عثمان نے نرس رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا چاہا مگر شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں۔ یہ وہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ ہماری قابل اعتماد ساتھی۔ میں اب تک زندہ ہوں تو اس کی وجہ سے۔ اسپتال سے فرار ہونے میں اس نے میری مدد کی تھی اور میں دس بارہ دن تک اس کے کوارٹر میں رہا تھا۔“

”اوہ۔“ انسپکٹر عثمان بولا۔ ”اور وہ رفیق والا چکر، وہ کیا ڈرامہ تھا؟“

”وہ بھی ایک ڈرامہ ہی تھا جو ہرجال ختم ہو گیا۔“ شارق نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے؟“ نرس رضیہ نے پوچھا۔

”کھانا کھالیں۔ اس دوران پروگرام بھی بنا لیتے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔ وہ دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نرس رضیہ اور انسپکٹر عثمان بھی ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئے تھے۔

کھانے کے دوران تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا۔ انسپکٹر عثمان کا اصرار تھا کہ وہ لوگ آج رات ہی یہاں سے شفٹ ہو جائیں کیونکہ آنے والی کل ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اور بالآخر

پروگرام فائل ہو گیا۔

اس وقت ان کے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ ایک ننان سیڈان جو انسپکٹر عثمان نے پہلے ہی انہیں دے رکھی تھی اور دوسری گاڑی انسپکٹر عثمان لے کر آیا تھا اور طے ہوا کہ دونوں رضیہ، شاہ پری اور نوکھانسان پر چلے جائیں۔ شارق، ثینہ اور ماں جی انسپکٹر عثمان کے ساتھ دوسری گاڑی پر۔

رضیہ اور شاہ پری وغیرہ نے سب کے کپڑے اور ضروری چیزیں سمیٹ کر ننان کی ڈکی میں ٹھونس دی تھیں۔ انسپکٹر عثمان کے علم میں لائے بغیر سونے کے بسکٹوں والی بوری بھی اس کار میں رکھ دی گئی تھی۔ نرس رضیہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی گیٹ سے نکل گئی۔

انہں کے آدھے گھنٹے بعد دوسری گاڑی گیٹ سے نکلی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر انسپکٹر عثمان تھا۔ اس کے ساتھ شارق بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ماں جی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ثینہ ابھی کار میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے کونٹری کے تمام دروازے بند کیے اور پھر گیٹ کو تالا لگانے کے بعد وہ بھی پچھلی سیٹ پر ماں جی کے ساتھ بیٹھ گئی اور گاڑی حرکت میں آئی۔

شہر میں چیکنگ اب بھی ہو رہی تھی۔ انسپکٹر عثمان کی گاڑی کو بھی ایک جگہ روکا گیا۔ تین بالکاروں پر مشتمل اس پولیس پارٹی کا انچارج ایک اے ایس آئی تھا۔ وہ کچھ عرصہ انسپکٹر عثمان کی ماتحتی میں بھی رہ چکا تھا، پھر اس کا کسی دوسرے علاقے میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ اس نے انسپکٹر عثمان کو پہچان لیا۔

”ہیلو سر!“ اس نے کھڑکی پر جھک کر عثمان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے حنیف، کیا چیکنگ کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا؟“ عثمان بولا۔

”سر۔“ اے ایس آئی حنیف گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”جب تک شارق اور ثینہ سلاخوں کے پیچھے بند نہیں ہو جاتے، اس وقت تک ہمیں سکون سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملے گا اور سر میرے لائق کوئی خدمت۔“

”شکریہ۔“ انسپکٹر عثمان بولا۔ ”اس وقت میرے ساتھ مہمان ہیں۔ پھر کبھی ملاقات ہو گئی تو کہیں بیٹھ کر آرام سے گپ شپ کریں گے۔“

”ٹھیک سر۔“ اے ایس آئی حنیف نے سرسری سی نگاہ سے دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے شارق کی طرف دیکھا۔ پھر پیچھے ہٹ کر اس نے عثمان کو سلیوٹ کیا اور اپنے ماتحتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

انسپکٹر عثمان نے گاڑی آگے بدھادی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

”اب تمہیں میری وفاداری کا یقین آجانا چاہیے۔ اگر میرے دل میں غداری کا خیال ہوتا تو اس وقت بھی تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔“

”تمہاری وفاداری کا یقین تو میں نے اس دن کر لیا تھا جب میں نے تمہاری تصویریں کھینچیں تھیں۔“ شارق نے بھی مدہم لہجے میں جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”جب تک ان تصویروں کے نیگیٹو میرے قبضے میں ہیں تم میرے وفادار رہو گے۔“

”نہیں شارق بھائی، یہ بات نہیں ہے۔“ انسپٹر عثمان نے کہا۔ ”مجھے ان تصویروں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تو صرف حاجی کے خلاف تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ حاجی ایک ایسا ناگ ہے جو سر کپکنے کے لیے تم جیسے آدمی کی ضرورت ہے اور صرف میں ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ اس معاملے میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ پچھلے دنوں سڑکوں پر جو مظاہرے ہوتے رہے ہیں وہ حاجی کے خلاف تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو تمہارا ہمدرد پایا ہے۔ میری بات چھوڑو، نرس رضیہ کی مثال لے لو۔ اس نے آخر تمہیں کیوں بچایا تھا۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہیں اپنے گھر میں پناہ کیوں دی تھی؟ کیا تمہارے پاس اس کی بھی کوئی تصویریں ہیں جن سے وہ خوفزدہ ہے؟“

”نہیں۔ میں نے پہلی بار اسے اسپتال ہی میں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف میرے نام سے واقف تھی اور میں تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔“ شارق نے جواب دیا۔

”وہ بڑی اچھی عورت ہے۔“ انسپٹر عثمان نے جواب دیا۔ ”اب سے پہلے میں نے اسے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا جب اس کا شوہر زندہ تھا۔ سب انسپٹر سلمان ان دنوں میری ماتحتی میں تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے نئے گھر پر چند قریبی دوستوں کی دعوت کی تھی۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ وہ اپنی بیوی کو شو پیش کے طور پر اپنے دوستوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا لیکن رضیہ نے انکار کر دیا تھا جس پر سلمان نے اسے مارا پیٹا تھا لیکن وہ نہیں مانی۔“

دوسرے روز میں نے سب انسپٹر کو اس حرکت پر ڈانٹا بھی تھا اور اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کے بعد میں اس کے گھر کبھی نہیں گیا لیکن مجھے پتا چلتا رہا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے دوستوں کے لیے تماشا بنانا چاہتا ہے لیکن وہ غیرت مند لڑکی اس کے سامنے نہیں جھکی۔ اب یہ وہی لڑکی ہے جس نے تمہاری مدد کی اور اب بھی تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہی ہے۔ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے تم سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ وہ محض ہمدردی کی بنا پر تمہارا ساتھ دے رہی ہے اور تم میری بات کا بھی یقین کر لا کہ میں ان تصویروں کی وجہ سے تمہارا ساتھ نہیں دے رہا۔“

”وجہ کچھ بھی ہو، لیکن میں نے بہر حال تم پر اعتماد کر لیا ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم سے یہ اطلاع ملنے کے بعد نئے ٹھکانے پر تمہیں اپنے ساتھ نہ لے جاتا بلکہ تمہیں اس کے بارے میں کچھ بتاتا بھی نہیں۔“

”یہ تو اتفاق ہے کہ ٹھکانے کا بندوبست ہو گیا ورنہ میں تم لوگوں کو فوری طور پر اپنے گھر لے جاتا۔“ انسپٹر عثمان نے کہا۔

”اس طرح تم بھی خطرے میں پڑ جاتے۔“ شارق مسکرایا۔

”خطرے میں تو اب بھی ہوں۔“ انسپٹر عثمان نے جواب دیا۔ ”پولیس کو یا حاجی کو پتا چل جائے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو یقین کرو، ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ حاجی کے آدمی تو مجھے اس طرح چھپتی کریں گے کہ میرے جسم پر گولیوں کے نشان بھی نہیں گنے جاسکیں گے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”میں نے گلشن راوی میں اپنا ایک مکان کرائے پر دے رکھا ہے۔ میں کل صبح ہی کرائے وار کو ایک ہفتے کا نوٹس دے کر وہ مکان خالی کر دیتا ہوں تاکہ کسی ہنگامی صورتحال میں اسے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔“

”گویا تم مکمل طور پر۔۔۔۔۔“

”ہاں۔“ انسپٹر عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب میں مکمل طور پر تمہارے ساتھ ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”جب تک تم وفادار رہو گے، مجھے اپنا دوست پاؤ گے لیکن اگر غداری کا خیال بھی تمہارے دل میں آیا تو ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکو گے۔“

انسپٹر عثمان جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شینے نے ماں جی کو باتوں میں لگا رکھا تھا کہ وہ شارق اور عثمان میں ہونے والی گفتگو نہ سن سکیں جبکہ اس کی اپنی تمام تر توجہ ان کی باتوں کی طرف تھی۔

گاڑی گڑھی شاہو کے پل اور تیزاب احاطے سے ہوتی ہوئی گھوڑے شاہ چوک پر پہنچ گئی۔ اس چوک سے ذرا آگے باغبانپورہ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے گھوڑے شاہ کا مزار تھا۔ قبر ایک چھوٹی سی چار دیواری کے اندر تھی۔ دیواروں پر اور قبر کے آس پاس مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھوڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ضعیف العقیدہ لوگ فتنیں ماننے آتے تو پیسوں کے علاوہ چڑھاوے کے طور پر مٹی کے یہ گھوڑے بھی چڑھاتے تھے۔ ان کی منت پوری ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، مزار کے پڑوس میں مٹی کے یہ چھوٹے چھوٹے گھوڑے بنانے اور بیچنے والوں کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔

گھوڑے شاہ روڈ پر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انسپٹر عثمان نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی۔ اس طرف ایک کالونی بن چکی تھی۔ مغلوں کے زمانے میں یہاں ایک وسیع و عریض اور خوبصورت باغ ہوا کرتا تھا جو بعد میں ملٹی کا باغ کہلانے لگا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ باغ کافی عرصہ تک موجود رہا تھا لیکن پھر بدترتج یہاں بستیاں بنتی چلی گئیں اور شاہیاد باغ تک جانے والی اس تنگ سی سڑک کے دونوں طرف باغات غائب ہو گئے۔ ایک قدیم مزار باقی رہ گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف چھوٹے بڑے مکان بن گئے تھے۔

انسپٹر عثمان اگرچہ صرف ایک مرتبہ کئی سال پہلے یہاں آیا تھا لیکن اسے سب انسپٹر سلمان کے گھر کا راستہ معلوم تھا۔ اس بستی کے آگے کی طرف چھوٹے مکان تھے جبکہ پچھلی طرف بڑے پلاٹ تھے۔ سلمان کا مکان خاصا بڑا تھا اور اس کے ساتھ وسیع لان بھی تھا۔۔۔ ایک سڑک اس طرف سے بھی چاہ میراں کی طرف چلی گئی تھی۔

نرس رضیہ وغیرہ ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ہارن کی آواز سن کر میٹ نرس رضیہ ہی نے کھولا تھا۔ عثمان گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا اور پہلے سے کھڑی ہوئی نسان کے پیچھے روک دی۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو شارق حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رضیہ نے اسے بتایا تھا کہ مکان کافی عرصہ سے بند پڑا ہے اور شارق کا خیال تھا کہ دیواریں اور فرش دھول سے اٹے ہوئے ہوں گے لیکن یہاں صورتحال اس کے برعکس تھی۔ کمروں میں بیڈز بچھے ہوئے تھے۔ دوسرے کمروں میں بھی ضروری فرنیچر موجود تھا۔ ڈرائنگ روم بھی سجا ہوا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟“ شارق نے نرس رضیہ کی طرف دیکھا۔

”میری دور اندیشی۔“ نرس رضیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جن دنوں تم میرے کوارٹر میں رہ رہے تھے، انہیں دنوں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تمہیں کسی محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت ہوگی۔

انہی دنوں میرے ڈیڑی بھی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ پہلے والے کرائے دار واپس جا رہے ہیں اور پراپرٹی ڈیلر کسی اور کو مکان کرائے پر دینا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے منع کر دیا تھا۔ جب تم میرے کوارٹر سے چلے گئے تو میں خود یہاں آئی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے یہاں کی صفائی کی اور پھر دو تین دن میں یہاں فرنیچر ڈھلا دیا۔ اس مکان کے کرائے کی ملنے والی رقم میرے پاس جمع تھی۔ اس میں سے کچھ رقم میں نے خرچ کر دی۔ میں نے پڑوسیوں کو بتا دیا تھا کہ شاید چند روز میں میرے کچھ عزیز رہنے کے لیے یہاں آجائیں اور آج میرا کہا ہوا پورا ہو گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ویسے تم لوگوں کو پڑوسیوں سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دائیں طرف کے مکان میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ خود بھی کسی سے ملنا

جناہند نہیں کرتے اور بائیں طرف کا مکان خالی پڑا ہے۔ وہ لوگ سعودی عرب گئے ہوئے ہیں اور سامنے والے مکانوں میں رہنے والے بھی بس ایویں ہی ہیں۔ اس لیے تم لوگوں کو ان سے عبرت کی ضرورت نہیں۔ ویسے اگر خواتین یہاں آنے کی کوشش کریں تو ان سے اس طرح کا رویہ اختیار کیا جائے کہ ان کی حوصلہ شکنی ہو اور دوبارہ نہ آئیں۔“ سمجھ گئی بڑی بی۔ ”ثینہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”اور بھی کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو اور یقین کرو، ہم تمہاری بات پر پورا پورا عمل کریں گے۔“

”شکریہ۔“ نرس رضیہ بھی مسکرا دی۔ ”اب میں تم لوگوں کے لیے چائے بنا دوں۔ میں نے بہت پہلے سے سارے انتظام کر رکھے ہیں۔ اس وقت تو چائے خشک دودھ کی پینی پڑے گی۔“

”چلے گا۔“ شارق بولا۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ شارق کے ایکسیڈنٹ والے واقعے کو چودہ پندرہ دن ہو چکے تھے اور اب تو وہ آہستہ آہستہ چلنے بھی لگا تھا لیکن نرس رضیہ نے اسے واضح طور پر تنبیہ کر لی تھی کہ وہ کم از کم ایک مہینہ اور آرام کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد نرس رضیہ اور شاہ پری چائے لے کر آگئیں۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں موجود تھے لیکن ماں جی اس کمرے میں چلی گئی تھیں جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہ ابھی دلہراشتہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے تو اب یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ کوٹھی چھوڑ کر یہاں کیوں آئے ہو؟ وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی تھیں۔

رات دو بجے تک وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور پھر انسپٹر عثمان تو رخصت ہو گیا لیکن نرس رضیہ وہیں رہ گئی تھی۔ اسے کل شام کو ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کل دسپہر تک یہاں ہی ہے گی۔

لوکھا اور شارق اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ثینہ اور رضیہ وغیرہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی مل کر رہیں اور پھر وہ چاروں ڈرائنگ روم ہی میں سو گئی تھیں۔ صبح اٹھتے ہی نرس رضیہ نے چائے بنائی۔ پھر شاہ پری کو ساتھ لے کر چاہ میراں چلی گئی۔ شاہ پری نے اب چادر بھی نہیں اڑھی تھی۔ اسے چادر اوڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس شہر میں اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ گلیبرگ میں تو وہ ثینہ کا ساتھ ہونے کی وجہ سے چادر اوڑھتی رہی تھی۔

بازار سے سلمان خریدنے کے بعد وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد لوٹی تھیں۔ نرس رضیہ آتے ہی شے کی تیاری میں لگ گئی۔ دوسری رضیہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

”فیل ابھی تک نہیں آیا۔“ ناشتے کے دوران ثینہ نے کہا۔

”آجائے گا۔“ شارق بولا۔ ”ہوشیار آدمی ہے۔ اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ناشتے کے بعد نرس رضیہ انہیں گھوم پھر کر گھر دکھانے لگی۔ چار بیڈ روم نیچے تھے اور چار اوپر تھے۔ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں اندر سے تھیں۔ یہ مکان ان کے خیال میں ہر لحاظ سے محفوظ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ مکان کا ایک دروازہ بکریں گلی میں تھا۔ یہ تنگ سی گلی تھی۔

مکان دکھانے کے بعد نرس رضیہ نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ مرغی بکرے کا گوشت لے آئی تھی۔ کچھ گوشت اس نے پکانے کے لیے نکال لیا اور باقی فریج میں دیا تھا۔

اسی دوران طفیل بھی آگیا۔

”اچھا ہی ہوا آپ لوگ رات کو وہاں سے آگئے تھے۔“ اس نے شارق کے پاس بیٹھتے ہوئے اسلمہ وہاں نہیں ہوتا۔

”مج دس بجے دو عورتیں آگئی تھیں۔ انہوں نے بڑے بڑے تھیلے اٹھا رکھے تھے۔ اب عورت نے کہا وہ عورتوں کے استعمال کی چیزیں بیچتی ہے اور گھر کی عورتوں سے ملنا چاہتی ہے میرے منع کرنے کے باوجود وہ گیٹ میں گھس آئی تھیں اور جب میں نے بتایا کہ گھر والا گوجرانوالہ گئے ہوئے ہیں تب وہ باہر گئی تھیں۔“

”انسپکٹر عثمان واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا۔“ ثینہ بولی۔ ”اگر وہ ہمیں بروقت اطلاع نہ دیتا ہے۔ وہاں کتنے آدمی موجود رہتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ ثینہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ سہ پہر پانچ بجے

”ہاں۔ وہ واقعی کام کا آدمی ثابت ہو رہا ہے اور میں اس سے بہت سے کام لیتا چاہتا ہوں۔“ شارق نے جواب دیکھیں وہ خالی تھیں۔ وہ طویلے کے صحن میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ باہر سے ایک آدمی اندر چوک کے بائیں طرف چند گز آگے ایک پرانا سا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے کنارے سڑک۔ قلم وہ طفیل سے سوال و جواب کرنے لگا۔ اسی دوران ایک اور آدمی ایک کوٹھری سے نکل کر باہر ساتھ دو تین مکان ہیں۔ وہ مکان حاجی کی ملکیت ہیں۔ سڑک کے دوسری طرف دکائیں ہیں۔ اگلی اس سے طفیل کو اندازہ ہوا کہ وہ دوسرا آدمی یقیناً تمہارے خانے میں تھا اور تمہارے خانے کا راستہ

”انسپکٹر عثمان واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا۔“ ثینہ بولی۔ ”اگر وہ ہمیں بروقت اطلاع نہ دیتا ہے۔ وہاں کتنے آدمی موجود رہتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ ثینہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ سہ پہر پانچ بجے

”ہاں۔ وہ واقعی کام کا آدمی ثابت ہو رہا ہے اور میں اس سے بہت سے کام لیتا چاہتا ہوں۔“ شارق نے جواب دیکھیں وہ خالی تھیں۔ وہ طویلے کے صحن میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ باہر سے ایک آدمی اندر چوک کے بائیں طرف چند گز آگے ایک پرانا سا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے کنارے سڑک۔ قلم وہ طفیل سے سوال و جواب کرنے لگا۔ اسی دوران ایک اور آدمی ایک کوٹھری سے نکل کر باہر ساتھ دو تین مکان ہیں۔ وہ مکان حاجی کی ملکیت ہیں۔ سڑک کے دوسری طرف دکائیں ہیں۔ اگلی اس سے طفیل کو اندازہ ہوا کہ وہ دوسرا آدمی یقیناً تمہارے خانے میں تھا اور تمہارے خانے کا راستہ

”انسپکٹر عثمان واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا۔“ ثینہ بولی۔ ”اگر وہ ہمیں بروقت اطلاع نہ دیتا ہے۔ وہاں کتنے آدمی موجود رہتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ ثینہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ سہ پہر پانچ بجے

”ہاں۔ وہ واقعی کام کا آدمی ثابت ہو رہا ہے اور میں اس سے بہت سے کام لیتا چاہتا ہوں۔“ شارق نے جواب دیکھیں وہ خالی تھیں۔ وہ طویلے کے صحن میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ باہر سے ایک آدمی اندر چوک کے بائیں طرف چند گز آگے ایک پرانا سا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے کنارے سڑک۔ قلم وہ طفیل سے سوال و جواب کرنے لگا۔ اسی دوران ایک اور آدمی ایک کوٹھری سے نکل کر باہر ساتھ دو تین مکان ہیں۔ وہ مکان حاجی کی ملکیت ہیں۔ سڑک کے دوسری طرف دکائیں ہیں۔ اگلی اس سے طفیل کو اندازہ ہوا کہ وہ دوسرا آدمی یقیناً تمہارے خانے میں تھا اور تمہارے خانے کا راستہ

”انسپکٹر عثمان واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا۔“ ثینہ بولی۔ ”اگر وہ ہمیں بروقت اطلاع نہ دیتا ہے۔ وہاں کتنے آدمی موجود رہتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ ثینہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ سہ پہر پانچ بجے

اس کوٹھری میں ہے۔ ان دونوں نے طفیل کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھاگ دیا۔

شارق اور ثمنہ نے پروگرام فائنل کر لیا۔ منصوبے کے مطابق ثمنہ اور شاہ پری کو ان کے ساتھ جانا تھا۔ رات دس بجے انسپکٹر عثمان بھی آگیا۔ اس کے ساتھ جلولہ خیال کرنے بعد گیارہ بجے وہ تینوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

عثمان نے قبرستان سے آگے نکل کر کار روک لی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ثمنہ اور شاہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں کے کپڑے پھٹ گئے۔ بال بھی بکھر گئے اور پھر دونوں کار سے اتر گئیں۔ وہ کچھ دور نہ آہستہ آہستہ چلتی رہیں، پھر دوڑتی ہوئی طویلہ کے لکڑی کے پھانک پر چڑھ کر اندر کود گئیں۔ دونوں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ جیسے دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہوں۔

”کون ہے۔ اوھر کون ہے؟“ لکڑیوں کے انبار کی طرف سے ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”بچاؤ..... ہمیں بچاؤ۔“ ثمنہ چیختی لیکن آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ وہ دونوں لکڑیوں کے انبار کے پچھلی طرف چلی گئیں جہاں اب بلب روشن ہو گیا تھا اور دو غنڈہ قسم کے آدمی کھڑے تھے۔

”کون ہو تم لوگ؟ کیا بات ہے؟“ ایک نے باری باری انہیں گھورا۔

”غنڈے ہمارا پچھا کر رہے ہیں۔ وہ ہماری عزت لوٹنا چاہتے ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے آپ کو چھڑا کر بھاگی ہیں۔ خدا کے لیے ہمیں بچاؤ۔“ ثمنہ بولی۔

”فکر ہی مت کرو۔ ہم سے بڑا اس علاقے میں غنڈہ کون ہو سکتا ہے؟ آؤ، تم لوگ ان آجاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

ثمنہ اور شاہ پری کوٹھری میں داخل ہو گئیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

ان دونوں غنڈوں نے بھی معنی خیر نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں لکڑیوں کے انبار کے اوپر سے گھوم کر طویلہ کے پھانک کی طرف چلے گئے۔

ثمنہ اور شاہ پری اس کوٹھری میں کھڑی رہیں۔ یہ کوٹھری آٹھ بالی آٹھ فٹ سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کی دیواریں گارے مٹی کی تھیں اور چھت ٹین کی تھی جس پر گھاس پھوس اور سوکھی جھاڑیاں پڑی تھیں۔ فرش بھی کچا تھا۔ ایک طرف چارپائی پڑی تھی جس پر میلا سا کھیس اور لٹکیہ پڑا ہوا تھا۔ تکتے کے قریب کے ٹو سگریٹ اور ایک باجس بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس چارپائی کے سامنے دو ٹوٹی ہوئی کرسیاں بھی پڑی تھیں جو غالباً طویلہ میں موجود کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں سے نکلی گئی تھیں۔ کرسیوں اور چارپائی کے درمیان ایک حقہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ثمنہ نے جھک کر چلم کو چھو کر دیکھا۔ وہ گرم تھی۔ غالباً وہ دونوں یہاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ایک دیوار پر لگی ہوئی کھوئی پر دو تین میلے سے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

تقریباً ”پانچ منٹ بعد کوٹھری کے باہر ان دونوں غنڈوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اونچی آواز میں کسی کو ماں بہن کی گالیاں بکتے ہوئے آرہے تھے۔ ثمنہ اور شاہ پری ایک دم سنبھل گئیں۔ اب ان کے چروں پر مسکراہٹ کے بجائے خوف کا تاثر جھلک رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی سی ایک دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ ساتھ واٹ کے بلب کی روشنی میں ان کے چروں پر زردی کا تاثر بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں غنڈے اندر داخل ہو کر دروازے کے قریب ہی رک گئے۔

”بھاگ گئے حرامزادے۔“ ان میں سے ایک نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ وہ دلا پتلا لمبے قد کا مالک تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر دائیں طرف تقریباً ایک انچ لمبا پرانے زخم کا نشان نظر آرہا تھا۔ ”وہ اسی علاقے کے سڑک چھاپ غنڈے ہیں۔ اب تو بھاگ گئے ہیں لیکن دھمکی دیکر گئے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو لیکر ٹھوڑی دیر میں پھر آئیں گے۔“

”بھہ۔ پھر آئیں گے؟“ ثمنہ ہلکا گئی۔ اس کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔ ”ہم گھر کیسے

جائیں گی۔ وہ ہمیں پھر پریشان کریں گے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ان لڑکیوں آدمی رات کو ایلی گھروں سے کیوں نکلتی ہیں۔ کہاں

انہیں چھپا دو۔“

نورے نے باری باری ٹینہ اور شاہ پری کی طرف دیکھا اور طافو کو اشارہ کیا۔ ان دونوں نے چارپائی اٹھا کر دوسری طرف رکھ دی۔ چارپائی کے پیچھے دیوار میں زمین کے قریب ایک سوراخ تھا۔ یہ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اس میں آسانی سے ہاتھ ڈالا جاسکتا تھا۔

”ادھر آکر کھڑی ہو جاؤ تم دونوں۔“ نورے نے ٹینہ اور شاہ پری کو اشارہ کیا اور پھر آگے بڑھ کر ٹینہ کو بازو سے پکڑ کر اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں پہلے چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ طافو شاہ پری کو پکڑ کر اس جگہ لے آیا تھا۔ ٹینہ یا شاہ پری نے ان دونوں سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

نورے نے جھک کر دیوار میں ہاتھ ڈالا اور اندر کسی چیز کو حرکت دی۔ ٹینہ اور شاہ پری چونک گئیں۔ زمین کا وہ حصہ لفٹ کی طرح نیچے دھنسنے لگا۔ تقریباً ”چھ فٹ نیچے جاکر زمین رک گئی۔ اب زمین کا تین بائی چار فٹ کا وہ ٹکڑا کسی چبوتے کی طرح نظر آ رہا تھا۔“ خانے کی زمین اس سے تین فٹ نیچے تھی۔

”نیچے اتر جاؤ۔ گرنا نہیں۔ چوٹ لگ جائے گی۔“ نورے نے ٹینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو میں تمہیں سارا دیتا ہوں۔“

نورے نے سارا دیکر ٹینہ کو چبوترے سے نیچے اتار دیا۔ طافو نے بھی شاہ پری کو سارا دینا ضروری سمجھا تھا اور وہ دونوں خود بھی نیچے اتر آئے تھے۔

ٹینہ خوفزدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ یہ تہ خانہ تین فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ فرش اور دیواریں پختہ تھیں۔ مختلف جگہوں پر تین مرکزی ٹیوب لائیں روشن تھیں۔ ان ٹیوب لائنوں کا تعلق غالباً راستے کے سینکڑم سے تھا۔ لیکن ایک طرف دیوار پر سوچ بورڈ بھی لگا ہوا تھا جس کے تمام سوچ آف تھے۔ نورے نے تین چار سوچ آن کر دیئے اور اسی دیوار کے ایک سوراخ میں ہاتھ ڈال کر کسی چیز کو حرکت دی۔ وہ چبوترہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ اس کے نیچے لفٹ شافٹ لگی ہوئی تھیں۔ ایسی لفٹ شافٹ عام طور پر پٹرول بمپوں پر نظر آتی ہیں۔ جو کارپوں کو دھونے یا سروس کرنے میں استعمال ہوتی ہیں۔

وہ چبوترہ چھت کے خلا میں فٹ ہو گیا۔ تہ خانے کا راستہ بند ہونے سے ٹیوب لائنوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ نورے نے سوچ آن کر دیئے تھے۔

اس وسیع و عریض کمرے میں دیواروں کے ساتھ شیشے کی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ اور ان الماریوں میں بہروں کے پکٹ بھرے ہوئے تھے۔ ٹینہ کے خیال میں ہر پکٹ بائج کلو کا ضرور

رہتی ہو تم لوگ؟“ اسی غنڈے نے کہا۔ اس نے آخری الفاظ ٹینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

”ٹیلی فون ۱۔“ کیچن کے پچھلی طرف۔“ ٹینہ نے جواب دیا۔ ”ہم بھوگیوال میں اپنی بیمار مائیں کو دیکھنے گئی تھیں۔ واپسی پر دیر ہو گئی۔ تم لوگ ہمیں گھر تک چھوڑ آؤ۔“ بڑی مہربانی ہوگی تم لوگوں کی۔“

”نہی بی بی ناں۔“ وہی غنڈہ بولا۔ ”دو چار غنڈوں سے تو ہم نمٹ سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمیں راستے میں گھیر لیا تو ہم کیا کریں گے۔ اپنی جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے نا۔۔۔ اگر انہوں نے یہاں حملہ کر دیا تب بھی ہماری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب موقع ہے تم لوگ یہاں سے چلی جاؤ۔“

”نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ ہمیں راستے میں گھیر لیں گے۔“ ٹینہ نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ دونوں لپٹائی ہوئی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”لیکن تم لوگوں کیلئے ہم اپنی جانیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“ وہی غنڈہ بولا۔ ”ہمیں یہاں چھپالو۔“ ٹینہ گھمبیرائی۔ ”وہ غنڈے یہاں سے ہو کر چلے جائیں گے تو ہم یہاں سے نکل جائیں گی۔“

”کہاں چھپالیں تمہیں؟“ وہ بولا۔

”اوتے نورے۔“ دوسرے غنڈے نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”پجاری بہت پریشان اور ڈری ہوئی ہیں۔ انہیں تھوڑی دیر کے لئے تہ خانہ میں چھپا دو۔ وہ حرامزے یہاں کا چکر لگا کر چلے جائیں گے تو ہم انہیں بھی یہاں سے نکل دیں گے۔“

”تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے طافو۔“ نورے نے کہا۔ ”وہ تہ خانہ ہی ان کیلئے محفوظ رہے گا۔ بعد میں انہیں نکل کر ہم ان کو گھر بھی چھوڑ آئیں گے۔“

اسی دوران گیٹ کی طرف سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی لکڑی گری ہو۔ نورے اور طافو نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نور انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی دو منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں بولنے سے منع کر دیا اور خود سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے ہیں اور طویلے کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تو پھر سوچ کیا رہے ہو۔“ طافو بھی سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ”تہ خانے کا راستہ کھولو اور

دوسری طرف ثینہ بھی کچھ ایسی صورت حال سے دوچار تھی۔ نورے نے ثینہ پر چھلانگ لگائی تو وہ بڑی پھرتی سے جھکائی دیکر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چیخی تھی۔

”ایکشن شاہ پری!“

اور پھر دونوں نے بیک وقت اپنی اپنی شلوار کے نیپوں میں اڑے ہوئے پستول نکال لئے۔

”بس۔ اب ختم ہو گیا تم لوگوں کا ڈرامہ۔“ ثینہ نورے کو پستول کی زد میں لیتے ہوئے بولی۔

”تم سمجھتے تھے کہ ہم واقعی غنڈوں سے بچنے کیلئے یہاں آئی تھیں اور جب تم دھوکے سے ہمیں نہ خانے میں لا رہے تھے تو ہم کچھ نہیں سمجھی تھیں۔ ہم تو خود اس نہ خانے میں آنا چاہتی تھیں اور تم لوگ بڑی آسانی سے ہمارے جال میں پھنس گئے۔“

”کون ہو تم لوگ؟“ نورے نے کہا۔ ان کے ہاتھوں میں پستول دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم

چلا پڑ گیا تھا۔

”تمہاری موت۔“ ثینہ نے کہا۔ ”لیکن نہیں۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔ ہمارا معاملہ تو حاجی عبداللہ سے ہے۔ تم لوگ تو اس کے معمولی کارندے ہو۔ تمہیں زندہ رکھا جائے گا۔ تاکہ تم لوگ حاجی کو بتا سکو کہ یہاں کون آیا تھا۔“

”ٹٹ۔“ ثینہ نے؟“ نوراً ہکلیا۔ اس کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا تھا۔

”پہچان لیا۔“ ثینہ مسکرائی۔ ”پہلے بھی دیکھا تھا مجھے؟“

”نہیں۔“ نوراً بولا۔ ”حاجی کی اقبال ٹاؤن والی کو بھی تم نے آگ لگائی تھی۔“

حاجی نے ہمیں ہوشیار کر دیا تھا مگر پھر بھی ہم دھوکہ کھا گئے۔“

”اگر تمہیں اپنے فرض کا احساس ہوتا اور دل میں ہوس نہ ہوتی تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔“ ثینہ نے کہا۔ ”اب حاجی کے اس گودام کا حال بھی اقبال ٹاؤن والی کو بھی جیسا ہوگا اور اربوں روپے مالیت کی یہ ہیروئن چند منٹ میں دھواں بن کر اڑ جائے گی۔“

ہاتھ اٹھا لو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

ان دونوں نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی تھی۔ نہ خانے میں رسیاں بھی موجود تھیں اور انہیں ہاتھوں میں ثینہ کو ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ان دونوں نے مزاحمت بھی نہیں کی تھی۔ ثینہ کا خوف اس طرح ان کے ذہن کو لپیٹ میں لے چکا تھا کہ وہ مزاحمت کر ہی نہیں سکے تھے۔

”شاہ پری!“ ثینہ ان دونوں کو ہاتھوں کے بعد سیدھی ہوتی ہوئی بولی۔ ”تم یہیں رکو میں تمہیں کو بلا کر لاتی ہوں۔“

ہوگا۔ اس حساب سے وہ ہیروئن دو ٹن سے بھی زیادہ ہو سکتی تھی۔ لاہور حاجی عبداللہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہاں سے پوری دنیا کو مال سپلائی ہوتا تھا۔ یہ تو ایک گودام تھا۔ ہو سکتا ہے اس طرح کے اور بھی کئی گودام ہوں جو اسی طرح ہیروئن سے بھرے ہوئے ہوں۔ شاہ پری بھی متوحش نظروں سے ان الماریوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کیوں اویئے طافو۔“ ثینہ نورے کی آواز سن کر چونک گئی۔ وہ اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کیسی رہی ہماری یہ چال؟ غنڈوں سے بچ کر پناہ لینے کیلئے ہمارے ڈیرے پر آ گئے تھیں۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ ہم ان سے بھی بڑے غنڈے ہیں۔“

”آج کی رات تو جشن منائیں گے۔“ طافو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”تازہ مال ہے۔“

آجائے گا۔ اب تک تو گلیوں میں پھرنے والی فقیرنیوں پر ہی گزارہ کرتے رہے ہیں۔ مگر ان کو دیکھو۔۔۔ کیسی چمک رہی ہیں۔“

”ہاں۔ زندگی میں پہلی بار ایسی چیز ملی ہے۔ آج تو واقعی جشن منائیں گے۔“ نورے نے ہم ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج تم لوگوں کو پتا چلے گا کہ آدمی رات کو اکیلے گھر سے نکلنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔“

”کک۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔ کیا چاہتے ہو تو لوگ؟“ ثینہ خوفزدہ انداز میں ہکلائی۔

”تم تو خود سیانی ہو۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔“ نورے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”شرافت سے ہماری بات مان لو۔ ہنسی خوشی راضی ہو جاؤ گی تو بعد میں ہم تمہیں تمہارے گھر تک بھی چھوڑ آئیں گے۔“

”نہیں نہیں۔“ ثینہ خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”تم لوگوں نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ ہمیں چھوڑ دو۔“

”کیسے چھوڑ دیں۔“ نوراً بھی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”زندگی میں پہلی بار تو ایسی چیز ملی ہے۔ کیسے چھوڑ دیں۔“

”ہم شور مچا دیں گے۔“ ثینہ نے دھمکی دی۔

”اس سے کیا ہوگا۔“ نورے نے کہا۔ ”جتنا مرضی جیج لو۔ تمہاری آواز اس نہ خانے سے باہر نہیں جائے گی۔“

شاہ پری بھی منت ساجت کرتی ہوئی پیچھے ہٹ رہی تھی اور طافو نے اسے گھیر کر دیوار سے لگا دیا تھا۔ شاہ پری کیلئے اب پیچھے ہٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس نے ایک طرف ہٹنا چاہا مگر طافو شکاری کتے کی طرح اس پر جھپٹا تھا لیکن شاہ پری جھکائی دیکر نیچے بیٹھ گئی۔

اس نے دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر ایک کنڈے کو گھمایا۔ اوپر والے کمرے کے فرش کا وہ حصہ نیچے آگیا۔

”تہ خانے سے باہر آکر ٹینہ محتاط انداز میں چلتی ہوئی طویلے کے پھانک کے پاس آگئی۔ پھانک کی آڑ میں رک کر اس نے دو انگلیاں ہونٹوں میں ڈال کر سٹی بجائی اور انتظار کرنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد ہی انسپکٹر عثمان وہاں آگیا۔ ٹینہ اسے تہ خانے میں لے آئی۔ الماریوں میں بھری ہوئی ہیروئن دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

نورے کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ نور ابھی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عثمان نے ٹینہ کے ہاتھ سے پستول لے لیا اور اس کی ٹالی نورے کی کھوپڑی پر رکھ کر ٹرانسگر دبا دیا۔ نورے کے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے ایک دو جھٹکے لئے اور ختم ہو گیا۔ ”یہ کیا کیا تم نے؟“ ٹینہ نے عثمان کو گھورا۔

”یہ مجھے جانتا ہے اور اچھی طرح پہچانتا ہے۔“ انسپکٹر عثمان نے اس کے کان میں سرگوشی کی پھر وہ طاؤف کی طرف دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں بولا۔ ”مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟“ ”نہیں جی۔“ طاؤف نے جواب دیا۔ وہ نورے کا حشر دیکھ کر کانپ اٹھا تھا۔ ”مجھے مت ماریں جی۔ میرے نکلے نکلے بچے ہیں۔“

”تمہیں ان لوگوں کے نکلے نکلے بچوں کا خیال نہیں آتا جنہیں تم لوگ بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہو۔“ انسپکٹر عثمان نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

”اس کے ساتھ الجھ کر وقت ضائع مت کرو۔“ ٹینہ نے عثمان کو ٹوک دیا۔ ہمیں اپنی کارروائی مکمل کر کے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔“ ٹینہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم باہر جاؤ اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور لکڑیاں وغیرہ نیچے پھینکتے رہو۔ ہم نیچے کا کام سنبھال لیں گی۔“

انسپکٹر عثمان اوپر چلا گیا اور کوٹھڑی کے سامنے انبار میں سے لکڑیاں اٹھا اٹھا کر نیچے پھینکتے لگا۔ اس میں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر زیادہ تر ٹوٹے ہوئے تانگے اور درختوں کی خشک لکڑیاں تھیں۔

ٹینہ اور شاہ پری وہ لکڑیاں اٹھا اٹھا کر الماریوں کے ساتھ ساتھ ڈھیر کرتی رہیں۔ انہیں اس کام میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا اور اس ایک گھنٹے کے دوران ہیروئن کے پیکٹوں سے بھری ہوئی ہر الماری کے ساتھ اچھی خاصی لکڑیاں جمع ہو چکی تھیں۔

ٹینہ اور شاہ پری نے نورے کی لاش اور رسیوں سے بندھے ہوئے طاؤف کو اٹھا کر چوترے پر ڈال دیا اور لفٹ کو اوپر بھیج دیا۔ عثمان نے نورے کی لاش کو اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور طاؤف

کو بھی پیر سے دھکا دیکر ایک طرف گرا دیا۔

”عثمان۔ ماچس نیچے پھینک دو۔“ ٹینہ نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر عثمان نے جیب سے ماچس نکال کر نیچے پھینک دی۔ ٹینہ نے شاہ پری کو اشارہ کیا۔ وہ لفٹ والے چوترے پر کھڑی ہوگئی اور ٹینہ آگے بڑھ کر الماریوں کے سامنے لکڑیوں کو آگ لگانے لگی۔ لکڑیوں کے ساتھ جگہ جگہ پتلی شاخوں والی خشک جھاڑیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ ان جھاڑیوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ ٹینہ نے پانچ چھ جگہوں پر آگ لگائی تھی جو آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی۔

ٹینہ نے دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر لفٹ کے میکینزم کو حرکت دی لیکن اس چوترے نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ میکینزم کو بار بار حرکت دیتی رہی۔ ٹینہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ بار بار کوشش کے باوجود وہ چوترا اس سے مس نہیں ہوا تھا۔

تہ خانے میں آگ تیزی سے پھیل رہی تھی اور دھواں بھر رہا تھا۔ آگ کی تپش سے ایک الماری کا شیشہ چٹخ کر گرا تو چھٹاکے کی آواز سے شاہ پری بھی بدحواس ہوگئی۔ انسپکٹر عثمان بھی اوپر سے لفٹ کے میکینزم کو بار بار حرکت دے رہا تھا لیکن مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔

”اے چھوڑ دو عثمان۔ ہمیں ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچو۔ جلدی کرو۔ آگ پھیل رہی ہے۔“ ٹینہ نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

عثمان نے جھک کر ٹینہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اوپر کھینچنے لگا۔ اوپر آکر ٹینہ ایک طرف کھڑی ہوگئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ عثمان ایک بار پھر جھک کر شاہ پری کو اوپر کھینچنے لگا۔ شاہ پری بھی اوپر آگئی تھی۔

”جلدی کرو۔“ کچھ لکڑیاں تہ خانے کے اندر پھینک دو تاکہ آگ مزید پھیل جائے۔“ ٹینہ نے کہا۔

وہ تینوں لکڑیاں اٹھا اٹھا کر تہ خانے میں پھینکتے گئے۔ یہاں تک کہ راستے والی خلا بھی لکڑیوں سے بند ہوگئی۔ نیچے سے یہ لکڑیاں آگ پکڑتیں تو طویلے کا اوپر والا حصہ بھی آگ کی زد میں آجاتا۔ انہوں نے کوٹھڑی میں بھی بہت سی لکڑیاں پھینک دی تھیں۔

”میں طفیل کو بلاتی ہوں۔ اور تم اسے اٹھا کر پھانک کے پاس لے آؤ عثمان۔“ ٹینہ نے طاؤف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دوڑتی ہوئی طویلے کے پھانک کے قریب چلی گئی اور پہلے کی طرح دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سٹی بجائی۔

صرف دو منٹ کے اندر اندر طفیل گاڑی لیکر وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہیڈ لمپس اور اندر کی

بتیاں بھی سمجھی ہوئی تھیں۔

”ڈکی کھول طفیل، جلدی کرو۔“ ثینہ نے کہا اور اندر کی طرف دوڑی گئی۔

اسی دوران انسپکٹر عثمان طافو کو اٹھا کر وہاں لے آیا تھا۔ طفیل نے ڈکی کھول دی۔ عثمان نے طافو کو ڈکی میں ٹھونس کر ڈھکنا بند کر دیا۔ پھر وہ اور طفیل مل کر نورے کی لاش اٹھا کر لے آئے اور اسے طویلے کے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر ڈال دیا۔

اس دوران ثینہ اور شاہ پری کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔

انسپکٹر عثمان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور طفیل دوسری سیٹ پر۔ ثینہ نے مڑ کر دیکھا۔ یہ خانے والی کوٹھڑی سے دھواں نکلتا شروع ہو گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ خانے میں آگ پھیل رہی تھی۔

عثمان نے یوٹرن لیا اور کار کو چوک کی طرف موڑ دیا چوک پر سگریٹ اور چائے کی دکانیں بند ہو چکی تھیں اور یہاں مکمل سناٹا تھا۔ اس چوک سے نکلنے والی ایک سڑک تو حق نواز روڈ تھی جو باغبانپورہ سے ہوتی ہوئی شالیمار تک چلی گئی تھی۔ سامنے والی سڑک کچھ آگے جا کر جی ٹی روڈ سے مل گئی تھی اور دائیں طرف وہ سڑک تھی جو گھوڑے شاہ اور چاہ میراں کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ لوگ اسی سڑک سے آئے تھے۔ چوک سے اس سڑک کی طرف ایک گھٹلی سی بنی ہوئی تھی۔

عثمان نے اسی طرف کار موڑ لی۔ گھٹلی پر تھوڑا ہی آگے سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی پولیس چوک تھی۔ یہ چوک ایک مکان میں بنی ہوئی تھی۔ اس وقت رات کا ایک بجنے والا تھا۔ چوکی کے دفتر والے دروازے کے باہر اگرچہ ایک بلب روشن تھا لیکن دروازہ بند تھا۔ عثمان نے چوکی سے دس بارہ گز آگے نکل کر کار روک لی، نیچے اترا اور ڈکی میں سے طافو کو نکال کر سڑک کے کنارے پر ڈال دیا اور دوبارہ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے کار طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

انہیں اپنے ٹھکانے پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ شارق وغیرہ ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے البتہ مریم اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔

”بہت دیر لگا دی، ہم پریشان ہو رہے تھے۔“ نوکھانے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں کچھ دیر تو ہو گئی لیکن ہم کام اچھورا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تم دونوں کے بکھرے ہوئے بال دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ دشواری پیش آئی تھی۔“ شارق نے باری باری ثینہ اور شاہ پری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دشواری ہم نے خود پیدا کی تھی۔“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”حاجی کے صرف دو مگرے وہاں موجود تھے جنہیں قابو میں کرنے کیلئے ہمیں کچھ ڈرامہ کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اور کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔“

”کام ہو گیا؟“ نوکھانے کہا۔

”ظاہر ہے۔“ ثینہ مسکرائی۔ ”اس کے بغیر تو ہم واپس بھی نہ آتے۔ اب تک تو اس علاقے میں قیامت برپا ہو چکی ہوگی۔ اس مرتبہ تو حاجی یقیناً پاگل ہو جائے گا۔“

”وہاں کتنا مال تھا؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مال۔“ ثینہ ایک بار پھر مسکرائی۔ ”میرے خیال میں کم از کم دو ٹن ہیروئن ضرور ہوگی جو اب تک دھواں بن کر اڑ چکی ہوگی اور اس زہریلے دھوئیں کا عام لوگوں پر جو اثر ہوگا اس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ یہ دھواں لوگوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”دو ٹن۔“ شارق کے لبے میں حیرت تھی۔

”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ حاجی اس مرتبہ ضرور پاگل ہو جائے گی۔“ ثینہ نے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ لوگ چائے تو ضرور پیئیں گے۔“ قریب کھڑی ہوئی رضیہ نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی۔ اس وقت تو واقعی چائے کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔“ عثمان نے جواب دیا۔

رضیہ بلورچی خانے میں چلی گئی۔ اور آدھے گھنٹے بعد سب کیلئے چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کے دوران وہ صورت حال پر تبصرہ بھی کرتے رہے۔ اڑھائی بج گئے۔ انسپکٹر عثمان نے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو شارق نے اسے روک لیا۔

انسپکٹر عثمان فوراً ہی رکنے پر تیار ہو گیا۔

”آؤ۔ میں تمہیں کرا دکھا دوں۔ آرام سے سوتے رہنا۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“ ثینہ نے کہا اور عثمان کو اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں لے آئی۔ اور بتی جلا دی۔ یہ کارنر کا کمرہ تھا اور اس میں دو طرف کھڑیاں تھیں۔

انسپکٹر عثمان دروازے میں کھڑا ثینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ثینہ اس وقت کمرے کے اندر تھی۔ جب وہ باہر نکلنے لگی تو اس کا کندھا عثمان کے کندھے سے ٹکرا گیا۔ ثینہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی۔

وہ بستر پر لیٹ گیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

”یقیناً وہی ہوگی۔“ حاجی غریبا۔ ”اس کے علاوہ دنیا کی کسی لڑکی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ حاجی کے ڈیرے میں قدم رکھ سکے۔“

”اس کے ساتھ دو آدمی بھی تھے۔“ دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ ”ان میں سے ایک آدمی بعد میں نہ خانے میں آیا تھا اور اس نے نورے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ شینہ نے پوچھا کہ اس نے گولی کیوں ماری تو اس شخص نے کہا تھا کہ نورہ اسے پہچانتا ہے۔“

”اوہ! یہ کون ہو سکتا ہے۔“ حاجی چونک گیا۔

”آپ کے اندر ہی کا کوئی آدمی ہوگا جناب۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”طاؤف کمال ہے؟“ حاجی نے پوچھا۔

”پولیس کی تحویل میں جناب۔ انسپٹر صاحب بھی آپکے ہیں اور اس سے اس معاملے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔“

”ختم کر دو اسے۔ اس کی زبان پر میرا نام نہیں آنا چاہئے سمجھے۔“ حاجی کے لہجے میں بھڑیے کی سی غراہٹ تھی۔

”اب ایسی کوئی کوشش کرنا بیکار ہے جناب۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”کیوں۔ کیا اس نے آپ حیات پی لیا ہے؟“ حاجی چیخا۔

”وہ باقاعدہ پولیس کی کسٹڈی میں ہے اور آپ تو اخبار والوں کو جانتے ہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار والوں کو ایسے واقعات کی اطلاع کیسے مل جاتی ہے۔ اس وقت بھی کم از کم سات پولیس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز اس جگہ موجود ہیں اور انہوں نے طاؤف سے اگلا لیا ہے کہ ڈیرہ آپ کا تھا اور نہ خانے میں ڈیرہ دو ٹن کے لگ بھگ بھردن رکھی ہوئی تھی۔“

”کتے کا بچہ؟“ حاجی غریبا۔ ”ختم کر دو اسے۔ ہر صورت میں ختم کر دو۔“ یہ ممکن نہیں

جناب۔ ”دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اقبال ٹاؤن والے کیس میں آپ کے آدمیوں کو تھانے کے اندر ختم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف تھانے کا پورا عملہ بلکہ ڈی ایس پی تک کو معطل کر دیا گیا تھا۔ ہمارے انسپٹر صاحب کو شاید پہلے ہی سے اس بات کا شبہ تھا کہ اس کو ختم کرنے کی

کوشش کی جاسکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے طاؤف کو کڑی حفاظت میں رکھا ہوا ہے اور کسی کو اس سے ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ انسپٹر صاحب نے ڈی ایس پی اور ایس پی صاحب کو اطلاع دیدی ہے۔ وہ لوگ بھی اب پہنچنے والے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ انسپٹر سے کو مجھ سے بات کر لے۔“ حاجی نے کہا۔

”انسپٹر صاحب جانے وقوعہ پر ہیں جی۔ میں انہیں آپ کا پیغام دے دیتا ہوں۔“ دوسری

حاجی کو یہ اطلاع رات دو بجے ملی تھی۔

اس کے خلاف عوام کا غصہ کچھ سرد پڑ گیا تھا اور عوامی مظاہرے بھی ختم ہو رہے تھے۔ اسے اپنے آدمیوں سے صورتحال کے بارے میں مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں۔ وہ اگر چاہتا تو اپنی کسی کوٹھی میں جاسکتا تھا لیکن احتیاطاً وہ سن پورے والے اسی مکان میں مقیم تھا۔

وہ اس وقت سو رہا تھا۔ ٹیلی فون اس کے بیڈ کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ دوسری گھنٹی پر ہی کھل گئی تھی۔ کمرے میں سبز رنگ کا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ پہلے وہ خوابیدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر تیسری گھنٹی بجی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ اور پھر دوسری طرف سے جو کچھ بھی کہا گیا اسے سن کر حاجی کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ غیر شعوری طور پر ایک جھٹکے سے اٹھ کر پلنگ سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ تم لوگ کہاں مر گئے تھے۔“ حاجی دھاڑا۔

”میں نے اور شوکت نے دس بجے ڈیرے کا چکر لگایا تھا جناب۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اس وقت سب ٹھیک تھا جناب۔ نورہ اور طاؤف کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہم چند منٹ ان کے پاس بیٹھے بھی تھے۔ پتا نہیں یہ سب کچھ کب اور کیسے ہو گیا۔ میں شور کی آواز سن کر باہر نکلا تھا۔ اسی وقت دو آدمی ہمیں آگ لگنے کی اطلاع دینے کیلئے چوکی آئے تھے اور جب میں چوکی سے باہر نکلا تو دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر نورے کی لاش پڑی تھی۔ وہ ریسیوں سے بندھا ہوا تھا اور اسے سر پر گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔“

”بولتے رہو۔ میں سن رہا ہوں۔“ حاجی اس کے خاموش ہونے پر چیخا۔

”میں اپنے سپاہیوں کو لے کر جانے وقوعہ پر پہنچا تو آگ بے قابو ہو چکی تھی۔ آگ اس وقت بھی قابو سے باہر ہے۔ آسمان سیاہ دھوئیں سے ڈھکا ہوا ہے۔ فلائبرائیڈ کا ابھی دور دور تک پتا نہیں ہے۔ انسپٹر صاحب بھی پہنچ چکے ہیں اور آپ کے لئے ایک اور اطلاع یہ ہے کہ سنگھ پورہ موڑ کی طرف جلنے والی سڑک پر طاؤف بھی ریسیوں سے بندھا ہوا ملا ہے۔“

”وہ زندہ ہے؟“ حاجی نے پوچھا۔

”جی جناب۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اس نے بڑی عجیب بات بتائی ہے جناب۔“

”طاؤف کا بیان ہے کہ دو جوان اور خوبصورت لڑکیاں غنڈوں سے بچنے کیلئے ان کے ڈیرے میں کھس آئی تھیں۔ طاؤف اور نورے نے انہیں غنڈوں سے بچانے کیلئے ڈیرے میں پناہ دی تھی لیکن ان لڑکیوں نے پستول نکال لئے اور انہیں نہ خانے کا راستہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں ایک لڑکی نے اپنا نام شینہ بتایا تھا۔“

طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

حاجی نے ریسیور بٹخ دیا اور دروازے پر آہٹ سن کر اس طرف مڑ گیا۔ اس کا میزبان شفقت دروازے میں کھڑا تھا۔

”کس کا فون تھا حاجی صاحب؟“ شفقت نے پوچھا۔ ”کیا ہوا۔ بڑے غصے میں ہیں آپ؟“

”وہ لڑکی ٹہینہ۔“ حاجی غرایا۔ ”وہ مجھے مل جائے تو۔۔۔“

”مل جائے گی تو غصہ اتاریں گے نا۔“ شفقت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ تو چھلاوہ بنی ہوئی ہے چھلاوہ۔۔۔ اب کیا کیا ہے اس نے۔۔۔ آپ کی باتوں میں، میں نے طافو کا نام سنا تھا۔“

”اس نے سنگھ پورہ والے ڈیرے کو آگ لگا دی ہے۔ دو ٹن ہیروئن جل کر راکھ ہو گئی ہے۔“

یہ لڑکی تو مجھے واقعی تباہ کر کے چھوڑے گی۔ جب تک ٹہینہ اور شارق ختم نہیں ہو جاتے، میں سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔“ حاجی بولا۔

سنگھ پورہ والے ڈیرے کی تباہی کا سن کر شفقت بھی اچھل پڑا تھا۔

”ایک بات ہے حاجی جی۔“ شفقت اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”شارق کو افغانستان بھیجنے کے بعد اس کی ماں اور بہن کو اقبال ٹاؤن والی کوٹھی سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا تو میں نے اسی وقت آپ کو منع کیا تھا کہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی اور اب یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ ہے۔ وہ دونوں بچے ورپے ہمیں نقصان پہنچاتے چلے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ حرامزادے بموں اور گولیوں کی بارش سے بھی بچ کر نکل آئیں گے۔“ حاجی غرایا۔ ”اگر وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ میں ان کے سامنے سر جھکا دوں گا تو یہ ان کی بھول ہے۔ میں آخری دم تک لڑوں گا۔ چاہے میری ساری دولت ختم ہو جائے۔ انہیں تلاش کروں گا اور اپنے ہاتھوں سے انہیں موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ تم نے کہا تھا کہ وہ لوگ گلبرگ کی کسی کوٹھی میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس کوٹھی کا پتا چلا کہ نہیں؟“

”ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا۔“ شفقت نے جواب دیا۔ ”میں نے کئی آدمیوں اور دس بارہ عورتوں کو بھی اس کام پر لگا رکھا ہے۔ امید ہے کہ ایک دو دن میں کوئی سراغ مل جائے گا۔“

”اگلے ہفتے مائٹریال سے پارٹی آنے والی ہے۔ وہ لوگ مل لینے آرہے ہیں جہاز ایک ہفتہ پہلے ہی کراچی پہنچ گیا تھا جو برتھ کے انتظار میں گمرے سمندر میں کھڑا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں مال کمال سے دیا جائے گا۔“ حاجی نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”پیئرز کی پارٹی کا مال پہلے انڈیا سے جاتا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے انہیں توڑا تھا اور ریٹ بھی انڈیا کے

پلے میں زیادہ تھے۔ یہ ان سے ہماری پہلی ڈیل ہونے والی ہے۔ وہ لوگ ہمیں دس لاکھ ڈالر اس بھی دے چکے ہیں۔ اگر ڈیل مکمل نہ ہو سکی تو بین الاقوامی طور پر ہماری ساکھ ختم ہو جائے اور ہم برباد ہو جائیں گے۔“

”اس کی تو آپ فکر نہ کریں حاجی جی۔“ شفقت نے جواب دیا۔ ”کچھ مال بند روڈ والے پر موجود ہے۔ میں صبح ہی عجب گل کو پشاور فون کر دیتا ہوں۔ وہ فوری طور پر کچھ بندوبست دے گا۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں شارق اور ٹہینہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”اپنے سارے آدمی ان کی تلاش پر لگا دو۔“ حاجی نے کہا۔ ”اور بند روڈ والے اڈے پر سپرہ نہ کرو۔ اگر وہاں کوئی ایسی بات ہوئی تو میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور ہاں۔“ وہ چند

دقائق خاموش ہوا پھر بولا۔ ”میرے پولیس کے مخبر نے سنگھ پورہ سے اطلاع دی تھی کہ طافو کے ان کے مطابق ٹہینہ کے ساتھ جو آدمی تھا اس نے نورے کو محض اس لئے گولی مار کر ہلاک کر دیا کہ نورہ اسے جانتا تھا۔ مخبر نے بھی اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ وہ ہمارے اندر ہی کا کوئی آدمی

ہوتا ہے۔ جو کسی وجہ سے شارق سے مل گیا ہے۔ معلوم کرو وہ کون ہے۔ اس غدار کا پتا چل جائے تو شارق اور ٹہینہ نکت پھینکا مشکل نہیں ہوگا۔“

”کل ہی سے اس پر کام شروع کر دیتا ہوں۔“ شفقت نے جواب دیا۔ حاجی کچھ کہنا چاہتا تھا

کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسپکٹر ہوگا۔ لیکن یہ

ان کا ایک آدمی تھا جو اسے ڈیرے میں آتشزدگی کی اطلاع دے رہا تھا۔

”مجھے پتا چل گیا ہے۔“ حاجی نے مختصر سا جواب دیا اور فون بند کر دیا پھر وہ شفقت کی طرف

بٹھے ہوئے بولا۔ ”چائے بنا کر لاؤ۔ میرا تو دماغ بھی دکھنے لگا ہے۔“

شفقت کمرے سے نکل گیا اور حاجی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں

بم رکھا تھا۔ اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے اور خون کھول رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ شارق اور ٹہینہ کمال چھپے ہوئے ہیں۔ لاہور شہر میں رہتے ہوئے وہ لاپتا ہیں اور مزے

لی بات تو یہ کہ وہ دندناتے پھر رہے ہیں اور اس کے آدمی یا پولیس ان کا سراغ نہیں لگا پا رہی۔

ایک مہینے کے اندر اندر یہ چوتھا بڑا واقعہ تھا۔ پہلے سمن آباد والی کوٹھی جلا کر راکھ کر ڈالی

گئی۔ پھر اس کے آدمیوں سے تین کروڑ مالیت کا سونا چھین لیا گیا اور اس کے بعض اہم آدمیوں کو

مٹی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں شارق بھی شریک تھا۔ پھر شارق نے

بڑا رازہ کیا کہ گلبرگ میں اپنی ہی کوٹھی کو آگ لگا کر روپوش ہو گیا۔ اس نے یہ تاثر دینے کی

کوشش کی تھی کہ وہ اور ٹہینہ اس آگ میں جل کر راکھ ہو چکے ہیں لیکن پھر ٹیکسی کے حلوٹے

والا واقعہ پیش آیا اور یہ انکشاف ہوا کہ اس حلوئے میں زخمی ہونے والا شارق تھا لیکن وہ ہر سے پراسرار طور پر غائب ہو گیا اور پورے شہر کی پولیس اس کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

حاجی نے ملتان روڈ والی حویلی سے شارق کے مال پر قبضہ کیا تھا اور وہ بہت خوش تھا کہ شارق کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن تیسرے ہی دن ٹیم نے نہ صرف اس مال کو اس کی کوٹھی کو بھی اڑا دیا تھا اور اس کے بعد آج اس کی اربوں ڈالر مالیت کی ہیروئن دھوئیں اڑا دی تھی۔

”ٹیم — ٹیم —“ حاجی وانٹ کچکا کر رہ گیا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ بھوگیا والے کے قبرستان والے طویلے میں کوئی نہ خانہ ہے اور اس نہ خانے میں ہیروئن بھری ہوئی ہے۔ اس کے سوا دوسری لڑکی کون ہے اور انہیں اس کے اڑے کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والا کون ہے حاجی کے پولیس والے بھرنے بتایا تھا کہ ٹیم کے ساتھ اس کارروائی میں حصہ لینے والا حاکم ہی کے گروہ کا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی تھی کہ اس نورے کو محض اس لئے گولی مار دی تھی کہ وہ اسے جانتا تھا اور اسے یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ اگر نورے کو زندہ چھوڑ دیا گیا تو وہ اسے شناخت کر لے گا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی گروہ ہی کا آدمی تھا۔

حاجی کو اب دوسرے ٹھکانوں کی فکر ہو گئی تھی جن میں اربوں ڈالر کا مال بھرا ہوا تھا۔ اس مال میں اسلحہ بھی تھا اور ہیروئن بھی۔ سب سے زیادہ مال بند روڈ والے اڑے پر تھا۔ جہاں آدمی چھپ چکے تھے اور حاجی نے شفقت کو ہدایت کردی تھی کہ اس اڑے کی حفاظت کیلئے مزید آدمی بھیج دیئے جائیں اور جو کوئی اڑے میں داخل ہونے کی کوشش کرے اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔ خوبصورت لڑکیوں پر خاص طور پر نگاہ رکھی جائے۔ اگر کوئی لڑکی کسی بھی باندے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے پکڑ لیا جائے اور حاجی کو مطلع کر دیا جائے۔ حاجی یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ شفقت چائے لے کر آگیا۔ اس نے ایک کپ حاجی کو دیدیا۔

اور دوسرا خود لیکر اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں چائے پیتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہے کہ شارق اور ٹیم کبہاں چھپے ہوں گے اور ان کو اطلاعات فراہم کرنے والا کون ہے۔

”اپنے گروہ کا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا حاجی جی۔“ شفقت نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا کوئی بھی آدمی غداری کا نہیں سوچ سکتا۔ یہ یقیناً کوئی باہر کا آدمی ہے۔“

”باہر کا آدمی کون ہو سکتا ہے جسے ہمارے اڑوں کے بارے میں اتنی معلومات حاصل ہوں۔“

”دو تین آدمی ایسے ہیں حاجی جی جو آپ کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں انہی میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔“ شفقت نے جواب دیا۔

”مثلاً کون؟“ حاجی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک تو زہیر ہے جی۔“ شفقت نے جواب دیا۔ ”یہ انگلینڈ والے گینگ کا نمائندہ ہے۔ وہ ہر وقت آپ کے قریب رہتا ہے۔ ایک سوڑے میں آپ نے اسے کمیشن کم دیا تھا۔ جس پر وہ براض بھی ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے ان اڑوں کے بارے میں آپ کی باتوں سے معلومات حاصل ہوئی ہوں اور اس نے انتہائی کارروائی کے طور پر شارق کو ان کے بارے میں اطلاع دیدی ہو۔“

”افغانستان جانے سے پہلے شارق سے بھی تو اس کے تعلقات رہے ہیں۔“

”اور اس کے علاوہ؟“ حاجی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پولیس انسپکٹر عثمان۔ جسے آپ نے معطل کروایا تھا۔“ شفقت بولا۔

”نہیں یار۔“ حاجی نے کہا۔ ”وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ تو کتے کی طرح میرے پیچھے دم ہلاتا

بھرتا ہے کہ میں سفارش کر کے اسے ملازمت پر بحال کرا دوں۔ اس میں اتنی جرات نہیں کہ میرے خلاف کوئی قدم اٹھائے اور پھر شارق سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو

ناہوش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ انسپکٹر عثمان پولیس

کے سروس سے معطل ہو چکا ہے اور وہ اس کوشش میں ہے کہ اس کی سروس بحال ہو سکے۔ اگر اسے

شارق اور ٹیم کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو وہ پہلی فرصت میں انہیں پکڑ کر پولیس کے

والے کر دیتا۔ جس سے نہ صرف فوری طور پر اس کی سروس بحال ہو جاتی بلکہ اسے ترقی بھی ملتی

اور انعام بھی۔ وہ میرے خلاف شارق سے بخبری کیوں کرتا۔ اس طرح اسے کیا فائدہ ہو سکتا

ہے۔“

”آپ کہتے تو ٹھیک ہیں حاجی جی۔ شفقت نے کہا۔ ”ویسے مجیدے کا بھی آج کل آپ کے

ساتھ آنا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے آپ سے کچھ باتیں معلوم ہو گئی ہوں جنہیں وہ شارق تک

نہ بتا رہا ہو۔“

”نہیں شفقت۔“ حاجی نے مجیدے والے امکان کو بھی مسترد کر دیا۔ ”نہ صرف مجیدے کا

بلکہ اس کے اور بھی بہت سے آدمی شارق کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ وہ شارق کو دیکھتے

لگتی ہیں تو مار سکتا ہے لیکن اس سے دوستی نہیں کرے گا۔ ویسے بھی مجیدہ ایک بہت چھوٹا آدمی

ہے مجھ سے دشمنی مول لینا پسند نہیں کرے گا۔“

”پھر بھی ان لوگوں پر نگاہ رکھنی چاہئے۔“ شفقت نے مشورہ دیا۔

”ہاں۔ اپنے اطمینان کیلئے ایسا کیا جاسکتا ہے۔“ حاجی بولا۔

اسی وقت فون کی کھنٹی بجی۔ حاجی نے پہلے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

”میں محمود چیہ بولا رہا ہوں“ حاجی صاحب۔“ دوسری طرف سے ہیلو کے جواب میں کہا گیا۔
”مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ۔“

”مجھے بھی اطلاع مل چکی ہے۔“ حاجی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اچھا ہوا تم نے نو کر دیا۔ طاؤف پولیس کی تحویل میں ہے اور اس نے پولیس کو بتا دیا ہے کہ وہ ڈیرہ میرا ہے۔ اگر بات منظر عام پر آگئی تو میرے خلاف مزید ہنگامہ کھڑا ہوگا۔ تم اس علاقے کے ایس پی سے با کر کے طاؤف کو وہاں سے نکال لو۔“

”یہ طاؤف کون ہے حاجی صاحب؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”ڈیرے پر رہتا تھا۔ میرا کارندہ ہے۔“ حاجی نے جواب دیا۔

”میں ابھی ایس پی سے بات کرتا ہوں۔ پھر آپ کو اطلاع دوں گا۔“ محمود نے کہا۔

”میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“ حاجی نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

محمود اسمبلی کا ممبر تھا۔ اسے اسمبلی تک پہنچانے میں حاجی ہی کا ہاتھ تھا۔ حاجی نے پہلے علاقے میں متعارف کرایا تھا۔ اس کے ہاتھوں علاقے کے لوگوں کے بہت سے مسائل حل کرو تھے جن پر حاجی نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ اس وقت دوسرے سیاسی لیڈر بھی میدان میں موجود تھے۔ دو تین تو ایسے تھے جنہوں نے سیاست کو اپنی میراث بنا لیا تھا۔ وہ لوگ اسمبلیوں میں آئے لوگ اپنے مسائل لیکر ان کے پاس جاتے تو انہیں ٹال دیا جاتا۔ ان سیاستدانوں کو صرف اپنا علاقہ مفاد عزیز تھا اور اس کے لئے وہ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے جوڑ توڑ کرتے رہتے تھے۔ عوام کے ان نمائندوں کو عوام اور ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے میں سامنے آیا۔ وہ اپنی جیب سے پیسہ خرچ کر کے لوگوں کے مسائل حل کر رہا تھا۔ علاقے میں جگہ لگے ہوئے گندگی کے ڈھیر اس نے صاف کروا دیئے تھے۔ کچھ گلیوں میں اینٹوں کے فرش دیئے تھے۔ بہت سے علاقوں میں پینے کے پانی کا مسئلہ حل کروا دیا تھا۔

لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان سارے کاموں کے پیچھے حاجی عبداللہ جیسے سمگلر کا ہاتھ۔ وہ تو صرف محمود کو جانتے تھے جو پیسہ خرچ کر کے ان کے مسائل حل کر رہا تھا۔ وہ جوان آدمی اور اس میں کالم کا جذبہ بھی تھا اور جب محمود الیکشن میں کھڑا ہوا تو لوگوں کی اکثریت نے ا

ووٹ دیے۔ محمود کی الیکشن کی مہم پر بھی حاجی نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ ووٹ خریدنے کیلئے مگر گھر جاکر نوٹ بانٹے گئے تھے اور جب الیکشن کا رزلٹ سامنے آیا تو محمود خوشی سے ناچ اٹھا تھا۔ اس کا حریف اس علاقے کا پرانا اور گھاگ سیاستدان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اسمبلی میں یہ سیٹ اسی کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ گویا یہ اس خاندان کی موروثی سیٹ بن گئی تھی اور اب پہلی مرتبہ اس خاندان کو شکست ہوئی تھی اور یہ سیٹ ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

لوگ محمود کو اپنا ہمدرد غمگسار سمجھتے تھے لیکن بہت جلد یہ بات سامنے آگئی کہ محمود بھی خدمت کا جذبہ لیکر نہیں آیا تھا۔ اس نے لاکھوں روپے بلاوجہ خرچ نہیں کئے تھے۔ وہ بھی ایک کے سو بنانے کے چکر میں تھا اور سب سے بڑھ کر وہ حاجی عبداللہ جیسے سمگلر کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ اخبارات جب بھی حاجی کے خلاف کچھ لکھتے اسمبلی میں جب بھی حاجی عبداللہ کی غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھتی محمود اور اس جیسے زر خرید نمائندے حاجی عبداللہ کے مفادات کا تحفظ کرتے اور بات کو اسمبلی کی دیواروں کے اندر ہی ختم کر دیا جاتا۔ اس طرح حاجی کو بڑے افسروں سے لیکر وزیروں پر بھی گرفت حاصل تھی۔ جو لوگ اس کے نمک خوار تھے وہ اس کے غیر قانونی کاروبار کو تحفظ فراہم کر رہے تھے اور اس کے خلاف احتجاج کرنے والے عوام پر لاشی چارج کیا جا رہا تھا۔

پانچ بجے کے قریب محمود کی کال آگئی۔

”ہاں۔ کیا ہوا؟“ حاجی نے اس کی آواز سننے ہی پوچھا۔

”طاؤف کو وہاں سے نکالنا بہت مشکل ہے حاجی صاحب۔ بات بہت اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ پولیس اور حکومت کے اعلیٰ ترین افسران اس وقت بھی وہاں کیمپ لگائے ہوئے ہیں اور صورتحال پر غور کر رہے ہیں۔“ محمود نے جواب دیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ حاجی دھاڑا۔ ”حرام خور ہو تم سب۔ میں نے کروڑوں روپے خرچ کر کے تم لوگوں کو اسمبلیوں تک پہنچایا ہے لیکن تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ ایک معمولی سا کام نہیں کر سکتے۔ یہ پولیس کے انسپٹر کی سطح کا کام تھا۔ کیا تمہارے پاس اتنے اختیارات بھی نہیں کہ ایک آدمی کو پولیس کی تحویل سے نکال سکو۔“

”بات اب بہت اوپر پہنچ چکی ہے حاجی صاحب۔“ محمود نے جواب دیا۔ ”ہیروئن کے زہریلے دھوئیں سے متاثر ہونے والے بیسیوں لوگوں کو مختلف ہسپتالوں میں پہنچایا جا چکا ہے۔ حکومت کے تلم بڑے بڑے افسران وہاں موجود ہیں اور طاؤف کے بیان سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ ڈیرہ آپ کا تھا اور وہاں ہیروئن آپ نے جمع کر رکھی تھی۔“

”آگ تو میں نے نہیں لگائی تھی۔“ حاجی چیخا۔ ”اصل مجرم کو تلاش کرنے کے بجائے مجھے نشانہ کیوں بنایا جا رہا ہے۔“

”اس لئے کہ وہ گودام آپ کا تھا۔“ محمود نے جواب دیا۔ ”ہم نے قدم قدم پر آپ کو تحفظ فراہم کیا۔ اسمبلی میں آپ کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبایا لیکن اب صورتحال بدست ہی سنگین ہو چکی ہے۔ آپ کے خلاف حکومت کے پاس اتنے ثبوت جمع ہو چکے ہیں کہ اب ہمارے لئے آپ کا دافع کرنا بدست مشکل ہو گیا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ حاجی دھاڑا۔ ”تمہاری یہ جرأت مجھے اس طرح کا جواب دے سکو۔ تم آج جو کچھ بھی ہو میری وجہ سے ہو۔ میں اگر چاہوں تو چند ہی روز میں تمہیں سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ تم۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ دوسری طرف سے لائن بے جان ہو چکی ہے۔ اس نے ریسیور ہٹ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

شفقت خاموش بیٹھا حاجی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محمود سے کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس سے حاجی بھر گیا تھا۔ اس موقع پر اس نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

حاجی عبداللہ بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک ایک کو کچا چبا جائے۔ اس کے اپنے اس کا حکم ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ محمود کو اس نے فرش سے اٹھا کر عرش پر بچھایا تھا اور اب وہی اس کے سامنے اپنی بے بسی ظاہر کر کے اس کا حکم ماننے سے انکار کر رہا تھا۔

تقریباً چھ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ حاجی نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ دھاڑا۔

”لگتا ہے بدست غصے میں ہو حاجی صاحب۔“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”کون ہو تم؟“ حاجی چونک گیا۔

”ثینہ۔“ دوسری طرف سے پرسکون لہجے میں کہا گیا۔ ”میرا تو خیال تھا کہ اس وقت تک تم پاگل خانے میں پہنچ چکے ہو گے لیکن لگتا ہے بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ کوئی بات نہیں۔ ایک آدھ کارروائی اور سہی۔“

”مم۔۔۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ حاجی نے دانت کچکچائے۔ ”تم میرے ہاتھ آجاؤ تو تمہیں کتوں سے نچوا دوں گا۔ تمہاری بوئیاں چیلوں اور گدھوں کو کھلا دوں گا۔۔۔“

تم۔۔۔

”بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے تمہارے پاگل ہونے میں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور اپنی کو ثینہ کے قہقہے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ ”فکر مت کرو۔ بس چند روز کی بات ہے۔ تم یا پاگل خانے میں نظر آؤ گے یا سڑکوں پر۔“

”بند کرو یہ بکواس۔“ حاجی دھاڑا۔

”میں نے تمہیں صرف یہ سنانے کیلئے فون کیا ہے کہ اپنے تمام تر وسائل استعمال کرنے کے باوجود تم ہمارا سراغ نہیں لگا سکے اور ہم تمہارے دوسرے اڈوں کی تلاش میں ہیں جن کا سراغ ہم جلد ہی لگا لیں گے اور اس کے بعد تمہاری باری آئے گی۔ تم تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تمہارے اس ٹھکانے کا علم جہاں اس وقت تم چھپے بیٹھے ہو، تمہارے بعض بدست زہری آدمیوں کو بھی نہیں ہے لیکن ہمیں تمہاری تمام نقل و حرکت کا علم ہے۔ اس کا یقین تم اس بات سے بھی کر سکتے ہو کہ میں اس وقت تم سے فون پر بات کر رہی ہوں۔“

”تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتیں۔“ حاجی چیخا۔

”اس کی فی الحال میں ضرورت بھی نہیں سمجھتی۔“ ثینہ نے جواب دیا۔ ”اور جب ہم تمہاری گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں تمہارے قریب آنے سے نہیں روک سکے گی۔ فی الحال خدا حافظ۔“

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ حاجی نے بھی ریسیور ہٹ دیا اور دروازے کی طرف مڑ کر چیخ چیخ کر شفقت کو پکارنے لگا۔ شفقت کے گھر والے جاگ رہے تھے لیکن شفقت سو گیا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا حاجی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”کیا ہوا حاجی جی۔“ اس کی آواز میں نیند کا شمار تھا۔

”ثینہ کا فون آیا تھا۔“ حاجی غرایا۔

”ثینہ کا! شفقت اچھل پڑا۔ ثینہ کا نام سن کر اس کی نیند کافور ہو گئی تھی اور دماغ میں دھماکے ہونے لگے تھے۔“

”ہاں ثینہ کا۔“ حاجی دھاڑا۔ ”اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ لوگ جب چاہیں مجھے بھی ختم کر سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس وقت یہاں چھپا ہوا ہوں۔ یہاں فون کرنے کا مطلب ہے کہ وہ سب کچھ جانتی ہے۔ یہ معلوم کرو کہ یہاں میری موجودگی کے بارے میں کس کس کو علم ہے۔ ان میں سے جس پر غداری کا شبہ ہو اسے گولی سے اڑا دو۔ جاؤ۔۔۔ یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔“

شفقت کچھ کے بغیر حاجی کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کی بیوی بھی

فورا" ہی اس کے پیچھے پہنچ گئی تھی۔

"کیا ہوا۔ یہ کیوں چیخ رہا ہے۔" اس کی بیوی عائشہ نے پوچھا۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ اسے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا شوہر کن کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔ حاجی کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس نے حاجی کا صرف نام سنا تھا اور یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے گھر میں جو شخص مہمان بن کر رہ رہا ہے یہ وہی حاجی ہے جس کے خلاف پورے شہر میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔ چار پانچ روز پہلے جب حاجی یہاں آیا تھا تو شفقت نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کا ایک زمیندار دوست ہے جو ایک مقدمے کی پیشی کے سلسلے میں شہر آیا ہوا ہے اور گھر سے باہر اس لئے نہیں نکلتا کہ اسے اپنے مخالفین سے جان کا خطرہ ہے۔ ان کا مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ حاجی جس کمرے میں رہائش پذیر تھا وہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ شفقت کی بیوی نے اس طرف کبھی جھانکا تک نہیں تھا۔ اسے کبھی حاجی کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی لیکن آج تو وہ رات دو بجے سے بار بار چیخ پکار کر رہا تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔" شفقت نے عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا مقدمہ کچھ کمزور پڑتا جا رہا ہے اس لئے آج رات سو نہیں سکا۔ رات دو بجے اس کے وکیل نے اطلاع دی تھی کہ اس کے اپنے آدمی ٹوٹ کر اس کے مخالفین سے جا ملے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے پھر وکیل ہی کا فون آیا تھا کہ اس کا کوئی اہم ترین گواہ اس کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہو گیا ہے۔ اسی لئے وہ غصے میں چیخ رہا تھا۔ ویسے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں پریشان کیوں نہ ہوں۔" عائشہ نے جواب دیا۔ "گھر میں جوان بیٹیاں ہیں۔ میں بھو گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ زمینداروں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ ان کی آپس کی مقدمے بازیوں میں گھر کے گھرباہ ہو جاتے ہیں انہیں تو کچھ نہیں ہوتا" مارے جاتے ہیں ان کے مزارع اور یا دوست۔۔۔ دیکھو شفقت۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "تمہارے دوست یہاں آتے رہتے ہیں۔ نہ میں کبھی کسی کے سامنے گئی ہوں اور نہ میں نے کبھی کسی کے آنے کوئی اعتراض کیا ہے لیکن جب سے تمہارا زمیندار دوست آیا ہے میں پریشان سی رہنے لگی ہوں۔ میرا تو مشورہ ہے کہ ایک آدھ دن میں اسے یہاں سے چلتا کرو۔ اگر تمہیں اپنا خیال نہیں تو میرے خیال کرو۔ اپنی جوان بیٹیوں کا خیال کرو۔"

"بات یہ ہے عائشہ۔" شفقت نے جواب دیا۔ "جب ہم پر بہت برا وقت آیا تھا اور ہم ایک وقت کی روٹی تک کو محتاج ہو گئے تھے تو میرا یہی دوست کام آیا تھا۔ تم جانتی ہو ہم کھولی نما مکار میں رہتے تھے اور اس کھولی کا کرایہ دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اپنی

اسی زمیندار دوست حاجی کی وجہ سے ہوں۔ ویسے تم ٹھیک کہتی ہو۔ گھر میں جوان بیٹیاں ہیں۔ میں ان لوگوں کے جھگڑوں میں نہیں پھنستا چاہتا۔ لیکن اسے کھرا سا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ کسی بہانے سے آج ہی اسے یہاں سے چلتا کروں۔"

"ہم سب کا فائدہ اسی میں ہے۔" عائشہ بولی۔ "مکملے والوں کو بھی اب باتیں بنانے کا موقع مل رہا ہے۔ ہماری پڑوسن فاطمہ کل مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہ کیسا مہمان ہے جو چوبیس گھنٹے گھر میں گھسا رہتا ہے اور باہر نہیں نکلتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آج ہی اسے رخصت کروں گا۔" شفقت نے جواب دیا اور الماری میں سے کپڑے نکالنے لگا۔

"نہیں جارہے ہو؟" عائشہ نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ دوپہر تک واپس آؤں گا۔ تم لڑکے کے ہاتھ حاجی صاحب کو ناشتہ بھجوا دینا۔" شفقت نے کہا۔

"تم بھی ناشتہ کر کے جانا۔ میں بانو سے کہتی ہوں پہلے تمہیں ناشتہ بنا دے۔" عائشہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

شفقت اپنی جگہ پر کھڑا سوچتا رہا۔ وہ بیوی کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ عائشہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اس کی تین جوان بیٹیاں ہیں۔ دو کالج میں اور ایک سکول میں پڑھتی ہے۔ اس محلے میں بڑی شرافت سے زندگی گزار رہا تھا۔ لوگ اس کے بارے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ بزنس میں ہے۔ وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اور شفقت نے یہ عقلمندی کی تھی کہ اپنے اس کالے دھندے کو اس نے گھر سے دور ہی رکھا تھا۔ اس نے بیوی کو بھی کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور نہ ہی بیوی نے کبھی اس سے کچھ پوچھا تھا اور آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے صورتحال کی نزاکت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے حاجی عبداللہ کیلئے بڑے بڑے کام کئے تھے۔ شارق سے بھی اس کے تعلقات رہے تھے اور شارق کے افغانستان جانے کے بعد حاجی نے جب اس کی ماں اور بہن سے کوٹھی چھیننے کا فیصلہ کیا تھا تو شفقت نے حاجی کو اس کام سے روکنا چاہا تھا لیکن حاجی نے بات نہیں مانی تھی اور شارق کی ماں اور بہن کو دھکے دیکر کوٹھی سے نکلوا دیا تھا۔

افغانستان سے واپس آنے کے بعد جب شارق کو صورتحال کا علم ہوا تو اس نے حاجی کے خلاف اشتقاقی کارروائیاں شروع کر دیں۔ شارق کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کرنا تو کیا حاجی ابھی تک یہ پتا نہیں چلا سکا تھا کہ شارق اور شیمین ہیں کہاں۔ حاجی بار بار ٹھکانے بدل رہا تھا لیکن وہ ہمہ وقت شارق کی نگاہوں میں تھا۔ شارق کو اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حاجی اس کے گھر میں چھپا



”مبارک ہو بھی۔ حاجی عبداللہ دس پورے والے ٹھکانے سے بھی بھاگ گیا۔“
یہ بات انسپکٹر عثمان نے کہی تھی جو ابھی ابھی اندر داخل ہوا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر آنے والا ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ ٹینے نے جلدی سے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا اور عثمان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”تفصیل سے بتاؤ۔ وہ کس وقت وہاں سے گیا ہے اور کہاں گیا ہے؟“

”وہ رات نو بجے کے لگ بھگ وہاں سے گیا ہے۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”میں دس بجے کے قریب مصری شہ میں پہلوان کی دکان سے پان بوا رہا تھا۔ میرا ارادہ اسی طرف آنے کا تھا اور تم لوگوں کیلئے پان بوا رہا تھا کہ شفقت بھی وہاں آگیا۔ اس کے ساتھ گاڑی میں اس کی بیوی اور بیٹیاں بھی تھیں۔ وہ شاید انہیں سیر کرانے کیلئے نکلا تھا اور پان لینے کے لئے رک گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ گاڑی سے اتر آیا۔ وہ آج مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ حاجی عبداللہ سے کچھ بدگن ہو رہا ہے۔ میں نے اس سے یہ دریافت کیا تھا کہ وہ تو حاجی کا بہت قریبی ساتھی ہے۔ اس سے ملاقات ہو تو اس سے میری سفارش کر دے کہ اب تو مجھے معاف کر دے۔ اس کے ایک ٹیلی فون پر میری ملازمت بحال ہو سکتی ہے اور تم لوگ جانتے ہو اس نے کیا جواب دیا تھا؟“

”اس نے جواب تمہیں دیا تھا۔ ہم کیسے جان سکتے ہیں۔“ ٹینے مسکرائی۔

”اس نے کہا تھا کہ حاجی نو بجے تک تو اس کے گھر پر تھا۔ لیکن اس نے اسے چلا کر دیا اور ابھی اسے بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اس کے بعد وہ عجیب سی باتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی جوان بیٹیوں کا بھی ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ حاجی سے بدگن ہو رہا ہے اور اس سے الگ ہونا چاہتا ہے۔“

”گھڑ!“ ٹینے نے اس کے خاموش ہونے پر کہل۔ ”لوگ چڑھتے سورج کی پوچا کرتے ہیں۔ حاجی عبداللہ کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ شفقت پہلا آدمی ہے جس کے بارے میں تم نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ حاجی کو چھوڑ رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ چند روز کے اندر اندر اس کے سارے آدمی بھاگ جائیں گے۔ لیکن ہم حاجی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ اس کے جوڑے ہماری نظروں میں آچکے ہیں انہیں تو ہر حال میں جلا کرنا ہے۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اب تمہیں دو کام کرنے ہیں پہلے نمبر پر یہ معلوم کرنا ہے کہ حاجی کا کیا

ہوا تھا۔ شفقت دراصل حق نمک ادا کر رہا تھا لیکن آج بیوی کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اب حاجی ہارا ہوا گھوڑا ہے اور شفقت کے خیال میں ہارے ہوئے گھوڑے پر شرط لگانا عقلمندی نہیں تھی۔ اس نے چشم تصور سے آنے والے کل کی تصویر بھی دیکھ لی تھی۔ محمود کو حاجی نے اسمبلی تک پہنچایا تھا وہ حاجی کے پیچھا کرتا تھا لیکن آج اس نے بھی حاجی کی کوئی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شارق اور ٹینے کی کارروائیاں تیز ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف عوامی دباؤ سے حکومت بھی حاجی کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہی تھی۔ ان حالات میں عقلمندی کا تقاضا تو یہی تھا کہ حاجی سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ لیکن وہ حاجی سے اس طرح الگ ہونا چاہتا تھا کہ اسے شبہ نہ ہو سکے کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ بہت سوچ پچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی اور اس نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شفقت اپنے خیالات سے اس وقت چونکا جب اس کی بڑی بیٹی بانو اس کے لئے ناشتا لیکر آگئی۔ وہ ناشتا کمرے میں پڑی ہوئی چھوٹی میز پر رکھ رہی تھی اور شفقت بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”بانو ناشتا۔“ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہل۔

”ہاں بیٹی۔“ شفقت نے کہا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔

ناشتا ختم کرنے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور آٹھ بجے کے قریب حاجی سے ملے بغیر گھر سے نکل گیا۔

شفقت نے عائشہ سے کہا تھا کہ وہ دوپہر تک واپس آجائے گا لیکن اس کی واپسی شام چھ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ وہ صرف چند منٹ کیلئے گھر میں آیا تھا اور پھر اس جے میں چلا گیا جہاں حاجی رہائش پذیر تھا۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران دونوں نے کئی مرتبہ کئی جگہوں پر فون کئے تھے۔

رات نو بجے کے قریب بیورو دروازے پر آکر رکی کل بیل بجنے پر دروازہ شفقت ہی نے کھولا تھا۔ اس وقت گلی میں کچھ لوگوں کی آمدورفت ہو رہی تھی۔ شفقت بیورو سے اترنے والے دو آدمیوں سے اس طرح گرجوٹی سے ملا جیسے وہ اس کے بہت گہرے دوست ہوں اور یہ ملاقات بہت عرصہ بعد ہوئی ہو وہ انہیں اندر لے آیا۔ وہ دونوں تقریباً دس منٹ تک حاجی سے باتیں کرتے رہے اور جب وہ واپس جانے لگے تو حاجی عبداللہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

بیورو چلی گئی۔ شفقت دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اندر آگیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

عبداللہ جیسا مکار دشمن۔۔۔ اس میں ابھی بڑا دم ہے۔ اس کے آدمی اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پولیس اور سرکاری محکموں میں اس کے نمک خوار موجود ہیں۔ اگر کسی شریف اور دیانتدار آفیسر نے اس کے خلاف کسی کارروائی کی بات کی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے خلاف واقعی کارروائی شروع ہو جائے گی اور اسے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ نہیں میرے دوست۔ اس میں ابھی بڑا دم ہے۔ وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک لڑے گا۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ عثمان کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

عثمان کھانا کھا چکا تھا۔ شاہ پری برتن اٹھا کر لے گئی اور کچھ دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ ”تم لوگوں نے کچھ محسوس نہیں کیا۔“ نوکھٹا نے اچانک کہا۔ ”باہر بارش ہو رہی ہے۔ مٹی کی بھینی بھینی منک آ رہی ہے۔“ اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈی اور بجلی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا اندر در آیا۔

”بادل تو صبح سے ہو رہے تھے۔ آخر بوندا باندی شروع ہو ہی گئی۔“ ثینہ بولی۔ ہلکی بوندا باندی سے موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔ بارش تیز نہیں ہوئی پھوار سی پڑتی رہی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ بھی ختم ہو گئی۔

وہ لوگ کافی دیر تک برآمدے میں بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے۔ ”میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔“ نوکھٹا انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

وہ لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ انسپٹر عثمان اوپر والی منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر وہ بستر سے اٹھ کر باہر آگیا۔ اوپر کی منزل پر بھی ایک کشادہ ٹیرس بنا ہوا تھا۔ جس میں چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گیا اور بادلوں سے ڈھکے ہوئے تاریک آسمان کو گھورتے ہوئے شاہ پری کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج اس کے یہاں آنے کی اصل وجہ شاہ پری ہی تھی۔ یوں تو اسے ثینہ بھی اچھی لگتی تھی لیکن ثینہ کی طرف قدم بڑھانے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں شاہ پری کو حاصل کر کے ہی رہے گا۔ خواہ اس کے لیے اسے کیسے ہی کٹھن اور نازک مرحلوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے قریب رہنے کی کوشش کرے گا تاکہ شاہ پری سے ملنے کا موقع ملتا رہے۔

انسپٹر عثمان صبح چار بجے تک ٹیرس پر بیٹھا شاہ پری کے بارے میں سوچتا رہا اور جب اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے تھکنے لگیں تو وہ کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔

ٹھکانہ کونسا ہے اور دوسرے نمبر پر بند روڈ والے ٹھکانے کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنی ہیں۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ ایک دو دن میں ہو جانا چاہئے۔“

”ہو جائے گا۔“ انسپٹر عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

”ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں جو سب سے اہم ہے۔“

”وہ کیا؟“ ثینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ عثمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں۔ پیوی نے آج کھانا نہیں دیا؟“ شارق بولا۔

”میں نے اسے چند روز کیلئے گاؤں بھیج دیا ہے۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”آج دن میں حاجی کے دو تین آدمیوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ حاجی کو اپنے بعض آدمیوں پر شبہ ہو گیا ہے کہ وہ شارق کیلئے مخبری کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے میرا نام بھی ان مشتبہ افراد کی فہرست میں ہو اس لئے میں نے آج ہی پیوی بچوں کو گاؤں بھیج دیا ہے۔ حاجی جیسے آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر شبہ ہونے کی صورت میں وہ میرے پیوی بچوں کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔“

”اچھا کیا تم نے۔“ ثینہ نے کہا پھر شاہ پری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم سالن گرم کرو۔ میں آکر دو روٹیاں پکا دیتی ہوں۔“

تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپٹر عثمان کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آج کی صورت حال پر بھی تبصرے ہو رہے تھے۔

”آج بھی اخبارات نے ضمیمے شائع کئے ہیں۔“ عثمان انہیں بتا رہا تھا۔ ”بعض اعلیٰ اور ذمہ دار افسروں کے ایسے بیانات بھی شائع ہوئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت اب حاجی عبداللہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”حکومت ضرور کارروائی کرے گی۔“ ثینہ نے کہا۔ ”لیکن اس سے پہلے ہم اپنی کارروائی مکمل کریں گے۔“

”اور اسے اس قاتل نہیں چھوڑیں گے کہ وہ کوئی مزاحمت کر سکے۔“ یہ بات شارق نے کسی تھی۔

”مزاحمت کرنے کے قابل تو وہ اب بھی نہیں رہا۔ وہ تو چھپنے کے ٹھکانے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔“ عثمان نے کہا۔

”نہیں۔ اسے کمزور مت سمجھو۔“ شارق بولا۔ ”دشمن کو کبھی کمزور مت سمجھو اور حاجی

سانس لیا۔ شاہ پری نے اس کی شکایت نہیں کی تھی۔ اس نے شاید غلطی سمجھ کر اس حرکت کو نظر انداز کر دیا تھا۔

ناشتے کے دوران یہ پروگرام بنا تھا کہ عثمان اور شاہ پری بند روڈ پر جا کر حاجی کے اس اڈے کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور اس کے بعد اس اڈے پر ریڈ کرنے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ عثمان نے کن انکھوں سے شاہ پری کی طرف دیکھا۔ شاہ پری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ دونوں گیارہ بجے کے لگ بھگ گھر سے نکل گئے۔ شاہ پری نے ٹینے کا برقعہ پہن لیا تھا۔ اس نے چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا البتہ آنکھیں برہنہ تھیں۔

کار تیزاب احاطہ اور سلطان پورہ سے ہوتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کے پل کی سیڑھیوں کے قریب جی ٹی روڈ پر آگئی۔ اور پھر دو سواریہ پل سے ہوتی ہوئی سرک روڈ پر دوڑنے لگی۔ ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے کار کی رفتار کم تھی۔ وہ شاہی قلعہ کے قریب سے گزرے تو شاہ پری حیرت آمیز نظروں سے قلعے کی عظیم دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ مغلوں کے دور کا بنا ہوا قلعہ ہے۔ لاہور شہر میں بے شمار تاریخی عمارتیں ہیں جو ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ یہ تاریخی عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ واپسی پر وقت ہوا تو میں تمہیں اس قلعے کی سیر کراؤں گا۔“ عثمان نے شاہ پری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اسے قلعے کے بارے میں بتانے لگا۔

منٹو پارک والے چوک سے کار بڑھا راوی کی طرف مڑ گئی اور پھر انہیں راوی کے پل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس چوک پر میلے کا سماں نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف شہر سے باہر جانے والی بسیں قطار میں کھڑی تھیں۔ ان اطراف سے جو لوگ لاری اڈے پر نہیں جاسکتے تھے۔ وہ یہیں سے بسوں میں بیٹھتے تھے۔ دوسری طرف شہر میں داخل ہونے والی بسیں مسافروں کو اتار رہی تھیں۔ عثمان نے کار بائیں طرف بند روڈ پر موڑ لی۔ یہ سڑک زمین کی سطح سے دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے بائیں طرف گنجان آبادی تھی اور دائیں طرف کچھ فاصلے پر دریائے راوی بہہ رہا تھا۔ سڑک اور دریا کے درمیان وسیع رقبے پر شیشم اور اسی قسم کے درختوں کا جنگل تھا۔ جس میں جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں نظر آ رہی تھیں۔ لوگ کچک منانے کے لیے یہاں آتے رہتے تھے۔

”کچھ عرصہ پہلے دریا میں سیلاب آ جانے کی وجہ سے شہر کا بیشتر حصہ پانی میں ڈوب جایا کرتا تھا۔ جس سے بہت ساجانی و مالی نقصان ہوتا تھا۔ لیکن پھر یہاں دریا کے ساتھ ساتھ بند بنا کر اس پر یہ سڑک تعمیر کر دی گئی۔ اس بند کی تعمیر سے نہ صرف شہر کو ہر سال آنے والے سیلاب کی تباہی

مچ دس بجے اسے جھنجھوڑ کر جگایا گیا۔ اسے جگانے والی شاہ پری تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

”مجھے معلوم ہے تم بیڈ ٹی پینے کے عادی ہو۔“ شاہ پری نے کہا۔ ”اسی لیے میں چائے بنا کر لے آئی ہوں۔“ اس نے جھک کر چائے کا کپ بیڈ سائز ٹیبل پر رکھ دیا۔

آنکھ کھلتے ہی شاہ پری کو دیکھ کر عثمان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔ وہ رات بھر کرسی پر بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور پھر سوتے میں بھی اس کے خواب دیکھتا رہا تھا اور اب وہ اس کے سامنے تھی۔ وہ پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور جب شاہ پری کپ رکھ کر جانے لگی تو عثمان نے غیر راوی طور پر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شاہ پری کو ذہنی طور پر ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی ٹھیں تھا کہ عثمان اس قسم کی کوئی حرکت کرے گا۔ اس نے ہاتھ چمڑانے کی کوشش نہیں کی۔ پہلے اس نے عثمان کے اس ہاتھ کی طرف دیکھا جس سے اس نے کھائی پکڑ رکھی تھی پھر شاہ پری کی نظریں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہوئی اس کے چہرے پر جم گئیں۔

ان نظروں میں بے پناہ سردمہی تھی۔ عثمان کے دماغ کو جھٹکا سا لگا اور اس نے شاہ پری کی کھائی چھوڑ دی۔

”سوری شاہ پری۔“ عثمان کے لہجے میں خجالت تھی۔ ”میرے دماغ پر شاید اب بھی نیند کا خمار طاری ہے۔“

”اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔“ شاہ پری کے لہجے میں بھی سردمہی تھی۔ ”چائے پی کر نیچے آجاؤ۔ سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

عثمان کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ دروازے کی طرف جاتی ہوئی شاہ پری کو دیکھتا رہا اور جب وہ کمرے سے نکل گئی تو کپ اٹھا کر چائے کی چکیں لینے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ نیچے اتر رہا تھا تو اس کے دل میں ہلکا سا خوف تھا۔ وہ سوچ رہا کہ اگر شاہ پری نے اس کی حرکت کے بارے میں ٹینے یا شارق کو بتا دیا ہوگا تو وہ لوگ نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

وہ سب لوگ ڈائیننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے اور رضیہ اور شاہ پری ناشتہ لگا رہی تھیں۔ عثمان کے دل میں ہلکا سا خوف تھا۔ وہ شارق کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اور باری باری ان سب کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی کے چہرے پر غیر معمولی تاثرات نہیں تھے۔ شاہ پری نے بھی آلیٹ کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ عثمان نے اطمینان کا

کارپوں سے بچا لیا گیا ہے بلکہ یہ سڑک تعمیر ہو جانے سے شہر کے درمیان فاصلے بھی کم ہو گئے ہیں۔ یہ سڑک یتیم خانے والے چوک پر بلکان روڈ سے جالمتی ہے۔“

عثمان شاہ پری کو بتا رہا تھا اور شاہ پری دائیں طرف جنگل اور دریا کی طرف دیکھنے لگتی اور کبھی بائیں طرف آبادی کی طرف۔ آبادی سڑک سے تقریباً ”پچاس گز ہٹ کر تھی اور خاصی گنجان تھی۔ سڑک پر دونوں طرف سے ٹریفک جاری تھا۔ اس ٹریفک میں زیادہ تر بسیں اور مال بردار ٹرک شامل تھے جو شہر کی پرہجوم سڑکوں پر جانے کے بجائے شہر کے باہر ہی باہر سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے اڈے کی طرف چلے جاتے تھے۔

عثمان نے ایک جگہ گاڑی روک لی اور بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ فلم اسٹوڈیو ہے۔ یہاں فلمیں بنتی ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”اگر تم فلموں میں کام کرنا چاہو تو میرے کچھ تعلقات ہیں انڈسٹری میں۔ تم ہیروئن بن کر لاکھوں دلوں پر راج کر سکتی ہو۔“

”ہیروئن؟“ شاہ پری نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ تم میں ہیروئن بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔“ عثمان بولا۔ ”ہماری انڈسٹری کی ہیروئیں ماشاء اللہ ایسی ہیں کہ جس جگہ ڈانس کرتی ہیں وہ جگہ زمین میں دھنس جاتی ہے۔ اور تم تو اسمارٹ ہو، حسین ہو، تم تو دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاؤ گی اور لوگ تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو ترسا کریں گے۔“

”مگر مجھے تو ڈانس نہیں آتا۔“ شاہ پری نے کہا۔

”یہاں ڈانس آتا ہی کیسے ہے۔“ عثمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہیروئن کی بے معنی اچھل کود پر لوگ سیٹیں بجاتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ ویسے تم چند روز میں ڈانس بھی سیکھ سکتی ہو۔“

”ہیروئن بعد میں بنوں گی پہلے وہ کام جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔“ شاہ پری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”او ہاں۔ وہ کام تو پہلے ہونا چاہیے۔“ عثمان نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی تقریباً ”ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گاڑی روک لی اور بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ باؤنڈری وال دیکھ رہی ہو۔ یہ تقریباً ”تین ایکڑ کا رقبہ ہے جسے باؤنڈری وال سے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ پلاٹ حاجی کی ملکیت ہے۔ کئی سال پہلے اس نے یہ زمین کوڑیوں کے مول خریدی تھی اور اب اس کی مالیت کروڑوں روپے ہے۔ اسے کئی پارٹیاں اس پلاٹ کے

لے آفر دے چکی ہیں لیکن حاجی اسے فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ یہاں فلم اسٹوڈیو بنانا چاہتا ہے کہ تکہ اب اسے بھی فلموں سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن جو صورتحال پیدا ہوئی ہے اس کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس کی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکے گی۔“

شاہ پری اس طرف دیکھ رہی تھی۔ خاصا وسیع و عریض رقبہ تھا جسے اونچی چار دیواری نے گھیر رکھا تھا۔ چار دیواری میں ایک بہت بڑا آہنی گیٹ تھا جس کے اندر کی طرف ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس شیشم کے کچھ درخت بھی تھے اور دو آدمی درختوں کے نیچے چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔ پلاٹ کا بیشتر حصہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور گھاس سے اٹا ہوا تھا۔ دائیں طرف ذرا آگے ایک مختصر سا مکان بھی نظر آ رہا تھا۔ کالنج نما یہ مکان دور سے خاصا خوبصورت لگ رہا تھا۔ ”درختوں کے نیچے وہ کالنج دیکھ رہی ہو۔“ عثمان نے کالنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے نیچے ایک بے خانہ بھی ہے۔ مال اسی بے خانے میں بھرا ہوا ہے۔ اور وہ دو آدمی جو چار پائیوں پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں چوہیں گھسنے یہاں رہتے ہیں۔ یہ بظاہر نئے نظر آرہے ہیں لیکن ان کے پاس جدید ترین اسلحہ موجود ہے۔“

شاہ پری بڑی گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس پلاٹ کے دونوں طرف گلیاں تھیں۔ اور آبادی گنجان تھی۔ کچھنی طرف بھی آبادی تھی۔

آبادی کے سامنے والے رخ پر بارہ چودہ فٹ چوڑی سڑک تھی۔ سڑک کے اس طرف کچی زمین تھی جس پر گھاس اور خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور شیشم کے درخت بھی نظر آرہے تھے۔ اس سے آگے سڑک والی گھاٹی شروع ہو جاتی تھی۔

شاہ پری ایک اور چیز دیکھ کر چونک گئی۔ بند والی سڑک کی ڈھلان پر درختوں کے نیچے دو تین چھوٹا دریاں لگی ہوئی تھیں۔ تین عورتیں اور تین چار ننگے دھڑنگے بچے بھی نظر آرہے تھے۔ ”یہ کون لوگ ہیں؟“ شاہ پری نے چھوٹا دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی خانہ بدوش ہیں جنہوں نے یہاں ڈیرہ جما رکھا ہے۔“ عثمان نے جواب دیا۔ خانہ بدوشوں کے اس ڈیرے کو دیکھ کر شاہ پری کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا تھا لیکن اس نے عثمان کے سامنے اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا تھا۔

”اس کالنج کے سامنے ایک خوبصورت لان بھی بنا ہوا ہے۔ کیا کالنج میں کوئی رہتا بھی ہے؟“ شاہ پری نے پوچھا۔

”حاجی کے گھر والے یا دوسرے رشتہ دار پکنک کے لیے دریا پر آتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کالنج میں رات گزارتے ہیں لیکن جب سے حاجی کے خلاف ہنگامے شروع ہوئے ہیں اس نے

سب کو اس طرف آنے سے منع کر دیا ہے۔ دو مہینوں سے یہاں کوئی نہیں آیا البتہ یہ دو چوکیدار مستقل یہاں رہتے ہیں۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔ چلو اب چلتے ہیں۔“ شلہ پری نے کہا۔

الپنڈر عین نے انجن اشارت کر کے گاڑی واپس موڑ لی۔ قلم اسٹوڈیو سے ذرا آگے نکلنے کے بعد اس نے گاڑی جنگل والی طرف سڑک سے نیچے اتار کر درختوں کے نیچے روک لی۔
”یہ بڑا اچھا چٹک پوائنٹ ہے۔ کچھ دیر یہاں بیٹھ کر واپس چلتے ہیں۔“ عین انجن بند کر کے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

شلہ پری بھی نیچے اتر آئی۔ اس جگہ خاصی رونق تھی۔ جگہ جگہ گھاس پر لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ درختوں کے نیچے جگہ جگہ لکڑی اور نکلرٹ کے بیج بھی رکھے ہوئے تھے۔ جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ درختوں کے اختتام پر دریا پر ایک لمبا چوڑا گھاٹ سامنا ہوا تھا۔ جہاں چھوٹی دلی کشتیاں موجود تھیں۔ گھاٹ پر بھی لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ لوگ کشتیوں پر بیٹھنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ درختوں کے نیچے چائے، ٹان چھوٹے اور کھانے پینے کی اشیاء کے کئی ٹھیلے بھی کھڑے تھے۔

وہ دونوں ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد عین ایک ٹھیلے سے چائے کی دو پلیٹیں لے آیا۔ ایک اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی اور دوسری شلہ پری کی طرف بڑھا دی۔ شلہ پری کو برقعے کا نقاب اتارنا پڑا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”تم افغانستان کی رہنے والی ہو۔ اور تمہیں یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔ لیکن تم اردو بہت اچھی بول لیتی ہو۔“ عین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”افغانستان کی سرحد پار کرتے ہی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ سرحدی علاقے سے آگے کوئی میری زبان نہیں سمجھ سکے گا۔ یہاں ایک زبان ایسی ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنی تمام تر توجہ اس زبان کو سیکھنے پر مبذول کر دی اور اردو ویسے بھی بڑی اچھی زبان ہے۔ بڑی شیرینی ہے اس میں۔ مجھے یہ زبان اچھی لگی تھی اس لیے جلدی سیکھ گئی۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر آئی کیوں؟“ عین نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہاں اگر تم اتنے ہاتھوں میں ہوتیں تو کوئی بات بھی تھی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟ شارق اچھا آدمی نہیں ہے کیا؟“ شلہ پری بولی۔

”شارق بحیثیت انسان بہت اچھا آدمی ہے لیکن۔۔۔۔۔۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔
”لیکن وہ جو کچھ کر رہا ہے اچھا نہیں کر رہا۔ ایک طرف بد معاشوں اور اسمگلروں کے گروہوں سے

ملا آ رہی ہو رہی ہے اور دوسری طرف پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ اس کی زندگی میں ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں ہے اور اس کے ساتھ جو بھی ہے وہ بھی اسی کی طرح خوار ہے۔ تم خود ہی بتاؤ۔ حالیہ لوہ پولیس کے خوف سے اب تک کتنے ٹھکانے بدل چکے ہو تم لوگ۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ کسی خوف کے بغیر آرام اور سکون کی زندگی گزارو۔ ہر لمحہ ایک خوف ذہن پر سوار ہے۔ کسی بھی وقت کسی طرف سے آنے والی گولی تمہاری زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم شارق کے گینگ میں کیسے شامل ہو گئیں۔“

”بات دراصل یہ ہے۔“ شلہ پری نے جواب دیا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ عین اسے پٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صبح اس نے ہاتھ پکڑا تھا۔ شلہ پری نے شارق یا ٹینہ سے اس کی شکایت نہیں کی تھی۔ جس سے غالباً عین کا حوصلہ بڑھا تھا اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسی وقت وہ اسے شارق کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ پہلے اس نے قلمی ہیروئن پٹانے کی بات کی تھی اور اب وہ اسے شارق کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شلہ پری اسے ڈھیل دینا چاہتی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”افغانستان میں شارق، ٹینہ اور نوکھلا ہمارے گھر میں آکر رہے تھے۔ اسی دوران جلدین کے ایک گروہ نے ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ ہم وہاں سے جانیں بچا کر بھاگے تو یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کئی دنوں تک ہمارا ساتھ دیا۔ ہم اپنے ہی وطن میں بے سارا، بے بس اور مجبور ہو گئے تھے۔ شارق وغیرہ قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیتے رہے۔ ہم نے اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں پناہ لی تھی لیکن اس صوبے پر قابض فوج کے ایک دستے نے اس گاؤں پر بھی حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ہمارا وہ رشتہ دار اور میرا باپ بھی مارا گیا۔ تھا۔ مرتے وقت میرے باپ نے شارق اور ٹینہ سے کہا تھا کہ میرا اور میری ماں کا خیال رکھیں۔ میری ماں کو بچھو نے ڈس لیا۔ بہت ہی زہریلا بچھو تھا۔ وہ مر گئی۔ شارق وغیرہ مجھے ساتھ لیے پھرتے رہے۔ کئی بار ان کا موت سے سامنا ہوا۔ لیکن انہوں نے قدم قدم پر میری حفاظت کی۔ سرحد پار کرنے سے پہلے شارق نے مجھے کہہ دیا تھا کہ اگر میں چاہوں تو افغانستان میں اپنے کسی رشتہ دار کے پاس جا سکتی ہوں لیکن میرا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں اس خون خرابے سے بھی نکلتا چاہتی تھی۔ اس لیے میں ان کے ساتھ آ گئی۔“

”اور یہاں آکر بھی خون خرابے میں الجھ گئیں۔“ عین نے کہا۔ ”لیکن تم نے اس کا ساتھ چھوڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“

”ایک مرتبہ کوشش کی تھی۔“ شلہ پری نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ عین

کہتا جا رہا تھا۔ ”یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شارق اور اس کے ساتھی مفور ہیں اور طویل عرصہ سے پولیس کو مطلوب ہیں تو میں نے ان کا ساتھ چھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن شارق نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ کیونکہ ایک تو میرا پاس پاسپورٹ یا ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے اس ملک میں آتے ہی میں ان کے ساتھ قتل کی چند اور وارداتوں میں ملوث ہو گئی تھی گو کہ ان میں عملی طور پر میرا کوئی حصہ نہیں تھا لیکن میں ان کے ساتھ تو تھی۔“

”گویا تم چاہتی ہو کہ ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو کر امن و سکون کی زندگی گزارو۔“ عثمان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”یہ خواہش تو ہر شخص کی ہے۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ سوچوں گا لیکن شارق یا ثمنہ وغیرہ کو ان باتوں کی ہوا نہیں لگنی چاہیے۔“ عثمان نے کہا۔

”میں ان سے ایسی کوئی بات کیوں کرنے لگی۔“ شاہ پری بولی۔

”تم فکر مت کرو۔ میں ایسا بندوبست کروں گا کہ شارق تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور تم اس شر میں آزادی اور سکون کی زندگی گزار سکو گی۔“ عثمان نے کہا۔

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔“ شاہ پری اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں چلو..... ابھی تمہیں قلعے کی سیر بھی کرانی ہے۔“ عثمان بھی اٹھ گیا۔ اس نے چاٹ والے کو پیسے دیے اور شاہ پری کے ساتھ کار کی طرف چلنے لگا۔ اس نے شاہ پری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور شاہ پری نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

کار میں بیٹھتے ہوئے شاہ پری اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور اس کی یہ مسکراہٹ انسپٹر عثمان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ شاہ پری نے یہ تجویز پیش کی کہ قلعے کی سیر کسی اور دن کی جائے گی لہذا عثمان اسے ایک شاندار ریٹورنٹ میں لے آیا جہاں انہوں نے پر تکلف کھانا کھایا اور پھر گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب وہ گھر پہنچے تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ عثمان کے دل میں اس وقت بھی ہلکا سا خوف تھا کہ شاہ پری اس کے خلاف کوئی بات نہ کر دے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاہ پری ہنس ہنس کر بانیں کر رہی تھی۔

جائے پینے کے بعد ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ عثمان چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ اب وہ

مجھ آئے گا۔ اس کے جانے کے بعد شاہ پری نے انہیں حاجی کے بند روڈ والے اڈے کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔

”پچھلے دو موقعوں پر میں اور ثمنہ ایک حربہ استعمال کر چکی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ حاجی نے اپنے آدمیوں کو الرٹ کر دیا ہو گا اور اس مرتبہ ہمارا وہ حربہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ ہم لوگ خود ہی پھنس جائیں۔ ویسے میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”حاجی کے اڈے کے سامنے بند روڈ کی ڈھلان پر خانہ بدوشوں نے ڈیرہ لگا رکھا ہے۔“ شاہ پری کہنے لگی۔ ”کیا ہم بھی خانہ بدوش بن کر آس پاس ڈیرہ نہ لگا دیں۔ اس طرح ڈیرے تک ہماری رسائی آسانی سے ہو جائے گی۔“

”تجویز تو بہت معقول ہے۔“ شارق بولا۔ ”لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ نیا ڈیرہ لگانے کے بجائے اس ڈیرہ والوں سے کچھ معاملہ طے کر لیا جائے۔“

”کیا مطلب؟“ ثمنہ نے اسے گھورا۔

”ڈیرے والوں کو پیسے دے کر وہاں سے رخصت کر دیا جائے اور ڈیرہ میں ان کی جگہ ہم لیں۔“ شارق نے کہا۔

”کیا وہ مان جائیں گے؟“ ثمنہ بولی۔

”انہیں پھٹی ہوئی چھو لدا ریوں کی معقول قیمت مل جائے گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ میرا خیال ہے صبح سویرے طفیل کو وہاں بھیج دیا جائے جو یہ بھی معلوم کرے گا کہ ڈیرے والے کرتے کیا ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ثمنہ نے کہا۔ ”بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔ اگر وہ لوگ ڈیرہ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”صبح کا انتظار کیوں کرتے ہو۔“ نوکھا بولا۔ ”طفیل کو ابھی بھیج دو وہ شام تک معلوم کر آئے گا کہ ڈیرے والے کیا کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ طفیل کو بلاؤ۔ میں ابھی اسے بھیجتا ہوں۔“ شارق بولا۔

طفیل اس وقت سودا وغیرہ لینے کے لیے بازار گیا ہوا تھا۔ لیکن پندرہ بیس منٹ بعد وہ جیسے ہی آیا شارق نے اسے بلا لیا۔

”تم سارے کام چھوڑ دو اور اسی وقت بند روڈ چلے جاؤ۔ گھوڑے شاہ سے آگے والے چوک سے تمہیں ٹیکسی یا رکشہ مل جائے گا۔“ شارق نے کہا۔

منڈی میں مزدوری کرتا تھا۔

”ان کے ساتھ وہ عورتیں کیسی ہیں۔ میرا مطلب ہے شکل صورت اور رنگ روپ کیا ہے؟“ شارق نے طفیل کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”بوڑھی عورت تو بوڑھی ہی ہے اور دوسری عورتیں البتہ خوبصورت ہیں۔ ان کے رنگ بھی گورے چٹے ہیں۔“ طفیل نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ وہ بوڑھا بندر اور بچہ کا تماشا دکھا کر دن بھر میں چالیس پچاس روپے کما لیتا ہے اور تقریباً اتنی ہی رقم ان کا تیسرا ساتھی مزدوری کر کے کما لیتا ہے اور جی.....“

”اور کیا؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”اور جی.....“ طفیل ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور عجیب سی نظروں سے کمرے میں موجود ٹینے اور شاہ پری کی طرف دیکھنے لگا پھر نظریں جھکا کر مدہم لہجے میں بولا۔ ”اور وہ دونوں جوان عورتیں کبھی کبھی دھندہ بھی کرتی ہیں۔“

”اوہ.....“ شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان لوگوں سے سودا ہو سکتا ہے۔ ان کی روز کی آمدنی سو روپے ہے جس کے لیے انہیں دن بھر سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے اگر ہم انہیں دس ہزار روپے کی پیش کش کریں تو وہ اپنی چھو لداریاں وہاں چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔ سالانہ وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”تو گویا ہم لوگ خانہ بدوشوں کی حیثیت سے ان چھو لداریوں میں رہیں گے۔“ ٹینے نے کہا۔

”ہاں۔“ شارق نے سر ہلایا۔ ”طفیل نے ان کے جو طے بتائے ہیں۔ ان کے مطابق نوکھا، عثمان اور طفیل ان آدمیوں کی جگہ لے سکتے ہیں جبکہ ان دونوں خوبصورت عورتوں کی کمی ٹینے اور شاہ پری کر دیں گی۔“

”اور بڑھیا کی جگہ۔“ ٹینے نے کہا پھر اپنی بات کا جواب بھی خود ہی دیدیا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ بڑھیا کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”بڑھیا کی ضرورت ہوگی“ شارق نے کہا۔ ”اس کے لئے میرا خیال ہے کہ نرس رضیہ کے بال سفید کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا جائے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”نرس رضیہ کو چند روز کی چھٹی لینی پڑے گی۔“ ٹینے نے کہا۔

”اور میرا خیال ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ شارق بولا۔ ”کل صبح فون کر کے عثمان کو

”بند روڈ پر کوئی میلہ لگا ہوا ہے؟“ طفیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ شارق بولا پھر شاہ پری کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔ ”اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ میلہ کہاں لگا ہوا ہے۔“

شاہ پری بھی ہنس پڑی تھی۔ پھر وہ طفیل کو سمجھانے لگی کہ اسے کہاں جانا ہے۔

”سمجھ گیا جی۔“ طفیل نے کہا۔ ”فلم اسٹوڈیو کے قریب ہی ہے وہ جگہ۔ میں جب رکشہ چلاتا تھا تو کئی مرتبہ اس طرف جا چکا ہوں۔ وہ رقبہ تو بہت عرصہ سے کسی نے دیوار لگا کر گھیرا ہوا ہے۔“

”بالکل وہی جگہ ہے۔“ شارق بولا۔ ”اس کے سامنے سڑک کی ڈھلان پر خانہ بدوشوں نے کوئی ڈیرہ لگا رکھا ہے۔ تم نے معلوم کرنا ہے کہ وہ لوگ کام کیا کرتے ہیں اور ان کے ڈیرے پر کتنے لوگ ہیں اور یہ کہ وہ لوگ کب سے اس جگہ ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔“

”اچھا جی۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں سب کچھ معلوم کر کے آؤں گا۔ پر واپسی پر دیر ہو جائے گی جی۔“

”واپس تو آ جاؤ گے نا؟“ نوکھا نے اسے گھورا۔

”کیوں نہیں آؤں گا جی۔“ طفیل مسکرایا۔ ”آپ لوگوں کو چھوڑ کر میں نے جانا کہا ہے۔“

”بس تو پھر اب رنچر ہو جاؤ۔ اور سنو۔ جیب میں پیسے ہیں یا نہیں۔“ شارق بولا۔ ”لو..... یہ رکھ لو۔ راستے میں کہیں میلہ لگا ہوا تو وہ بھی دیکھتے آنا۔ اس نے سو سو کے دو تین نوٹ

طفیل کی طرف بڑھا دیئے۔ طفیل نے نوٹ لے کر جیب میں ڈالے اور کمرے سے نکل گیا۔

طفیل کی واپسی رات دس بجے ہوئی تھی اور وہ واقعی سب کچھ معلوم کر کے آیا تھا۔

طفیل کی رپورٹ کے مطابق اس ڈیرے میں تین مرد، تین عورتیں اور دو بچے تھے۔ ایک

آدی بھاری بھر کم اور اویڑ عمر تھا۔ قد قدرے چھوٹا اور سر کے بال بہت قہینہ سے تراشے ہوئے

تھے۔ طفیل نے اس شخص کا جو حلیہ بتایا وہ نوکھا سے کسی حد تک ملتا جلتا تھا۔ دوسرا آدی دراز

قامت اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ رنگ اتنا گہرا تھا کہ اس پر کالے پن کا شبہ ہوتا تھا۔

قد و قامت کے حساب سے یہ شخص عثمان سے ملتا جلتا تھا اور تیسرے آدی کا جو حلیہ بتایا گیا وہ خود

طفیل سے ملتا جلتا تھا۔ عورتوں میں ایک عورت بوڑھی تھی اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی

ہوگی۔ ایک کی عمر بتیس کے قریب اور تیسری کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ دونوں بچے اس

عورت کے تھے جس کی عمر بتیس کے قریب تھی۔

طفیل کے کہنے کے مطابق بھاری بھر کم اور اویڑ عمر آدی اور اس کا وہ ساتھی جو طفیل کی طرح

دھلا پتلا تھا شہر میں گھوم پھر کر بندر اور رینچ کا تماشا دکھاتے تھے جبکہ دراز قامت آدی سبزی

ہو گا۔“

”وہ کیا؟“ شاہ پری نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم اسے یقین دلانے کی کوشش کرو کہ تم اس کے ساتھ ہو۔“ ثینہ بولی۔ ”آج رات جب وہ اپنے کمرے میں ہو گا تو موقع پا کر تم بھی چلی جانا اور اسے اپنے جال میں پھانس کر اس سے وہ سب کچھ اگلا لیتا جو اس کے دل میں ہے۔ اور اسے یہ یقین دلا دینا کہ ہمارا یہ مشن پورا ہو جانے کے بعد تم میزے اور شارق کے خلاف بھرپور طور پر اس کا ساتھ دو گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن“ شاہ پری چند لمحے رکی پھر بولی۔ ”لیکن اگر اس نے حد سے بڑھنے کی کوشش کی تو“

”اسے حد سے مت بڑھنے دینا۔“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”فی الحال ہمیں اس کی ضرورت ہے اور اس کا تھوڑا بہت خیرہ تو برداشت کرنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن اسے شبہ نہ ہونے پائے کہ میں نے تم لوگوں کو اس کے بارے میں بتا دیا ہے۔“ شاہ پری نے کہا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلے گا۔ اب نیچے چلو۔ تم نوکھا اور رضیہ کو دوسرے کمرے میں باتوں میں لگائے رکھنا۔ میں شارق سے بات کرتی ہوں۔“ ثینہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

وہ دونوں نیچے آگئیں۔ رضیہ اور نوکھا برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ پری ان کے پاس چلی گئی اور ثینہ شارق کے کمرے میں کھس گئی۔



شارق بھی وہ داستان سن کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ”اس پر میرا شبہ درست تھا۔“ وہ ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس پر کسی صورت بھی یہ ظاہر نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اس کی سازش سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ شاہ پری کو اچھی طرح سمجھا دو کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی رہے۔ ہمارا مشن بہت اہم ہے اور اس میں اس کا شریک ہونا بہت ضروری ہے۔ اور اسی مشن کے دوران ہم اسے بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ثینہ نے سر ہلا دیا۔ ”میں نوکھا کو سمجھا دوں کیونکہ وہ بھی اس مشن میں ہمارے ساتھ ہو گا۔“

ثینہ اٹھ کر برآمدے میں آگئی اور شاہ پری اور نوکھا کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ نوکھا

بھی بلا لو۔ تاکہ اس پروگرام کو فائل کیا جاسکے۔ اسے بلکہ ابھی فون کر دو۔ اگر وہ رات ہی کو آجائے تو ہم رات ہی پروگرام بنالیں گے اور وہ صبح سویرے ہی اپنے مشن پر نکل جائے گا۔ شاہ پری تم اسے فون کر دو۔“

شاہ پری دل ہی دل میں ہنس پڑی تھی۔ وہ جب انسپکٹر عثمان کو فون کر کے یہاں آنے کو کہے گی تو وہ سر کے بل دوڑا آئے گا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا۔ اتفاق سے عثمان اس وقت گھر پر ہی موجود تھا۔

”کیا بات ہے۔ تم نے انہیں کچھ بتا تو نہیں دیا؟“ عثمان نے شاہ پری کی بات سننے کے بعد پوچھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔ ”صبح ہم جس کام سے بگئے تھے اس سلسلے میں بات کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔“ عثمان کی آواز سنائی دی۔

شاہ پری نے ریسیور رکھ دیا اور شارق کو بتا دیا کہ عثمان یہاں آنے کے لئے گھر سے نکل رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھی رہی پھر کمرے سے نکل کر اوپر والے ٹیرس میں آگئی۔ آسمان پر بادل اب بھی تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ثینہ بھی وہاں آگئی اور اس کے قریب ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ ”تم یہاں آکر کیوں بیٹھ گئی؟“ ثینہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”بس یونہی۔ موسم کا مزہ لینے کے لئے۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔ ”اچھا ہوا تم بھی یہاں آگئیں۔ ایک ضروری بات کرنا چاہتی تھی تم سے۔“

”کوئی خاص بات؟“ ثینہ بولی۔ ”کو میں سن رہی ہوں۔“

شاہ پری چند لمحے خاموش رہی پھر انسپکٹر عثمان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔

”اس نے یہ بات ابھی تک مجھ سے کہی نہیں ہے لیکن آج کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ ملا کر تمہارے اور شارق کے خلاف کوئی سازش کرنا چاہتا ہے۔“

”آخر وہ کھل گیا۔“ ثینہ اس کے خاموش ہونے پر مسکرائی۔ ”مجھے اور شارق کو پہلے ہی اس پر شبہ تھا۔ اور جب اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو گاؤں بھیج چکا ہے تو ہمیں اس وقت یقین ہو گیا تھا کہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”میں شارق سے بات کر لوں گی۔ لیکن تمہیں بھی ایک کام کرنا

ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آرام سے بیٹھو۔“ عثمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے ساتھ چپکے کی کوشش کرنے لگا۔ ”کیا سوچا ہے تم نے؟“

”تمہارے جلنے کے بعد میں تمہاری کسی ہوئی باتوں پر غور کرتی رہی ہوں۔“ شہ پر ہی نے جواب دیا۔ ”اب واقعی مجھے احساس ہونے لگا کہ میں غلط باتوں میں پھنس گئی ہوں۔ لیکن ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔“

”یہ بھی اچھی بات ہے کہ تمہیں احساس ہو گیا ہے۔“ عثمان نے کہا۔ ”میرا ایک مقصد حاجی عبداللہ کو نقصان پہنچانا بھی ہے اور یہ مقصد شارق کے ذریعے پورا ہو رہا ہے۔ شارق کا یہ مشن مکمل ہو جائے تو ہم اپنا مشن شروع کر دیں گے۔ اس دوران تمہیں اچھی طرح سوچنے کا موقع بھی مل جائے گا اور تم کسی فیصلے پر بھی پہنچ جاؤ گی۔“

عثمان نے شہ پر ہی کو کھینچ کر اپنی آغوش میں گرا لیا۔ شہ پر ہی نے برائے نام مزاحمت کی تھی۔ لیکن جب عثمان زیادہ ہی بے قابو ہو گیا تو وہ ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے۔“ وہ اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر کسی کی آنکھ کھل گئی اور مجھے اپنے بستر پر نہ پایا تو شبہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ میری تلاش میں لوہر بھی آ جائے۔“

عثمان کے منہ سے ٹھنڈا سانس نکل گیا۔ شہ پر ہی مسکراتی ہوئی بیڑیوں کی طرف چلی گئی۔ عثمان اپنی جگہ کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ اور پھر دم سے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اور پھر اس کی وہ رات جاگتے ہی گزری تھی۔ شاہ پر ہی کا حسین تصور اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

اس نے صبح جب شہ پر ہی سے شارق کے بارے میں بات کی تھی تو اس کے ذہن میں خدشات تھے۔ دوسرے تھے شہ پر ہی، ثمنہ یا شارق سے ساری باتیں نہ کہہ دے۔ وہ سارا دن انہی خدشات میں گھرا رہا تھا۔ اور پھر جب شہ پر ہی کا فون آیا تھا تو اس وقت بھی عثمان یہی سمجھا تھا کہ اسے بھانسنے سے تو نہیں بلایا جا رہا۔ اس لئے وہ پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔ اس کی چٹون کی جیب میں پستول موجود تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو وہ کم از کم ثمنہ اور شارق کو ٹھکانے لگا ہی دے گا۔ لیکن اس کے خدشات بے بنیاد نکلے تھے۔ اور پھر آج رات جس طرح شہ پر ہی چوری چھپے اس کے پاس آئی تھی اور جو کچھ بھی ہوا تھا اس سے عثمان کو یقین ہو گیا تھا کہ شہ پر ہی نے اپنی زبان بند ہی رکھی تھی۔

کو اس نے یہ بتایا کہ عثمان نے ان کے خلاف سازش میں شہ پر ہی کو ملانے کی سازش کی ہے۔ البتہ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی کہ اسی مشن کے دوران عثمان کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ وہ تینوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اور جب باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی تو شہ پر ہی ثمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔ گاڑی گیٹ کے عین سامنے کھڑی تھی اور اس کے ہیڈ لمپس کی روشنی گیٹ کی جھریوں سے نظر آ رہی تھی۔

شہ پر ہی نے گیٹ کی ایک جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہ عثمان ہی کی گاڑی تھی۔ شہ پر ہی نے گیٹ کھول دیا اور عثمان گاڑی اندر لے آیا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ ایک بار پھر شارق والے کمرے میں بیٹھے ہوئے منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس منصوبے کے ایک ایک پہلو کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ عثمان صبح چھ بجے ہی یہاں سے نکل جائے گا اور بوڑھے خانہ بدوش سے بات کرنے کے بعد دیگر انتظامات کی طرف توجہ دے گا۔

رات دو بجے کے قریب عثمان اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شارق اور نوکرا بھی سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ ثمنہ اور شہ پر ہی دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہ دونوں پلنگ پر لیٹی سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں اور تین بجے کے قریب ثمنہ نے شہ پر ہی کو گردن سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

”جاؤ۔۔۔۔۔۔ وہ ابھی جاگ رہا ہو گا۔“ ثمنہ نے سرگوشی کی۔ ”تم اسے بیوقوف بنانے جا رہی ہو۔ کیس خود بیوقوف نہ بن جاؤ۔“

”بدتمیز کہیں کی۔“ شہ پر ہی نے اسے ہولے سے ڈانٹ دیا اور کمرے سے نکل کر دبے پاؤں زینے چڑھنے لگی۔

”عثمان صاحب۔ اس نے عثمان کے کمرے کے دروازے پر رک کر سرگوشیاً انداز میں پکارا۔ ”سو گئے کیا؟“

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے دوسری مرتبہ پکارا لیکن اس مرتبہ بھی جواب نہیں ملا۔ اور پھر دغتا۔ وہ اچھل پڑی۔ کسی نے پیچھے سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

ڈر گئیں۔ عثمان نے اس کے گلے کے قریب سرگوشی کی۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ اسی لئے میں باہر میز پر بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”نہیں۔ باہر میز پر ہی بیٹھتے ہیں۔ کھلی ہوا ہے۔“ شہ پر ہی نے کہا۔ وہ دونوں میز پر آگئے۔ جمل ہانس کی کھچبیوں سے بنی ہوئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ عثمان شہ پر ہی کو لے کر ایسی

رات کا اندھیر رخصت ہو رہا تھا۔ دن کا مدہم سا اجالا پھیل رہا تھا۔ عثمان ابھی تک ٹیرس ہی میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً میزبھیوں پر قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونک گیا اس نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

وہ شاہ پری تھی جو چائے کا کپ لئے اوپر آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن عثمان کو ٹیرس پر دیکھ کر وہ چونک گئی اور اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

”میں آپ کے لئے بیڈٹی لے کر آئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو جھنجھوڑ کر جگانا پڑے گا۔ لیکن آپ تو.....“

”میں تو رات بھر اسی کرسی پر بیٹھا رہا ہوں۔“ عثمان نے اس کے ہاتھ سے کپ لے کر قریب پڑی ہوئی کانی ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”ایک لمحہ بھی نہیں سو سکا۔ تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔ تم نے تو مجھے بے موت مار دیا ہے شاہ پری۔ تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہوا جا رہا ہے۔“

”اپنے دماغ کو ٹھکانے پر رکھیں اور تیار ہو کر نیچے آ جائیں۔ شینہ آپ کے لئے ناشتہ تیار کر رہی ہے۔ آپ کو ناشتہ کر کے چھ بجے یہاں سے نکل جانا ہے۔“ شاہ پری نے مسکراتے ہوئے کہا اور میزبھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

عثمان اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ چائے پینے کے بعد وہ کمرے میں آگیا۔ اور پھر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہاتھ روم سے باہر نکلا وہ رات بھر جاگا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لیکن ٹھنڈے پانی کے غسل سے اس کی کسلندی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔

پونے چھ بجے وہ نیچے آگیا۔ شارق اور نوکھا بھی جاگ چکے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ شینہ بھی موجود تھی۔ اس نے عثمان کے سامنے ناشتہ رکھ دیا۔ وہ بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں شاہ پری کو تلاش کر رہی تھیں لیکن شاہ پری نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔

عثمان کو اپنی منزل پر پہنچنے میں تقریباً پچاس منٹ لگے تھے۔ اس نے گاڑی خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے تقریباً دو سو گز دور روک لی تھی۔ وہ کچھ دیر گاڑی میں بیٹھا ڈیرے کی طرف دیکھتا رہا پھر نیچے اتر کر ٹھلنے لگا۔

تقریباً آٹھ بجے کے قریب وہ بوڑھا اور طفیل کی عمر کا دوسرا آدمی ڈیرے سے نکل کر سڑک

انسپکٹر عثمان کے شارق سے تعلقات اس وقت سے تھے جب وہ مرنگ تھانے کا انچارج تھا اور شارق اس علاقے میں چھانگے والا اڑا چلا رہا تھا۔ لیکن وہ تعلقات ایسے تھے جیسے ایک پولیس آفیسر اور ایک مجرم میں ہونے چاہیں۔ عام جرائم پیشہ لوگوں کو تو پولیس والے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیتے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتتے۔ لیکن بعض جرائم پیشہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی پشت پر کوئی طاقت ہوتی ہے۔ کسی سیاستدان یا حکومت کی کسی اعلیٰ شخصیت کی پشت پناہی ہوتی ہے یا وہ لوگ بڑی بڑی رقیں پولیس کو جتنے کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ شارق بھی ایک ایسا ہی مجرم تھا۔ اس کے ساتھ پیسے کی قوت تھی۔ اس نے بعض بڑے بڑے پولیس افسروں کو خرید رکھا تھا۔ عثمان خود اس کے ہاتھوں بکا ہوا تھا۔ اسے شارق سے بڑی بڑی رقیں ملتی تھیں اسی لئے اس نے شارق کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ پھر شارق حاجی عبداللہ سے مل گیا اور ملک سے باہر چلا گیا۔ حاجی عبداللہ نے شارق کے خلاف جو سازش تیار کی تھی اس کا عثمان کو علم نہیں تھا۔ لیکن حاجی عبداللہ نے جب شارق کے اڈے پر آدمی بھیج کر شارق کے ایک آدمی کو مار مار کر اودھ موار کر دیا تو عثمان نے حاجی کو گرفتار کرنے کے شوق میں اس کی کونٹھی پر چھاپ مار دیا۔ وہ اب تک حاجی کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اور اس کا نتیجہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا کہ حاجی کے ایک اشارے پر اسے ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔ اور پھر ایک روز اتفاق سے شارق سے ملاقات ہو گئی۔ حاجی سے انتقام لینے کے لئے عثمان نے شارق کو بھڑکا دیا۔ حاجی کے خلاف اسے اطلاعات فراہم کرنے لگا۔ شارق اس کی توقع سے کہیں زیادہ چالاک نکلا۔ اس نے عثمان کی ایسی تصویریں کھینچ لیں جو اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی تھیں۔ اس دوران اس کی اطلاع پر شارق نے حاجی کے تین کروڑ روپے مالیت کے سونے پر قبضہ کر لیا۔

عثمان اب شارق کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ وہ شارق سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن اس کی تصویریں شارق کے قبضے میں تھیں۔ انسپکٹر عثمان نے بہت سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اور اس کے لئے اس نے شاہ پری کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو نہ صرف اسے اپنی تصویریں واپس مل جائیں گی اور وہ ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو جائے گا بلکہ حاجی سے چھینا ہوا سونا بھی اس کے قبضے میں آ جائے گا اور پھر شاہ پری کو ساتھ لے کر یہ شہر ہی چھوڑ جائے گا۔

شاہ پری کا خیال آتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ یہ شاہ پری سے محبت نہیں تھی جو اسے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ عیاش آدمی تھا اور اس کے دل میں ہوس بھری ہوئی تھی۔

ہاتے ہیں تو ان لوگوں کو شبہ ہو جائے گا۔ اس لئے تمہارا ڈیرہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے تمہیں بہت معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“

”ہم بغیر معاوضے کے بھی پولیس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں مائی باپ۔“ بوڑھے نے کہا۔

”ممکن ہے تمہیں وہ چھوٹا دریا واپس نہ مل سکیں اس لئے ہم ان کی قیمت دیدیں گے تاکہ تمہارا بھی نقصان نہ ہو۔ میرا خیال ہے دس ہزار روپے میں تم اس جیسی کئی نئی چھوٹا دریاں بنا سکو گے۔“

”دس ہزار روپے۔“ بوڑھا چونک گیا۔

”ہاں یہ پیسے اپنے پاس رکھ لو۔“ عثمان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ”پورے دس ہزار ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”لیکن تم اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتاؤ گے کہ وہ ڈیرہ چھوڑ کر تم کیوں جا رہے ہو۔ یہ راز صرف تم تک محدود رہنا چاہئے۔ اگر نہاری وجہ سے مجرم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی جگہ تمہیں ٹانگ دیا جائے گا۔“

”کسی کو پتا نہیں چلے گا سرکار۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”ہم آج ہی وہ ڈیرہ خالی کر دیتے ہیں۔“

”آج نہیں۔“ عثمان بولا۔ ”آج تم گھوم پھر کر اپنی دھاڑی لگاؤ۔ ہم لوگ ایک دو دن میں وہاں آجائیں گے۔ ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہوں گی۔ ہم ڈیرے پر آجائیں گے تو اس کے بعد تم وگ چلے جانا۔ ان ایک دو دنوں میں تم لوگ اپنے لئے کوئی دوسرا بندوبست بھی کر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے مائی باپ۔“ بوڑھے نے نوٹوں کی گڈی بڑی احتیاط سے قمیص کی اندر والی جیب میں رکھ لی تھی۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور مجمع لگا کر لوگوں کو رپچھ اور بندر کا تماشا دکھاؤ۔“ عثمان نے کہا۔

بوڑھا اٹھ کر چلا گیا۔ عثمان کچھ دیر بیچ پر بیٹھا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر اپنی کار کی طرف چل پڑا۔ انسپکٹر عثمان شہر کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر مختلف اشیاء خریدتا رہا۔ اور جب وہ شام کو واپس لوٹا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ بہت بری طرح تھک گیا تھا۔ لیکن شاہ پری کی ایک ہی سکرابٹ سے اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اور پھر شاہ پری کے ہاتھوں سے ملنے والے چائے کے کپ نے تو اس کا موڈ بھی خوشگوار بنا دیا تھا۔ اور وہ دن بھر کی تھکن بھول گیا تھا۔

عثمان نے شارق وغیرہ کو آج دن بھر کی رپورٹ بھی بتا دی تھی اور اس بوڑھے خانہ بدوش سے ہونے والے سودے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

پر آگئے۔ بوڑھے نے رپچھ کی ڈوری تھام رکھی تھی اور دوسرے آدمی نے بندر کی۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں چھڑیاں بھی تھیں اور انہوں نے کندھوں پر تھیلے بھی لٹکا رکھے تھے۔

عثمان سڑک سے اتر کر پارک والی سائیڈ کی ڈھلان پر اتر گیا۔ وہ انہیں یہاں روک کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے انہیں آگے نکل جانے کا موقع دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد عثمان دوبارہ سڑک پر آگیا۔ وہ دونوں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ عثمان گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے راوی کے پل کی طرف موڑ دیا۔

وہ دونوں راوی پل والے چوک میں پہنچ چکے تھے۔ چوک پر بسوں وغیرہ کی وجہ سے خاصا رش تھا۔ عثمان نے کار ایک طرف روک لی اور نیچے اتر کر ان دونوں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دونوں سڑک سے ہٹ کر درختوں کے نیچے کھڑے تھے اور بوڑھا شاید مجمع لگانے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھا عثمان نے قریب پہنچ کر بوڑھے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایک منٹ کو میرے ساتھ آؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ عثمان نے کہا۔ اس کا لہجہ مدہم تھا۔

بوڑھے نے چونک کر عثمان کی طرف دیکھا۔ وہ شکل ہی سے پولیس والا لگ رہا تھا۔ صبح ہی صبح کسی پولیس والے کی شکل دیکھ لینا بوڑھے کے خیال میں کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

”بی مائی باپ۔ آپ حکم کریں۔“ بوڑھے نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ عثمان نے کہا۔

عثمان وہاں سے تقریباً بیس گز دور سینٹ کی ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

”میں پولیس انسپٹر ہوں۔“ عثمان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”درو نہیں۔ میں ایک سرکاری کلم کے سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“

”آپ حکم کریں بی باپ۔“ بوڑھا بولا۔

”ہمیں دو چار روز کے لئے تمہارا وہ ڈیرہ چاہئے جہاں تم لوگ رہ رہے ہو۔“ عثمان نے کہا۔

”کیوں سرکار۔“ بوڑھے نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جہاں تم نے ڈیرہ لگا رکھا ہے وہاں سامنے والے علاقے میں کسی جگہ چند خطرناک مجرم چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی نگرانی کے لئے ہمیں ایسی جگہ کی ضرورت ہے جہاں سے پورے علاقے پر نگاہ رکھی جاسکے۔ تمہارا وہ ڈیرہ اس مقصد کے لئے بہترین جگہ ہے۔ اگر ہم اس جگہ کوئی دوسرا ڈیرہ

”ٹھیک ہے۔“ ثینہ نے کہا۔ ”ہم لوگ کل رات دس بجے یہاں سے نکلیں گے۔ میں اپنٹل جا کر نرس رضیہ کو بھی بتا دوں گی۔“

اس کے بعد وہ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ تان لے کر بیٹھ گئے اور دو بجے تک تاش کھیلے رہے۔ کھیل ختم ہوا تو عثمان اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے عجیب نظروں سے شاہ پری کی طرف دیکھا تھا۔ شاہ پری کی طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

تین بجے کے قریب شاہ پری ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ جب وہ اپنی پہنچی تو عثمان ٹیرس پر نہیں تھا۔ آج وہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور ٹائٹ بلب کی نیلگوں روٹھ کرے میں پھیل ہوئی تھی۔ عثمان اس کے قدموں کی آہٹ سن کر اٹھ گیا تھا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم آج بھی ضرور آؤ گی۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیسے نہ آتی۔“ شاہ پری مسکراتی ہوئی بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”کسی کو ہمارے ملاقاتوں پر شبہ تو نہیں ہوا؟“ عثمان نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ اس وقت بھی سب لوگ گہری نیند سو رہے ہیں۔ لیکن میری نیند بجانے کیا اڑ گئی ہے۔“ شاہ پری مسکرائی۔

”یہی حال میرا بھی ہے۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”ہر وقت تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہوں۔“

”دراصل ہماری سوچیں ایک دوسرے تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا ارادہ ہے۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“ عثمان بولا۔

”فیصلہ تو میں نے اسی وقت کر لیا تھا جب تم نے بات کی تھی۔ لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ عثمان نے پوچھا۔

”کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ثینہ اور شارق بہت خطرناک ہیں۔ اگر وہ دونوں یا ان سے کوئی ایک بھی بچ گیا تو ہمیں کیسے پناہ نہیں ملے گے۔“ شاہ پری نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”بچ کیسے سکتے ہیں۔“ عثمان مسکرایا۔ ”میں نے جو منصوبہ بنایا ہے اس میں کوئی معمولی جھول بھی نہیں ہے ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔“

”منصوبہ کیا ہے؟“ شاہ پری نے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں کل کے بعد بتاؤں گا۔“ عثمان نے جواب دیا۔

”کل شارق کا مشن پورا ہو جائے۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنے منصوبے کی تفصیلات بتا دوں گا۔“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔“ شاہ پری بولی۔ ”تم شارق اور ثینہ کو کیوں ختم کرنا چاہتے ہو؟“

”مجھ پر ساری مصیبتیں شارق کی وجہ سے نازل ہوئی ہیں۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”حاجی عبداللہ نے شارق کے آدمی کو مارا پٹا تھا اور میں نے اس کی ہمدردی میں حاجی کو گرفتار کرنے کے لئے اس کی کوٹھی پر چھاپے مارا تھا۔ اگر میں یہ حماقت نہ کرتا تو آج میں اپنی ڈیوٹی پر ہوتا۔ اس کے علاوہ شارق اور ثینہ کو ختم کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔“

”وہ کیا۔“ شاہ پری نے پوچھا۔

”میری مخبری پر شارق نے حاجی کے آدمیوں سے تین کروڑ روپے مالیت کا سونا چھینا تھا۔ اور اس وقت یہ طے ہوا تھا کہ یہ سونا آپس میں تقسیم کر لیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بعد میں اس کا ایک ساتھی حاجی کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ پو اور ظفری کو گلبک والی کوٹھی میں جلا کر رکھ کر دیا گیا۔ مجھے آج تک اس سونے میں سے حصہ نہیں ملا۔ اور تمہیں بھی کچھ نہیں ملا۔ وہ سارا سونا شارق اور ثینہ کے قبضے میں ہے۔ ان سے وہ سونا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان دونوں کو ختم کر دیا جائے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ انہوں نے سونا کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”ہاں..... وہ اسی مکان میں رکھا ہوا ہے۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔

”گڈ۔“ عثمان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس نے شاہ پری کو ہاتھ سے پکڑ کر کرسی سے اٹھایا اور اپنے قریب بیڈ پر بٹھالیا۔

”ان دونوں کو ختم کر دینے کے بعد وہ سونا ہمارے قبضے میں ہو گا۔ ہم وہ سونا لے کر اس شہر سے دور ایسی جگہ پر چلے جائیں گے جہاں کوئی ہمارا سراغ نہیں لگا سکے گا۔“ عثمان نے کہا۔

”اور تمہاری بیوی اور بچے؟“ شاہ پری نے پوچھا۔

”لعنت بھیجو ان پر۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”میری بیوی کا باپ ایک بہت بڑا زمیندار ہے۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔ وہ آرام سے زندگی گزار لے گی۔ اس کی تم فکر مت کرو۔ اپنی سوچو۔ تم میرے ساتھ عیش کرو گی۔“

شاہ پری، شارق اور ثینہ کے بارے میں عثمان کا منصوبہ سن کر کانپ اٹھی تھی۔ بات اب

کھلی تھی۔ وہ ان دونوں کو ختم کر کے تین کروڑ روپے مالیت کے سونے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ بھی یقینی بات تھی کہ عثمان نے اس کے بارے میں بھی کوئی ایسی ہی بات سوچ رکھی ہو گی۔ جو اپنی بیوی کو چھوڑنے کو تیار ہو وہ کسی دوسری عورت سے وفا کیسے کر سکتا تھا۔ عثمان نے اچانک ہی اسے کھینچ کر بنگ پر گرا دیا تھا۔ لیکن شاہ پری بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”اب میں چلوں گی۔“ شاہ پری مسکراتے ہوئے بولی۔

”بہت چالاک ہو تم ہر بار غیہ دے کر نکل جاتی ہو۔“ عثمان بولا۔

”شارق اور ثمنہ والے منصوبے کے بعد میں تمہیں غیہ نہیں دوں گی۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔

عثمان اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت نیچے کوئی برتن گرنے کی آواز سنائی دی۔

اودہ شاید کوئی جاگ گیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ شاہ پری نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

عثمان پہلے کی طرح ہاتھ ملتا رہ گیا۔



وہ لوگ رات کے دس بجے گھر سے نکلے تھے۔

نرس رضیہ بھی شام سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ اس گروپ میں ثمنہ، شاہ پری، نرس رضیہ، نوکھا، طفیل اور عثمان شامل تھے۔ ان سب کے جسموں پر پرانے لباس تھے۔ عثمان عام طور پر پیٹ شرٹ پہنا کرتا تھا لیکن آج وہ بھی شلوار قمیض پہن کر آیا تھا۔ وہ سب کے سب پستولوں سے لیس تھے جو انہوں نے اپنے اپنے لباس میں چھپا رکھے تھے۔

وہ لوگ گلیوں میں سے نکل کر سڑک پر اس طرح چل رہے تھے جیسے کھانا کھانے کے بعد شہنئے کے لئے نکلے ہوں۔ گھر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے حلیوں میں کسی قدر تبدیلی کی تھی۔ اسپرٹ عثمان کلین شیو تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر کچھ دار بڑی بڑی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ جس سے اس کا چہرہ بڑی حد تک تبدیل ہو گیا تھا۔ نوکھا کے چہرے پر بھی سفید مونچھیں تھیں جو ہونٹوں کے کونوں سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ البتہ طفیل کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔

ثمنہ، نرس رضیہ اور شاہ پری کے چہروں پر کئی جگہوں پر نیلے خال سے نظر آرہے تھے۔ نلہ بدوش عورتیں عام طور پر چہروں کی خوبصورتی کے لئے اس قسم کے خال گدوالیتی ہیں۔ ان بچوں کے کانوں میں چھوٹی بڑی کئی کئی بالیاں تھیں اور ناگوں میں ننھتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان سب چیزوں سے ان کے حلقے بھی بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تھے۔ یہ تمام چیزیں آج ہی عثمان نے بازار سے خریدی تھیں۔

تیزاب احاطے والے چوک پر انہیں دو ٹیکسیاں مل گئیں۔ ایک ٹیکسی میں نرس رضیہ، شاہ پری اور طفیل بیٹھ گئے جبکہ دوسری ٹیکسی میں ثمنہ، نوکھا اور عثمان بیٹھے تھے۔ عثمان آگے کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

پونے گیارہ بجے کے قریب وہ ٹیکسیاں دریائے راوی کے پل والے چوک پر رک گئیں اور وہ سب نیچے اتر آئے۔ ان ٹیکسیوں کو فوراً ہی وہاں سے سواریاں مل گئی تھیں۔ وہ لوگ کچھ دیر چوک پر کھڑے اودھ اودھ دیکھتے رہے پھر بند روڑ کی طرف چلنے لگے۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک کی ڈھلان پر ڈیرا لگا ہوا تھا۔ عثمان آج دن میں بھی اس طرف آکر بوڑھے خانہ بدوش سے ملا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ وہ لوگ آج رات آجائیں گے اس لئے بوڑھا اپنے افراد خانہ کے ساتھ وہاں سے روانگی کے لئے تیار رہے۔ بوڑھے نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنا متبادل انتظام کر چکا ہے۔ وہ لوگ جیسے ہی آئیں گے وہ اپنے بندوں کو لے کر وہاں سے نکل جائے گا۔

سڑک پر بسوں کی آمدورفت جاری تھی اس لئے وہ زیادہ دیر تک سڑک پر کھڑے رہنے کے بجائے ڈھلان اتر کر ڈیرے کے سامنے آ گئے۔ ایک چھوٹا سا لائینر جل رہی تھی اور باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عثمان نے بوڑھے کا نام لے کر پکارا تو وہ فوراً ہی باہر آ گیا۔

”آگئے تم لوگ۔ ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ بوڑھے نے کہا اور انہیں بھولداری میں لے آیا۔ وہ لوگ جیسے ہی روشنی میں آئے بوڑھا اور اس کے ساتھی انہیں دیکھ کر چونک گئے۔ ان سب کے حلقے بوڑھے کے اپنے افراد خانہ سے ملتے جلتے تھے نرس رضیہ تو واقعی بوڑھی لگ رہی تھی۔ دوسری بڑھیا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا وہ ساتھی کہاں ہے جو مجھ سے ملتا جلتا ہے؟ عثمان نے بوڑھے سے پوچھا۔“

”ہم نے سبزی منڈی کے دوسری طرف ڈیرہ ڈالا ہے۔ میرا دلو ہانوروں کو لے کر شام کو لورہی چلا گیا تھا۔“ بوڑھے نے جواب دیا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”اب ہم پلٹیں۔“

اس کے دوسرے ساتھی بھی باہر آ گئے۔ یہ لوگ چونکہ بلندی پر بیٹھے تھے اس لئے احاطہ پوری طرح ان کی نظروں میں تھا۔ گیٹ کے اندر اور باہر کی طرف ایک ایک بلب جل رہا تھا۔ بین وہ کم واٹ کے بلب تھے اور ان کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیل رہی تھی۔ گیٹ کے پاس تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا البتہ کالج کے برآمدے میں کرسیوں پر دو آدمی نظر آ رہے تھے شاید چالیس واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ روشنی دیئے کی طرح تھی اور اتنی دور سے ان آدمیوں کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

”ہاں۔ تو سمجھو یہ کام شروع ہو گیا۔“ ثمنہ نے جواب دیا۔

وہ رات دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب سونا چاہا تو ڈھنگ سے نیند بھی نہیں آ سکی تھی۔ ہر دو تین منٹ بعد کوئی نہ کوئی مال بردار ٹرک یا بس وہاں سے گزر رہی تھی۔ بسوں کے نور میں سکون کی نیند سونا ممکن نہیں تھا۔

صبح ہر حال وہ جلدی اٹھ گئے تھے دن کی روشنی میں انہوں نے ڈیرے کے اٹلانے کا جائزہ لیا۔ ایک درمیانے سائز کا ڈرم تھا جو پانی کے لئے رکھا ہوا تھا۔ ایک مٹکا اور ایک بالٹی۔ مٹکے میں نور پانی تھا مگر بالٹی خالی تھی۔ دو تین پتلیاں تھیں جو دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھیں۔ ایک کیتلی، چائے کی پتی کے ڈبے اور اسی قسم کی چیزیں تھیں جو چند روپوں میں آ سکتی تھیں۔ ایک طرف اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا جس کے قریب ہی خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

شاہ پری نے ڈرم کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور آنچل سے منہ پونچھ کر چولے میں لکڑیاں لائے گی۔ ثمنہ اور نوکھا وغیرہ نے بھی منہ دھو لیا۔

”اوائے طفیل۔“ نوکھا اپنی قمیص کی اندر والی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہ پیسے لے کر چوک سے جا کر کچھ کھانے کو لے آ۔“ حلوہ پوری لے کر آنا یار۔ کئی دنوں سے دل چاہ رہا تھا۔

”ابھی لاتا ہوں جی۔“ طفیل نے اس کے ہاتھ سے سو کا نوٹ لے لیا اور ڈیرے سے نکل کر

”ایک منٹ۔“ عثمان نے کہا اور ثمنہ کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”تم لوگ دوسری چھو لدار میں جا کر ان عورتوں کے ساتھ کپڑے تبدیل کر لو۔“

ثمنہ وغیرہ ان تینوں عورتوں کو لے کر دوسری چھو لدار میں چلی گئیں۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد واپس آئی تھیں۔ لباس تبدیل کرنے کے علاوہ انہوں نے ان عورتوں کی سفید اور کالے پلاسٹک کی چوڑیاں بھی اتروا کر پہن لی تھیں۔ ان تینوں کی بانہوں میں اب کینٹیوں تک چوڑیاں تھیں جس سے وہ بخار نہیں ہی لگ رہی تھیں۔ عثمان نے جیب سے دو سو روپے نکال کر بوڑھے کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

”لو یہ رکھ لو۔ چوک پر جا کر بچوں کے لئے مٹھائی لے لینا اور تانگے پر بیٹھ جانا۔ اب لوگ جاؤ۔“

بوڑھے نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر والوں کو لے کر ڈیرے سے نکل گیا۔ عثمان انہیں جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ لوگ سڑک پر کٹنی دور نکل گئے تو وہ چھو لدار میں آ گیا۔

”اب کیا پروگرام ہے۔“ اس نے ثمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈنگڈنگی بجائیں گے اور کیا کرنا ہے۔“ ثمنہ کی بجائے نوکھا نے جواب دیا۔

”دو تین دن ہمیں یہاں رہنا پڑے گا۔ اس دوران ہم زیادہ سے زیادہ حاجی کے آدمیوں کی نظروں میں آنے کی کوشش کریں گے اس کے ساتھ ہی ہم کچھ ایسی حرکتیں کریں گے کہ وہ ہمارے طرف متوجہ ہوں اور خود ہی قریب آنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہمیں احاطے میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔“ ثمنہ نے کہا۔

”اور اگر انہیں کوئی شبہ ہو گیا تو؟“ عثمان بولا۔

”تو اس وقت جو صورت حال ہو گی اسی کے مطابق قدم اٹھایا جائے گا۔“ ثمنہ نے جواب دیا۔

”ایک بات میں آپ لوگوں کو ہتانا بھول گیا تھا۔“ طفیل دخل اندازی کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم چوک کی طرف چل پڑا۔“

جب ان بخاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آیا تھا تو مجھے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی تھی کہ یہ لوگ پینے کا پانی اسی احاطے سے لے کر آتے تھے مل احاطے کے پھانک کے اندر طرف ہے۔ پہلے ایک مرتبہ ان کی ایک جوان عورت پانی لینے گئی تھی۔ اسے شاید چھیڑا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑھیا پانی لینے جانے لگی۔

”مگر۔“ ثمنہ مسکرائی۔ ”نکل میں پانی لینے جاؤں گی۔ اس طرح ہمیں موقع مل سکتا ہے۔“

”طفیل اور عثمان۔“ ناشتے کے بعد نوکھا نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ

اٹھ کر چھو لدار سے باہر آؤ اور احاطے کی طرف دیکھنے لگی۔

دو تین گھنٹوں کے لئے ڈیرے سے اوھر اوھر چلے جاؤ۔ اگر سب لوگ یہاں رہے تو ان لوگوں شہ ہو جائے گا۔ راوی کی سیر کر آؤ۔“

”ثینہ“ نوکھانے اب ثینہ کو مخاطب کیا۔ ”مجھے تو سامنے والے احاطے میں صرف تین آدمی نظر آ رہے ہیں۔ تو جا..... وہاں سے پانی کی ایک باٹی لے آ۔ اس طرح کچھ صورت حال اندازہ بھی ہو جائے گا۔“

ثینہ نے احاطے کی طرف دیکھا۔ وہاں تین ہی آدمی تھے جو گیٹ کے اندر کی طرف درخت کے نیچے چائے پی رہے تھے۔ ثینہ نے باٹی اٹھائی اور ڈھلوان سے اترتی ہوئی سروس روڈ پارک کے گیٹ کی طرف چلنے لگی۔ وہ جیسے جیسے قریب پہنچ رہی تھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اسے پہچان لیا گیا تو وہ زندہ واپس نہیں آ سکے گی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ حاجی کے چند قریبی ساتھیوں کے علاوہ اور کوئی اسے نہیں پہچانتا۔ گروہ کے عام آدمی اسے نہیں پہچان سکیں گے۔

وہ گیٹ کے قریب رک گئی اور ہولے سے دستک دی۔ تقریباً ایک منٹ بعد گیٹ کا چھوڑا دروازہ کھل گیا۔ وہ شخص شکل ہی سے بڑا خراٹ لگ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر کلاشکوف رائفل لگی ہوئی تھی۔ ثینہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔

”صاحب جی۔“ ثینہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک باٹی پانی چاہئے جی۔“

”آؤ..... آؤ۔ ایک باٹی کیا دس باٹیاں لے جاؤ۔“ وہ شخص کہتے ہوئے راستے سے ایک طرف ہٹ گیا۔

ثینہ اندر داخل ہو گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ درخت کے نیچے چارپائی پر دو آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے پاس بھی کلاشکوف رائفلیں تھیں۔

”وہ دوسری کہاں ہے۔“ گیٹ کھولنے والے گن مین نے ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ایک دفعہ آئی تھی۔ پھر وہ بڑھیا آئے گی۔“

”پتا نہیں جی وہ کیوں نہیں آئی۔ آج ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لئے مجھے آنا پڑا۔“ ثینہ نے جواب دیا۔

”روزانہ تم آ جایا کرو۔“ وہ شخص بولا۔ ”آؤ۔ پانی بھر لو۔“

قل دائیں طرف والے کمرے کے پچھلی طرف تھا۔ ثینہ نے مڑ کر دیکھا۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے آدمی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس شخص نے نکلا کھول دیا۔ اور ثینہ کے بازو پر چنگی کاٹ لی۔ ثینہ کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکل گئی۔ ”کیوں چھیڑتے ہو جی!“ اس نے گن مین کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوسے۔ اس چھیڑ چھاڑی میں تو زندگی کے مزے ہیں۔“

گن مین نے ایک اور چنگی کاٹی۔ ”یہ دس روپے رکھ لے کوئی چیز لے لینا۔ پکڑ جلدی کر۔ میرا کوئی ساتھی اوھر آ رہا ہے۔“ اس نے دس کانوث زبردستی ثینہ کے ہاتھ میں تھام لیا اور سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اوسے بی بی تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ جب ضرورت ہو آکر پانی لے جایا کرو۔ پانی بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے لئے منع کیا جائے۔“

گن مین کا دوسرا ساتھی چند قدم دور کھڑا معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باٹی بھر گئی تو ثینہ نے نکلا بند کر دیا۔ وہ جیسے ہی باٹی اٹھانے کے لئے جھکی پہلے گن مین نے جھک کر باٹی اٹھائی۔

”چل۔ میں پھانک تک باٹی پہنچا دیتا ہوں“ اور چاہئے ہو تو آکر لے جانا۔“ اس نے گیٹ کے باہر تک باٹی پہنچا دی۔ ثینہ نے باٹی اٹھائی اور ڈیرے کی طرف چلنے لگی۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں دس روپے کا نوٹ دبا ہوا تھا۔ ڈیرے پر پہنچ کر اس نے باٹی مٹکے میں انڈیل دی اور نوکھانے کے سامنے بیٹھ کر مٹھی کھول دی۔

”یہ کیا ہے؟“ نوکھانہ دیکھ کر بولا۔

”چارہ۔“ ثینہ مسکرائی۔ ”وہ کمینہ سمجھتا ہے کہ مجھے دس روپے میں زیر کر لے گا۔ میں بھی دیکھوں گی اسے۔ ایک باٹی اور لے آؤں۔“ وہ باٹی اٹھا کر دوبارہ احاطے کی طرف چل پڑی۔

اس مرتبہ اس شخص نے نہ صرف ثینہ کے دو تین چنگیاں کاٹی تھیں بلکہ چند فٹس جیلے بھی کئے تھے۔ ثینہ اس کی ان حرکتوں پر مسکرا کر رہ گئی تھی۔

اس روز شام سے ذرا پہلے وہ پانی لینے گئی تو اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس وقت وہ آدمی گیٹ پر اکیلا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی کانچ میں تھا اور تیسرا آدمی باہر گیا ہوا تھا۔ صبح جب اس نے ثینہ سے چھیڑ چھاڑی کی تھی تو ثینہ مسکرا دی تھی اور اس نے دس روپے بھی قبول کر لئے تھے جس سے اس شخص کا حوصلہ بڑھا تھا اور اب وہ اسے گیٹ کے ساتھ والے کمرے میں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثینہ نے بڑی مشکل سے اسے ٹالا تھا۔

یہ بات ثینہ کے لئے اطمینان کا باعث تھی کہ وہ پہچانی نہیں گئی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ بخاران کے بھیس میں تھی اور بخاروں کا یہ ڈیرہ کئی دن سے یہاں لگا ہوا تھا اس لئے اس پر کوئی ٹہ نہیں کیا گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ حاجی کے گروہ کے غلطی سے اسے نہیں جانتے تھے۔ اگر اس نے اپنا حلیہ بدلا نہ ہوتا اور اصل شکل میں ہوتی تو بھی وہ لوگ اسے نہ پہچان پاتے۔

”آج رات موقع ملے تو آجانبہ میں انتظار کروں گا۔“ اللہ دتہ نے کہا۔
 اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ اس رات آٹھ بجے دوبارہ ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ وہ
 لوگ چھوڑا دیوں میں بیٹھے رہے۔ نوبت کے قریب بارش میں تیزی آگئی۔
 ”تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ احاطے کے اندر جا رہے ہیں۔“ ٹینہ نے کہا۔
 وہ لوگ اپنی گدڑیاں وغیرہ سمیٹ کر تیار ہو گئے۔ ٹینہ نے بھی ایک گدڑی اٹھا کر ان کے
 آگے آگے چل پڑی۔ بارش خاصی تیز ہو گئی تھی۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر ٹینہ زور زور سے
 دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ اللہ دتہ ہی تھا۔
 ”بارش تیز ہو گئی ہے۔ ہمیں آج رات تھوڑی جگہ دیدو۔“ ٹینہ بولی۔
 ”آؤ..... آؤ۔ اندر آجاؤ۔“ اللہ دتہ فوراً ہی راستے سے ہٹ گیا۔ وہ سب لوگ اندر آ
 گئے۔ اللہ دتہ نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی گیٹ کے ساتھ والے کمرے سے
 نکل کر آئے تھے۔ اللہ دتہ، ٹینہ اور اس کے ساتھیوں کو کانچ کے برآمدے میں لے آیا۔ اس
 دوران وہ سب لوگ بھیگ گئے تھے۔ ان کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔
 اس دوران اللہ دتہ کے دوسرے ساتھی بھی وہاں آ گئے۔ وہ ہوس بھری نظروں سے ان
 دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔
 بارش کی بوچھاڑ ترچھی تھی جس سے برآمدے میں بھی پانی آ رہا تھا۔
 ”اوائے قادر۔“ اللہ دتہ نے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
 ”دروازہ کھول کر اندر پڑا ہوا قالین سمیٹ دے۔ برآمدے میں تو یہ لوگ بھیگتے رہیں گے۔“
 ”اگر کوئی آگیا تو.....“ قادر نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”اتنی تیز بارش میں کون آئے گا۔“ اللہ دتہ نے کہا۔ ”تو دروازہ کھول۔ اگر کوئی آگیا تو میں
 جواب دے دوں گا۔“

قادر نے جب سے چابی نکال کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کر فرش پر بچھا ہوا قالین
 سمیٹنے لگا۔ قالین سمیٹ کر اس نے یوب لائیں جلا دی تھیں۔ اللہ دتہ انہیں اندر لے آیا۔
 ”یہاں گدڑیاں بچھا کر بیٹھ جاؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“ اللہ دتہ نے کہا۔ وہ لوگ برآمدے میں
 جا کر کھڑے ہو گئے اور آپس میں کھسکھس کر رہ گئے۔
 ”ان لوگوں کو تم نے اندر بلا لیا ہے لیکن ان کے ساتھ جو آدمی ہیں ان کا کیا کرو گے؟“ قادر
 نے سرگوشی کی۔
 ”ان کا بھی بندوبست کر لیں گے۔“ اللہ دتہ نے کہا۔ ”ابھی انہیں ذرا نکلنے تو دو۔ آج یہ

بجاریوں والا یہ سارا چکر اس لئے چلایا گیا تھا کہ ٹینہ اور شاہ پری دو وارداتیں کر چکی تھیں اور
 دونوں مرتبہ حاجی کو پتہ چل گیا تھا۔ اور اب یقیناً اس نے اپنے آدمیوں کو تنبیہ کر دی ہو گی کہ
 دونوں عورتوں پر نگاہ رکھی جائے۔ ان خدشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی اس ڈیرے والوں سے
 سووے بازی کی گئی تھی۔

دوپہر تین بجے کے بعد عثمان اور طفیل بھی واپس آ گئے تھے۔ شام کو جب ٹینہ پانی لینے کے
 لئے احاطے میں گئی تھی تو وہ دونوں اس وقت ڈیرے پر موجود تھے۔
 دو تین دن سے آسمان پر گمرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار ہلکی سی پھوار پڑ جاتی۔
 ویسے لگتا تھا کہ یہ بادل برسنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

دوسرے دن ٹینہ پانی لینے کے لئے احاطے میں گئی تو اللہ دتہ ٹائی گن مین نے پھر اس کے
 ساتھ اسی قسم کی حرکات کی تھیں اور ٹینہ ہنس کر ٹال گئی تھی۔ ٹینہ کی پلاننگ دراصل یہی تھی
 کہ اللہ دتہ کے جذبات کو اس قدر بھڑکا دیا جائے کہ جب ٹینہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ احاطے کے
 اندر داخل ہوتا چاہے تو کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے۔

اس روز ٹینہ نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اللہ دتہ پھانک کے باہر آ کر بار بار
 ڈیرے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔
 تین دن گزر گئے۔ اس روز دوپہر کے وقت جب ٹینہ پانی لینے گئی تھی تو ہلکی بارش ہوئی
 تھی۔ اللہ دتہ اور اس کا ایک ساتھی گیٹ کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ تیسرا
 ساتھی کانچ کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹینہ پانی بھرنے کے لئے کمرے کے پچھلی طرف تل
 کے پاس گئی تو اللہ دتہ بھی اس کے پیچھے ہی آگیا تھا۔ حسب معمول اس نے ٹینہ کے ایک دو
 چٹکیاں کاٹیں۔ ذومعنی جملے کہے پھر بولا۔

”اگر بارش تیز ہو گئی تو تم لوگ کیا کرو گے۔ کہاں جاؤ گے تم لوگ۔“

”کیا تم ہمیں یہاں رہنے کی جگہ نہیں دو گے۔“ ٹینہ نے جواب دیا۔ ”اتنا بڑا بنگلہ ہے اور

خالی ہی پڑا رہتا ہے۔“

”اوائے بنگلہ کیا تمہارے لئے میرے دل میں جگہ ہے۔“ اللہ دتہ نے اس کی طرف دیکھتے
 ہوئے کہا۔ ”تم اکیلی جب چاہو یہاں آسکتی ہو۔ آج رات کو آ جاؤ۔ میں تمہیں اندر سے بنگلہ
 دکھاؤں گا۔“

”میرے مرد کو پتا چل گیا نا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔“ ٹینہ نے کہا۔ ”وہ تو پہلے ہی کہتا ہے کہ
 پانی لینے کے لئے اکیلی یہاں کیوں آتی ہوں۔“

ہونے لگی۔

ثینہ اور نوکھا وغیرہ دلچپ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً کمرے میں فائر کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی عین کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ دونوں کی کنکشن میں ٹرانسگر دپ جانے سے گولی چل گئی تھی جو عین کے سینے میں عین دل کے مقام پر پھوست ہو گئی تھی۔

اللہ دے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نوکھا وغیرہ نے اسے فوراً ہی چاروں طرف سے پستولوں کی زد میں لے لیا۔ اللہ دے کو اپنا پستول پھینکا پڑا۔ اور پھر وہ بڑی حیرت سے عین کی لاش کو دیکھنے لگا۔ دھینگا مشتی میں عین کی بجائے دار موچیس اتر گئی تھیں اور وہ ٹھوڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ اللہ دے نے جبکہ کر وہ موچیس کھینچ لیں۔

”تھانیدار عین! اس کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

”اگر تم نے اسے پہچان لیا ہے تو مجھے بھی پہچان لو۔ میں ثینہ ہوں۔“ ثینہ نے کہہ ”ڈرو نہیں۔ ہم تم میں سے کسی کو ماریں گے نہیں۔ تم لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم اپنی جان گنونا نہیں چاہتے تو یہ خانے کا راستہ بنا دو۔ انکار کی صورت میں تمہاری کھوپڑی اڑ جائے گی۔“ ثینہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو حرکت دی۔

اللہ دے کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ لیکن اسے یہ خانے کا راستہ تو جانتا ہی پڑا۔ وہ انہیں ایک کمرے میں لے گیا اور دیوار میں نصب الماری کے پیچھے یہ خانے کا خفیہ راستہ کھول دیا۔

یہ خانے میں ہیروئن کے پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ ثینہ کے اندازے کے مطابق وہ ہیروئن ایک ٹن سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سب مل کر ہیروئن کے پیکٹ پھاڑ پھاڑ کر زمین پر پھینکنے لگے۔ اس کلام میں انہیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔

گزشتہ دو تین دنوں کے دوران ثینہ نے بڑی گہرائی سے احاطے کا مشاہدہ کیا تھا۔ برآمدے کے سامنے لان کے قریب بھی ایک ٹل لگا ہوا تھا اور وہاں لان کو پانی دینے کے لئے تقریباً سو فٹ لمبا ایک پائپ بھی پڑا تھا۔

ثینہ نے پائپ کا ایک سرا نکلے میں پھنسا کر نکلا کھول دیا اور دوسرا سرا لے کر یہ خانے میں آئی۔ پانی کی دھار خاصی موٹی اور تیز تھی۔ وہ ہیروئن کے ڈمپر پر پانی ڈالنے لگی۔

آدھے گھنٹے میں ساری ہیروئن پر پانی پڑ گیا۔ اس نے پائپ ہیروئن کے ڈمپر پر چھوڑ دیا اور وہ لوگ اللہ دے کو لے کر یہ خانے سے باہر آ گئے۔ یہ خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

”آ میرے عاشق۔“ ثینہ اللہ دے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں اپنے پیار کی ڈوری میں اس طرح باندھوں گی کہ بس بندھے رہ جاؤ گے۔“

دونوں لونڈیاں بچ نہیں سکیں گی۔“

اندر نوکھا وغیرہ نے گدڑیاں فرش پر بچھا دی تھیں۔ ان کے پیچھے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے گدڑیاں بھی بھیگ گئی تھیں اس دوران اللہ دے دوبارہ اندر آ گیا۔ وہ نوکھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں دو کمرے کھول دیتا ہوں کپڑوں کا پانی نچو جائے تو اندر جا کر آرام سے بستروں پر لیٹ کر سو جانا۔“

”مہربانی ملتی باپ۔“ نوکھا نے متکبرانہ انداز میں کہا۔

اللہ دے نے دو کمروں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ کچھ دیر بعد نوکھا، عین اور طفیل اس کے ساتھ کمرے میں چلے گئے۔ اللہ دے نے باہر نکلتے ہوئے بڑی پھرتی سے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ عین وغیرہ اندر سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگے۔

”شور مچاتے رہو۔ بارش میں آواز کوئی نہیں سنے لگے۔“ اللہ دے چیخا۔

برآمدے میں کھڑے ہوئے قادر اور اس کا ساتھی بھی ہل کرے میں آ گئے تھے۔ وہ تینوں ثینہ اور شاہ پری کی طرف بڑھنے لگے وہ دونوں خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگیں۔ رضیہ بڑھیا کے بھیس میں تھی۔ اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ نرس رضیہ نے موقع پا کر اپنی گدڑی میں سے پستول نکال کر ہوائی فائر کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ بارش کے شور میں گولی کی آواز اس کا بج سے باہر نہیں نکلی ہو گی۔ اللہ دے وغیرہ بھی فائر کی آواز سن کر چونک گئے تھے۔

”ہاتھ اٹھا لو تم لوگ۔ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولی مار دوں گی۔“ نرس رضیہ غرائی۔

ان تینوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی رائفلیں گیٹ کے ساتھ والے کمرے ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ ثینہ نے دوڑ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ عین وغیرہ باہر آ گئے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

”باندھ دو ان حرامزادوں کو۔“ نوکھا چیخا۔

عین اور طفیل قادر اور اس کے ساتھی کو باندھنے لگے۔ رسیاں ان کی گدڑیوں میں موجود تھیں۔ اللہ دے ہاتھ اٹھائے ایک طرف کھڑا تھا۔ عین قادر کو باندھنے کے بعد جیسے ہی اس طرف بڑھا اللہ دے نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ عین بے خبری میں اس کی زد میں آ گیا۔ وہ نیچے گرا تھا لیکن اس نے فوراً ہی پستول نکال لیا تھا۔ لیکن اس کے بلجود اسے فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اللہ دے نے اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا۔ ان دونوں میں پستول کے لئے کنکشن

نوکھا اللہ دہ کو پستول کی زد پر لئے رہا اور شینہ نے اللہ دہ کو بھی باندھ کر فرش پر ڈال دیا۔
”چلو ہمارا کام ختم ہو گیا۔“ شینہ بولی۔ ”جائی کو اطلاع مل گئی تو اس مرتبہ وہ یقیناً پاگل ہو جائے گا۔“

وہ کچھ دیر انسپٹر عثمان کی لاش کی طرف دیکھتے رہے۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ ان کے ہاتھوں نہیں مرا تھا۔

باہر والے پھانک سے نکلنے سے پہلے نرس رضیہ نے اپنی سفید بالوں والی دگ اتار کر پھینک دی تھی۔
وہ لوگ پھانک سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور موسلا دھار بارش میں راوی کے پل والے چوک کی طرف چلے گئے۔



بارش تیز ہو گئی تھی۔
وہ لوگ پانی میں بھیجئے ہوئے راوی کے پل والے چوک پر پہنچ گئے۔ عام طور پر یہاں سڑک پر لوگوں کا جھوم رہتا تھا۔ شہر سے باہر جانے والی بسیں بھی کھڑی رہتی تھیں۔ لیکن اس وقت کوئی بس نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سڑک کے موڑ پر ایک پٹرول پمپ تھا اور چند دکانیں تھیں جن میں دو تین ہوٹل بھی تھے۔ جو لوگ بارش شروع ہونے سے پہلے بسوں کے انتظار میں سڑک پر کھڑے تھے وہ بارش سے بچنے کے لیے ہوٹلوں، دکانوں کے سائبانوں اور پٹرول پمپ کے لیے چوڑے شیڈ کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھے۔

شینہ اور نوکھا وغیرہ بھی پٹرول پمپ کے شیڈ کے نیچے آ گئے۔ نرس رضیہ بڑھیا کے بہروپ میں تھی۔ اس کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ اس نے سرخ پھولوں والی چھینٹ کا ڈھیلا ڈھالا سا کرتا اور بڑے گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی۔ جبکہ شینہ اور شاہ پری نے سیاہ وائل کی قمیص اور سفید شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ لپٹائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شینہ کی چہرہ بھی پانی میں تر ہو رہی تھی۔ وہ چہرہ اتار کر اسے نچوڑنے لگی تو کچھ دور کھڑا ہوا ایک آدمی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے قریب آگیا۔ شینہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بخارنوں اور خانہ بدوش قسم کی عورتوں کے ساتھ لوگ کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قبیل کی عورتیں گھناؤنا دھندہ بھی کرتی تھیں۔ چند روپوں کے لیے اپنے آپ کو غیر مردوں کے حوالے کر دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتی تھیں لیکن سب ہی عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔ انہی میں بعض عورتیں تو اپنی عزت کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتی ہیں اور شینہ تو ظاہر ہے بخارن نہیں تھی۔ اسے لوگوں کی اس قسم کی حرکتیں برداشت کرنا تھیں اور چہمتے ہوئے جملے سننے تھے۔ لیکن اس وقت وہ اس شخص کی نظریں برداشت نہیں کر سکی تھی۔

”کیا بات ہے رے؟“ وہ اس شخص کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے گھر میں ماں بہن ناہیں ہے کیا؟“

”میں تو اکیلا رہتا ہوں۔ اگر تم چلی چلو تو میرے گھر میں تھوڑی دیر کے لیے رونق ہو جائے

اور مسلسل بڑھاتا رہا۔

بارش کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بلکہ اس میں کچھ اور شدت آگئی تھی۔ ٹینہ وغیرہ کو اندیشہ تھا کہ اگر حاجی کے آدمیوں میں سے کوئی بند روڈ والے اس احاطے میں پہنچ گیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ ان کے دلوں میں طرح طرح کے دوسے آرہے تھے۔ اس اڑے کی چابی کا راز کھل جانے کے بعد حاجی کے آدمی اس طوفانی بارش میں بھی ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔

ٹینہ وغیرہ ایسی جگہ پر کھڑے تھے جہاں سے بند روڈ پر نگاہ رکھی جاسکے۔ بارش تیز ہونے کے باوجود سڑکوں پر تھوڑا بہت ٹریفک جاری تھا۔ لیکن گاڑیوں کی رفتار بہت کم تھی۔ وہ لوگ بند روڈ کی طرف سے آنے والی ہر گاڑی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔

سفید رنگ کی ایک کار کو بند روڈ کی طرف سے آتے دیکھ کر نوکھا چونک سا گیا۔ وہ گہری نظروں سے اس کار کو دیکھتا رہا۔ کار کی رفتار بہت کم تھی۔ اور بالآخر وہ کار پٹرول پمپ سے پہلے ایک ہوٹل کے ساتھ رک گئی۔ اس میں سے دو آدمی اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ چند منٹ بعد بھی وہ ہوٹل سے باہر نہیں نکلے تو نوکھا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر وہ حاجی کے آدمی ہوتے تو ہوٹل میں رکے رہنے کے بجائے اوھر اوھر گھوم کر انہیں تلاش کرتے یا ان کے بارے میں لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اور بالآخر بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ مزید پندرہ بیس منٹ بعد صرف پھوار ہی باقی رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اڑے سے چلنے والی بسیں بھی وہاں رکتا شروع ہو گئیں اور لوگ بھی ہوٹلوں اور دکانوں سے نکل نکل کر سڑک پر آنے لگے۔

”کیا خیال ہے چلا جائے؟“ نوکھا نے ٹینہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”ہاں۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر وہ راز کھل گیا تو ہماری تلاش شروع ہو جائے گی اور ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔“

وہ لوگ اٹھ کر پٹرول پمپ کے شیڈ سے باہر آ گئے۔ نوکھا وغیرہ اب بھی مڑمڑ کر بند روڈ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آسمان سے برسنے والی پھوار بھی اب بالکل بند ہو چکی تھی لیکن آسمان پر تھے ہوئے سیاہ بادلوں کے پرے، گھن گرج اور چمکتی ہوئی بجلی یہ اطلاع دے رہی تھی کہ مزید بارش ہوگی اور بہت خوفناک ہوگی۔

چند منٹ بعد بند روڈ کی طرف سے آنے والی ایک ٹیکسی وہاں رکی۔ ٹیکسی کی چھت پر سلمان لدا ہوا تھا۔ دو عورتیں، ایک آدمی اور دو بچے ٹیکسی سے اترے، انہوں نے جیسے ہی سلمان اتارا

کی۔ جو مانگو گی دوں گا۔“ ”اچھا۔ یہ بات ہے۔“ ٹینہ نے کہتے ہوئے چڑی نچوڑ کر سر پر ڈال لی اور اچانک ہی اس شخص کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔

پٹلخ کی آواز سن کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اس شخص کو غالباً ٹینہ کے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک دم بدحواس سا ہو گیا اور پھر اس نے سنبھلنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

”تیری یہ مجال۔ سستی۔ رنڈی۔“ اس نے طیش میں آکر غراتے ہوئے ٹینہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ٹینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کشتی ہوگی تیری ماں..... رنڈی ہوگی تیری بہن۔“ وہ غرائی۔ ”کیا سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو..... بہت جوانی آگئی ہے تیرے میں۔ میں ابھی تجھے بتاتی ہوں تیرے اندر کتنی مردانگی ہے.....“

ٹینہ نے اس شخص کی کلائی مروڑ دی۔ اس شخص کو یوں لگا جیسے اس کی کلائی آہنی ٹکٹے میں جکڑی گئی ہو۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے اور وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

طفیل قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر اس شخص کو گریبان سے پکڑ لیا۔ نوکھا بھی قریب آگیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس شخص کے دو تین ہاتھ بھی جڑ دیے۔ جسامت اور طے سے وہ کسی خانہ بدوش قبیلے کا سردار ہی لگتا تھا۔ بنجاروں والا لباس، سر پر بندھا ہوا رومال اور گلے میں موٹے موٹے رنگ برنگے موتیوں والی تین چار ملائیں، بڑی بارعب شخصیت تھی اس کی۔

”حیا کر اوئے۔“ وہ اس شخص کو ایک اور ہاتھ جڑتے ہوئے بولا۔ ”تم جیسے بے غیرتوں نے تو شریف لوگوں کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے ہم جیسے بنجاروں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن تم سے زیادہ عزت دار ہیں۔ ہم اپنی عورتوں کی طرف میلی نظروں سے دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال لیتے ہیں۔“

کچھ اور لوگ بھی ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ بعض لوگ تو اس شخص کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور بعض ٹینہ وغیرہ پر ہی جملے کس رہے تھے۔

بات بڑھ رہی تھی لیکن دو تین سنجیدہ اور بردبار قسم کے آدمیوں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ وہ نوجوان جس نے ٹینہ کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی بارش کے رکنے کا انتظار کیے بغیر انہیں دھمکیاں دیتا ہوا موٹر سائیکل پر سوار ہو کر چلا گیا۔ نوکھا ٹینہ وغیرہ کو لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

س آئے تو لوگ انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔ لیکن جب ان ٹینکوں نے آگ اور موت
سالی شروع کی تو..... ”وہ گہرا سانس لیتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

”اب تو وہاں روسی نہیں تمہارے ہی لوگ ایک دوسرے پر موت برسا رہے ہیں۔“ ٹینہ
نے جواب دیا۔ ”میں جانتی ہوں تمہیں اپنے وطن سے محبت ہے۔ وطن کی محبت کبھی دل سے
میں نکلتی۔ لیکن اب تو تم اسی ملک کو اپنا وطن سمجھو۔ یہ ملک بہت خوبصورت ہے۔ خدا نے بڑی
نعمتیں بخشی ہیں ہمیں۔ آجکل تو ہم لوگ حاجی کی وجہ سے ذرا اپ سیٹ ہیں۔ حاجی کا قصہ ختم ہو
جائے تو تم آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔ پھر صحیح معنوں میں یہاں کی زندگی کا لطف اٹھاؤ گی۔ اب
پلو۔ وہ لوگ آگے نکل گئے ہیں۔“ ٹینہ نے نوکھا وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً ”بیس گز
آگے جا چکے تھے۔

شاہ پری نے مڑ کر دیکھا اور پھر ٹینہ کے ساتھ چلنے لگی۔ نوکھا اور طفیل اگلے مینے لاہور میں
لگنے والے میلے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ رضیہ بھی ان کے ساتھ ساتھ چل
رہی تھی۔

وہ سب میڑھیاں اتر کر سڑک پر آگئے۔ میڑھیوں کے عین سامنے سڑک کے کنارے ٹانگہ
اسٹینڈ تھا جہاں تین چار ٹانگے کھڑے تھے۔ بارش کی وجہ سے یہاں اتنا کچڑا ہو چکا تھا کہ پیر اندر
دھنسنے جا رہے تھے۔ اس کچڑ میں گٹر کا پانی اور گھوڑوں کی غلاظت بھی شامل تھی۔ بدبو کے بھکے اٹھ
رہے تھے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے بھی متلی سی آری تھی لیکن میڑھیوں کے قریب ٹانگہ اسٹینڈ
کے بالکل سامنے ریلوے لائن کی دیوار کے ساتھ ایک تندور تھا اور چائے کی دکان تھی۔ تین چار
مزدور قسم کے آدمی وہاں بیٹھے چائے بھی پی رہے تھے اور کھانا بھی کھا رہے تھے۔ شاید انہیں کچڑ
اور بو سے کسی قسم کی گھن نہیں آری تھی۔

”سوہنیا! کتنے جانا ہے۔ آؤ بیٹھو۔ ٹانگہ تیار کھڑا ہے۔“ ایک کوجوان نے آگے بڑھ کر ٹینہ
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس انداز مخاطب پر ٹینہ کھول کر ہی تو رہ گئی۔ آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ یہ معاشرتی
کمزوریاں تھیں۔ اپنے سے کمتر کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بخاراؤں اور خانہ بدوشوں کی تو کوئی
عزت ہی نہیں تھی۔ ان کی عورتوں کو بکاؤ مال سمجھ کر ہر شخص ان پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر
میں تھا۔ ان سے نحس مذاق اور چھیڑ چھاؤ کو تو گویا ہر شخص اپنا حق سمجھتا تھا۔

سامنے کھڑے ہوئے ٹانگے باغبانپورہ کی طرف جانے والے تھے جبکہ ان لوگوں کو گھوڑے شاہ
کی طرف جانا تھا۔ وہ لوگ سڑک پار کر کے سامنے والی گلی کے موڑ پر آگئے۔ سلطان پورہ، تیزاب

نوکھا ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔

”کیوں بھئی۔ ٹینہ چلنا ہے۔“ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

”ڈرائیور نے پہلے نوکھا اور پھر اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ٹینہ وغیرہ کی طرف دیکھا۔

”سب لوگ جاؤ گے؟“ اس نے پوچھا۔

”سارے ہی جائیں گے کسی کو یہاں تو نہیں چھوڑ جانا۔“ نوکھا نے کہا۔

”میٹر سے پانچ روپے زیادہ ہوں گے۔“ ڈرائیور بولا۔

”لے لیتا یار۔“ نوکھا نے جواب دیا۔

شاہ پری اس وقت سب سے آگے کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے پنجرز سیٹ کا دروازہ کھول دیا
شاہ پری کو بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن سفید بالوں والی رضیہ اس سے پہلے ہی آگے بڑھ کر بوے
سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔
نوکھا، طفیل، ٹینہ اور شاہ پری پچھلی سیٹ پر ٹھس کر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر
کراچن اشارت کر دیا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

عام حالات میں وہ بیس پچیس منٹ میں ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتے لیکن ایک ڈیڑھ گھنٹے
بارش سے شہر کی بعض سڑکیں دریائے راوی کا منظر پیش کر رہی تھیں ٹریفک بھی بے ڈھنگا تھا
وجہ سے انہیں ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کے قریب ٹیکسی سے اترتے ہی آسمان سے پھر پھوار برسا شروع ہو گئی۔
اور شاہ پری کو لوگ گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگوں کی نظروں کی پروا کیے بغیر مسافر خا
والے شیڈ میں داخل ہو گئے اور راستہ بناتے ہوئے میڑھیوں پر پہنچ گئے۔

یہ میڑھیاں ریلوے اسٹیشن کے تمام پلیٹ فارموں اور ریلوے یارڈ کے اوپر سے ہوتی
دوسری طرف جی ٹی روڈ تک چلی گئی تھیں۔ یہ پل صرف پیدل آنے جانے والوں کے لیے تھا
سائیکل سوار بھی یہ پل استعمال کرتے تھے۔

وہ لوگ پل پر چلتے رہے۔ شاہ پری ایک جگہ رک گئی اور جنگلے پر جھک کر ٹریوں کو آ
جاتے دیکھنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ ٹینہ نے اس کے قریب رک کر پوچھا۔

”مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔“ شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہاں تم لوگوں

اجتی ترقی کر لی ہے اور ہمارے ملک میں لوگ بسوں اور ٹرکوں کے سوا کسی اور سواری کو
جاننے۔ یا پھر چند سال پہلے ان کی زندگی میں ٹینک داخل ہوئے تھے۔ جب روسی ٹینک افغان

بائیں تو پریشان نہ ہوں۔ لیکن بہر حال، جب تک صورتحال واضح نہیں ہو جاتی ہمیں محتاطی رہنا ہے۔ طفیل!“ وہ اس کی طرف مڑ گئی۔ ”تم گیٹ کے پاس کھڑے رہو۔ ہم کپڑے بدل لیں۔“
 طفیل ہل سے نکل کر گیٹ کی طرف چلا گیا۔ اس نے جیب سے پستول نکل کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کا لباس بھیگا ہوا ہونے کی وجہ سے پستول بھی پانی میں تر ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ بوقت ضرورت یہ پستول چلے گا یا نہیں۔ بہر حال دل کی تسلی کے لیے ہاتھ میں یہ ہتھیار موجود بنائی کٹنی تھا۔

ثینہ اپنے کمرے میں کھس گئی۔ رضیہ اور شہ پری دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ نوکھا کی اپنے کمرے میں کھس گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ثینہ کپڑے بدل کر کمرے سے باہر نکلی تو ہل میں رکھے ہوئے فون کی فٹیج رہی تھی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر آگے بڑھ کر ریسپور اٹھا لیا۔
 ”ہیلو۔“ وہ آواز بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”ہمیں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے ثینہ۔ میں شارق ہوں۔“ ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے شارق کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
 ”ارے۔ کمال عاتب ہو تم۔“ ثینہ جلدی سے بولی۔ ”گھر کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں اور تمہیں نہ پا کر ہم پریشان ہو رہے تھے۔“

”ارے پریشان تو میں ہو گیا تھا۔“ شارق کی آواز سنائی دی۔ ”بارش تیز ہوئی تو مجھے یہ پریشانی ہوئی کہ تم لوگوں کا کیا ہو گا۔ میں تم لوگوں کو لینے کے لیے گھر سے نکلا تھا اور دروازے اس لیے کھلے چھوڑ گیا تھا کہ اگر تم لوگ واپس آ جاؤ تو کوئی پریشانی نہ ہو۔ بہر حال، تم لوگ جو کارنامہ انجام دے کر گئے ہو اس کا مجھے پتہ چل گیا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے پیر صاحب کو بڑے غصے کے عالم میں اپنے آدمیوں کے ساتھ احاطے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”اوہ۔“ ثینہ چونک گئی۔ ”کیا پولیس وہاں پہنچ گئی ہے؟“
 ”ابھی نہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”میں ٹیلی فون پر تفصیل سے بات نہیں کر سکتا ایک لمحے میں پہنچ رہا ہوں۔ اگر سب کچھ بتاؤں گا۔“

”جلدی سے آ جاؤ۔ ہم سب بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ثینہ نے کہا۔ اور دوسری طرف سے لائن منقطع ہو جانے پر ریسپور رکھ دیا اور قریب کھڑے ہوئے نوکھا اور شہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”شارق کا فون تھا۔ کہاں ہے وہ؟“ نوکھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

حاصلہ چوک اور گھوڑے شہ کی طرف تانگے ہمیں سے چلتے تھے۔ اس وقت موڑ پر دو تانگے کھڑے تھے۔ آگے والے تانگے کی اگلی سیٹ پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ نوکھا اور طفیل اس بوڑھے کے ساتھ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئے اور ثینہ وغیرہ پچھلی سیٹ پر۔ کوچوان نے پائیدان پر تنک کر گھوڑے کو ہانک دیا۔

وہ لوگ گھوڑے شہ کے مزار کے سامنے تانگے سے اتر گئے۔ وہاں کچھ اور سواریاں مل گئی تھیں اور تانگے آگے چلا میراں کی طرف چلا گیا تھا۔

اس وقت بارش رک گئی تھی۔ لیکن ان کے لباس پانی میں تر ہو رہے تھے۔ وہ چند منٹ مزار کے سامنے کھڑے رہے۔ قبرستان کے کنارے پر ایک چھوٹا سا مزار تھا جس پر ایک بہت گھنا رخت سلیہ کیے ہوئے تھا۔ بزرگ کی قبر کے گرد تقریباً چار فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ قبر پر اس کے اطراف میں اور چار دیواری پر مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھوڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

سڑک پر دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ باغیچہ کی طرف جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ اور تقریباً پندرہ منٹ بعد کو مٹی میں پہنچ گئے۔
 گیٹ کے ذیلی دروازے کو ایسا کھڑا لگا ہوا تھا جسے باہر سے بھی کھولا جاسکتا تھا۔ نوکھا نے کھڑا کھولا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔

گاڑی اندر موجود نہیں تھی۔ نوکھا نے شارق کو دو تین آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ کو مٹی کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن شارق موجود نہیں تھا۔

”کہاں چلا گیا شارق باؤ۔“ نوکھا بڑبڑایا۔ وہ سب اس وقت مرکزی ہل میں کھڑے تھے۔
 ”ایسا تو نہیں کہ ہمارے بعد پولیس نے یا حاجی کے آدمیوں نے یہاں ریڈ کیا ہو؟“ ثینہ اصرار اور دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہاں ایسے آثار تو نظر نہیں آتے۔“ نوکھا نے کہا۔ ”شارق باؤ ایسا تو نہیں ہے کہ آسانی سے کسی کے قابو میں آ جائے۔“

”تو پھر وہ کہاں گیا؟“ اس مرتبہ شہ پری نے لب کشائی کی تھی۔

”یہ سوچنے کی بات ہے۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہے۔“ ثینہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”دروازے کھلے ہونے کے علاوہ ایسی اور کوئی بات نظر نہیں آتی جس سے کسی قسم کے خطرے کی بو آتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ شارق کسی کام سے کہیں قریب ہی گیا ہو گا اور دروازے اس خیال سے کھلے چھوڑ گیا ہو گا کہ اس کی عدم موجودگی میں ہم واپس

”لو۔ یہ گولی نکل کر چائے پی لو۔ سردی ختم ہو جائے گی۔“

وہ خود نوکھا کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنا کپ اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔
ہائے پینے کے ساتھ ساتھ وہ لوگ صورت حال پر بھی تبصرہ کرتے جا رہے تھے۔

”حاجی کو کیسے اطلاع ملی ہوگی کہ اس کے اڑے پر کوئی کارروائی ہوئی ہے۔“ رضیہ نے چائے
گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”حاجی کو کسی کارروائی کی اطلاع نہیں ملی ہوگی۔“ نوکھانے جواب دیا۔ ”اسے معلوم ہے کہ
پولیس اسے اور اس کے خفیہ اڈوں کو تلاش کر رہی ہے اور پھر باغباپورہ والا اڈہ تباہ کرنے کے بعد
ثبوت نے بھی اسے کوئی دوسرا اڈہ تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ وہ اس دھمکی کو محض گیدڑ بیکی
نہیں سمجھا ہوگا۔ اس نے اپنے ان اڈوں کی حفاظت کے لیے مزید انتظامات کیے ہوں گے۔ ہم نے
بب بند روڈ والے احاطے کی نگرانی شروع کی تھی تو وہاں صرف ایک آدمی تھا اور بعد میں ان کی
تعداد تین ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے حاجی ان حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے آیا ہو اور وہاں کی
مورت حال دیکھ کر بوکھلا گیا ہو۔“

”مجھے افسوس ہے کہ اس کی بوکھلاہٹ نہ دیکھ سکی۔“ ثبوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”تمہیں کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور مل جائے گا۔“ نوکھانے کہا۔ ”ابھی تو ہمیں بہت کچھ
کرتا ہے۔ ایسا موقع ضرور آئے گا کہ ہم سب اس کی بوکھلاہٹ، نہیں بلکہ اسے پاگلوں کی طرح
اپنے سر کے بال نوچتے اور کپڑے پھاڑتے ہوئے دیکھیں گے۔“

”میں تو اس خبیث کو کپڑے پھاڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“ رضیہ بولی۔

”کیوں.....؟“ ثبوت نے اسے گھورا۔ پھر بولی۔ ”اڈہ..... سمجھ گئی.....“

دوسرے بھی شاید رضیہ کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ وہ سب مسکرا دیے۔
گرم گرم چائے پینے اور گولی کھا لینے سے طفیل کی حالت واقعی سنبھل گئی تھی۔ اس کی کچپی
ختم ہو گئی تھی اور اس نے کمرل بھی اتار کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔

چائے ختم کرنے کے بعد بھی ان کی باتیں جاری رہیں اور پھر باہر گاڑی کے رکنے کی آواز سن
کر طفیل جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

وہ شارٹ ہی تھا۔ گاڑی برآمدے کے سامنے کھڑی کر کے وہ اندر آیا تو سب عجیب سی نظروں
سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”تم لوگ چائے پی چکے۔“ شارٹ ثبوت کے قریب صوفے پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”ایک کپ
ہائے مجھے بھی مل جائے تو اس سنسنی خیز خبر کی تفصیل بتاؤں۔“

”وہ ہمیں بارش سے بچانے کے لیے لینے گیا تھا اور اسی لیے دروازے کھلے چھوڑ گیا تھا کہ
اگر اس دوران ہم واپس آجائیں تو ہمیں کوئی پریشانی نہ ہو۔“ ثبوت نے کہا اور چند لمحوں کی
خاموشی کے بعد بولی۔ ”شارٹ کے پاس ہمارے لیے ایک سنسنی خیز خبر ہے۔ حاجی کو اپنے اڑے کی
تباہی کا پتہ چل گیا ہے۔ یہاں آنے کے بعد شارٹ تفصیل بتائے گا۔ وہ ایک گھنٹے میں پہنچ جائے
گا۔“

”یہ تو واقعی بڑی سنسنی خیز خبر ہے۔“ نوکھا بولا۔ ”اب ہمیں بے چینی سے شارٹ کا انتظار
ہے۔ وہ آجائے تو تفصیل معلوم ہو۔“

”رضیہ۔ تم چائے بنا لاؤ۔ اس وقت بڑی شدت سے طلب محسوس ہو رہی ہے اور طفیل سے
کہہ دو وہ اندر آکر کپڑے بدل لے۔ کہیں اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے۔“ ثبوت نے کہا۔ اور ایک
صوفے پر بیٹھ گئی۔

رضیہ اپنے اصل حلقے میں آچکی تھی۔ اس نے کپڑے بھی ڈھنک کے پہن لیے تھے۔ وہ
ثبوت کی طرف دیکھتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ اس دوران طفیل اندر آگیا۔ وہ سردی سے کانپ رہا
تھا۔ اس نے اندر جا کر کپڑے بدلے اور جب باہر آیا تو کمرل اوڑھے ہوئے تھے۔ وہ ایک صوفے
میں دھنس گیا۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

”اوائے طفیل کیا ہوا ہے تمہیں۔“ نوکھا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جوان آدمی ہو۔
اتنی سی ٹھنڈ برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے دیکھو۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی
تھا۔“

”آپ کی ہڈیاں پرانی ہو چکی ہیں استاد جی۔ ان پر گرمی سردی کا اثر نہیں ہوتا۔“ طفیل نے
جواب دیا۔

پرانی ہڈیوں والی بات پر ثبوت مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد رضیہ چائے
کر لے آئی۔ ٹرے میں پانچ کپ رکھے ہوئے تھے۔ گرم گرم چائے سے بھاپ نکل رہی تھی۔
اس نے ٹرے میز پر رکھی تھی اور ایک کپ اٹھا کر سب سے پہلے نوکھا کی طرف بڑھایا۔

”اسے دو پہلے۔ دیکھو سردی سے کانپ رہا ہے۔“ نوکھانے طفیل کی طرف اشارہ کیا۔ ”گرم
گرم چائے پی کر شاید ٹھنڈ کم ہو جائے۔“

”میں ابھی اس کی ٹھنڈ کا بھی بندوبست کرتی ہوں۔“ رضیہ نے کہتے ہوئے کپ طفیل سے
سامنے، کافی ٹیبل پر رکھ دیا اور دوسروں کو چائے دینے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی کچھ دیر بعد
واپس آئی تو اس نے ایک گولی طفیل کی طرف بڑھادی۔

ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔

”اوہ۔ عثمان کے بارے میں تو میں پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔“ شارق نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”چھا ہوا وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا اور ہمیں اس کے خون سے ہاتھ نہیں رکتے پڑے۔ بہر حال، انہوں نے صرف تین آدمیوں کو گاڑی میں ڈالا تھا۔“

”اگر حاجی انسپکٹر عثمان کی لاش کو وہیں چھوڑ گیا ہے تو اس نے یہ بہت بڑی حماقت کی ہے اور اپنے لیے مزید دشواریاں پیدا کر لی ہیں۔“ یہ بات نوکھانے کہی تھی۔

”آجکل اس سے واقعی بے درپے حماقتیں ہو رہی ہیں۔“ شارق بولا۔ ”وہ: ذہن آدمی ہے۔ اپنی ذہانت ہی سے اس نے دنیا بھر میں ہیروئن کی تجارت کا نیٹ ورک قائم کر رکھا ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی ملک اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ لیکن بے درپے جوٹیں کھانے سے اس کے حواس قابو میں نہیں رہے اور وہ ایسی حرکتیں کر رہا ہے جن سے اس کے گرد نہ صرف ہمارا بلکہ قانون کا گھیرا بھی تنگ ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بہر حال، وہ اپنے تین آدمیوں کو بیورو میں ڈال کر لے گیا تھا۔ ایک گمن مین کو اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے بعد میں وہ اپنے آدمی بھیج دے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں انسپکٹر عثمان کی لاش وہاں سے ہٹانے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”کیوں؟“ ثینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم لوگوں کو فون کرنے کے بعد میں نے علاقے کے ایس پی کو بھی اس احاطے کے بارے میں اطلاع دیدی تھی۔ میرا خیال ہے پولیس نے اب تک وہاں دھوا بول دیا ہوگا۔ لیکن تم لوگوں نے وہاں کیا کارروائی کی ہے؟“

”ہم نے کیا کارروائی کرنی تھی۔ سارا کام تو پانی کے اس پائپ نے کیا تھا جسے حاجی نے باہر پھکوا دیا تھا۔“ نوکھانے کہا۔

”کیا مطلب؟“ شارق نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بتاتی ہوں۔“ ثینہ بولی۔ ”ہم نے باغبانپورہ والے اڑے پر ہیروئن کو جلا دیا تھا تو اس کے زہریلے دھوئیں سے وہاں کے لوگ بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ ہیروئن کو آگ لگانا ہماری بہت بڑی غلطی تھی۔ لیکن یہاں ہم نے وہ غلطی نہیں دہرائی۔ الماریوں میں بچے ہوئے ہیروئن کے تمام پیکٹ چھڑ کر فرش پر پھینک دیئے اور تمہ خانے میں پانی چھوڑ دیا۔ ہم لوگ اس وقت تک یہ خانے سے باہر نہیں نکلے تھے جب تک ہمیں یقین نہیں ہو گیا تھا کہ ساری ہیروئن پر پانی پھر گیا ہے۔ اس کے بعد ہم نے پائپ وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ ہیروئن پوری طرح پانی میں حل ہو جائے۔“

رضیہ جلدی سے اٹھ کر بچن میں چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں چائے بنا کر لے آئی۔

”میں جب بند روڈ پر پہنچا تو بارش کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔“ شارق چائے کی چسکیاں لینے ہوئے بتاتے لگا۔ ”اس جگہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا کہ سڑک کی ڈھلان پر وہ چھوہلاریاں خالی تھیں۔ ایک چھوہلاری تو گر چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ تم لوگ وہاں سے کسی محفوظ جگہ پر جا چکے ہو۔ میں گاڑی کو آگے نکال لے گیا۔ یتیم خانے کے موڑ سے میں نے گاڑی واپس موڑی اور دوبارہ اس سڑک پر آنے لگا۔ ابھی میں حاجی والے احاطے سے کچھ دور ہی تھا کہ ڈھلان میں سروس روڈ پر سرخ رنگ کی ایک بیجرو کو احاطے کے سامنے رکتے دیکھا۔ میں بڑی بھرتی سے اپنی گاڑی کو سڑک کے دوسری طرف درختوں میں لے گیا۔ اور گاڑی ایسی جگہ روکی جہاں سے میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے احاطے کو دیکھ سکتا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا چائے کی ایک دو چسکیاں لیں اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بیجرو سے دو تین مرتبہ ہارن دیا گیا۔ لیکن اندر سے جب گیٹ نہیں کھولا گیا تو ایک آدمی نے نیچے اتر کر گیٹ کھول دیا اور گاڑی اندر داخل ہو کر برآمدے کے سامنے رک گئی۔ بیجرو سے تین آدمی اتر کر برآمدے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں اور تیسرا حاجی تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی وہ تھا جس نے بیجرو سے اتر کر باہر کا گیٹ کھولا تھا اور ایک ڈرائیور تھا جو اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا تھا۔

تینوں گاڑی اور حاجی برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اور پھریوں لگا جیسے وہاں کھلبلی سی مچ گئی ہو۔ دو گمن مین باہر آ گئے اور دونوں ہاتھوں میں رائفلیں سنبھالے اوہر اوہر دیکھنے لگے حاجی بھی برآمدے میں آ گیا لیکن فوراً ہی اندر چلا گیا۔ ایک گاڑی بھی اس کے ساتھ اندر گیا تھا جبکہ دوسرا برآمدے ہی میں کھڑا رہا تھا۔

”ویلا میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ حاجی اور اس کے ساتھی بار بار اندر اور باہر آ جا رہے تھے۔ ایک گمن مین نے بہت لمبا سا ایک پائپ اندر سے نکال کر باہر پھینکا تھا اور پھر انہوں نے باری باری تین آدمیوں کو اندر سے نکال کر بیجرو میں ڈالا تھا۔ وہ تینوں شاید بے ہوش تھے یا.....“ وہ خاموش ہو کر سوالیہ نظروں سے باری باری سب کی طرف دیکھنے لگا۔

”وہ تینوں حاجی کے آدمی تھے اور بے ہوش ہی تھے۔“ ثینہ نے کہا۔ ”لیکن کیا تم نے انہیں چوتھے آدمی کو باہر لاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ہے لاش۔“

”لاش!“ شارق نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کس کی لاش؟“

”انسپکٹر عثمان کی۔“ ثینہ نے کہا اور پھر تفصیل بتانے لگی کہ وہ کس طرح حاجی کے آدمی کے

”ہم تو حاجی کے لیے ہیروئن کا شربت بنا کر آئے تھے۔“ نوکھا بولا۔ ”لب پتا نہیں اسے پسند آیا ہو گیا نہیں۔“

”کاش! ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ حاجی کمال کیا ہے۔ میں اسے فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی۔“ ثینہ نے حسرت بھر لہجہ میں کہا۔

”پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس کی جیجو کا تعاقب کر کے اس کا نیا ٹھکانہ معلوم کروں۔ لیکن یہ سوچ کر اس کے پیچھے نہیں گیا کہ اسے کوئی شبہ نہ ہو جائے۔ لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ شام سے پہلے پہلے اس کے نئے ٹھکانے کا پتا چل جائے گا۔“ شارق نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ ثینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شفقت۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہی شخص ہے جس کے گھر میں پچھلے دنوں حاجی عبداللہ پناہ لیے ہوئے تھا اور پھر اس نے حاجی کو وہاں سے چٹا کر دیا تھا۔ ہمیں انکسپرنٹین کی باتیں یاد ہوں گی۔ اس نے بتایا تھا کہ شفقت حاجی سے کچھ بدگمان سا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی جوان بیٹیوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی بات ہوئی ہو جو اسے ناگوار گزری ہو اور اس نے کسی ہمارے حاجی کو اپنے گھر سے چٹا کر دیا۔ شفقت سے حاجی کے نئے ٹھکانے کا پتا چل سکتا ہے۔“

”گڈ۔“ ثینہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ”شفقت جیسے آدمی سے حاجی کا پتا اگلوںات زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ ٹھیک ہے۔ شام کو ہم دونوں اس کے گھر چلیں گے۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا لڑکی!“ نوکھا نے اسے گھورا۔

”میرا دماغ بالکل درست ہے۔“ ثینہ مسکرائی۔ ”حاجی کا پتا معلوم کرنے کے لیے اسے احتیاط میں لینا ضروری ہے۔ اس کی جوان بیٹیوں کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی ہے جس سے وہ خود بخود زبان کھولے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”اور وہ سب ترکیب کیا ہے؟“ نوکھا نے پوچھا۔

ثینہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے فوری طور پر ذہن میں آنے والی وہ ترکیب بتادی اور پھر وہ سب مختلف پہلوؤں سے اس منصوبے کا جائزہ لینے لگے۔



حاجی عبداللہ اس رات دن پورہ میں شفقت کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد گلشن راوی کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ مکان اس کے ایک بہت چھوٹے کارندے رب نواز کی

ملکیت تھا۔ رب نواز بہت چھوٹا سا کارندہ تھا۔ اس جیسے لوگ حاجی عبداللہ جیسے شخص کے قریب آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب حاجی کے ایک معتد خاص کرامت نے اسے بتایا کہ حاجی چند روز کے لیے اس کے گھر میں رہنا چاہتا ہے تو اس کی باپجی کھل گئی تھیں وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی سمجھنے لگا تھا۔

دس بارہ سال پہلے تک گلشن راوی ایک ویرانہ ہوا کرتا تھا۔ پہلے یہاں نوٹاریاں نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے شر سے میلوں دور سمجھا جاتا تھا۔ اس سے آگے زرعی زمینیں تھیں جہاں ہری بھری فصلیں ہوا کرتی تھیں۔ ملتان روڈ کے دوسری طرف سمن آباد کے بعد آبادی بڑھی تو لوگ اس طرف کا رخ کرنے لگے۔ پہلے نوٹاریاں گاؤں کے آس پاس آبادی ہونے لگی اور پھر یہ آبادی پھیلتی چلی گئی۔ زرعی زمینیں غائب ہو گئیں اور ہر طرف بکے مکان بننے لگے۔

رب نواز کا باپ ہائی کورٹ میں ایک وکیل کا منشی تھا۔ اس زمانے میں ان کی رہائش رنگ محل میں تھی۔ اس نے تھوڑی بہت رقم جمع کر رکھی تھی۔ جیسے ہی گلشن راوی میں آبادی شروع ہوئی تو اس نے رنگ محل والا مکان بیچ کر نوٹاریاں کے سامنے گندے نالے کے دوسری طرف پانچ مرلے کا ایک پلاٹ خرید لیا اور اس پر دو کمرے بنوا لیے۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ مکان کی تعمیر مکمل کرتا رہا اور بالآخر دو منزلہ مکان بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے یہ ویران علاقہ سمجھا جاتا تھا لیکن مکان کی تعمیر مکمل ہونے تک، جس میں کئی سال لگے تھے، یہ علاقہ بڑا بارون ہو گیا۔ آس پاس کے تمام علاقے آباد ہو چکے تھے۔ اس مکان سے تقریباً ”ساتھ ستر گز کے فاصلے پر گندے نالے کی پلایا کے ساتھ وگینوں کا اسٹاپ بھی بن گیا تھا جس سے شہر کے اندرونی علاقوں تک آمدورفت میں سہولت ہو گئی تھی۔

رب نواز اپنے ماں باپ کا اگلوٹا بیٹا تھا۔ اس سے پہلے ایک بیٹی تھی جس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگلوٹا ہونے کی وجہ سے رب نواز کو ماں باپ کی تمام تر توجہ حاصل تھی۔ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ باپ کا خیال تھا کہ وہ اسے وکیل بنائے گا لیکن رب نواز وکیل تو کیا وکیل کا منشی بھی نہ بن سکا۔ باپ نے مار پیٹ کر اسے میٹرک تو کرا دیا تھا لیکن اس سے آگے وہ نہ پڑھ سکا۔ اس نے میٹرک بھی تھوڑے ڈویژن کے سب سے نچلے درجے میں کیا تھا۔ باپ نے کوشش تو بہت کی تھی لیکن اسے کالج میں داخلہ نہ دلا سکا۔ رب نواز کو بھی کالج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

باپ نے کوشش کی تھی کہ رب نواز کو کسی وکیل کے پاس منشی ہی رکھوا دے۔ لیکن اس میں اتنی قابلیت نہیں تھی۔ ایک وکیل کے پاس ایک مہینے سے زیادہ نہ ٹک سکا۔ اس نے ایک کیس کے فائل کی فوٹو اسٹیٹ بنا کر مخالف وکیل کو دیدی جس کا پتہ چل گیا اور وکیل کے منشی نے

اسے مار پیٹ کر نکال دیا۔

رب نواز اسی قسم کے کام کرتا رہا۔ باپ نے ذرا سختی شروع کی تو وہ اور بڑ گیلہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ دن بھر گھومتا رہتا اور پھر اس نے راتوں کو بھی باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔

میں باپ اس کے غم میں کھلے جارہے تھے۔ اس کی آوارگی کا صرف ایک ہی علاج ان کی سمجھ میں آیا۔ رب نواز کی شادی کر دی گئی۔ عابدہ ایک بہت غریب گھر کی لڑکی تھی۔ بے حد حسین اور سیدھی سلی سلی لڑکی تھی جس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں باپ کا خیال تھا کہ شادی کے بعد رب نواز سدھر جائے گا۔ سر پر ذمے داریوں کا بوجھ پڑے گا تو کوئی ڈھنک کا کام دھندہ بھی کرنے لگے گا باپ نے اسے بادی باغ لاری لڑے میں اسپتیر پارٹس کی ایک دکان پر رکھوا دیا تھا لیکن دو مہینے بعد چوری کے الزام میں وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔

باپ نے ساری جمع پونجی خرچ کر کے رب نواز کو رکشہ لے دیا۔ رکشہ چلانے میں اس کا کچھ دل لگ گیا۔ اس نے ہیرا منڈی کو اپنا مرکزی اڈا بنا لیا تھا۔ وہ کسی طرف سے بھی گھوم پھر کر ہیرا منڈی پہنچ جاتا۔ یہاں اس کی کچھ ایسے لوگوں سے دوستی ہو گئی جو معاشرے میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔

رب نواز کو رکشہ چلاتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے۔ وہ جو کچھ بھی کماتا ادھر ادھر خرچ کر دیتا۔ اسے جوئے کی بھی علوت پڑ گئی تھی۔ ہیرا منڈی ہی میں دوسرے رکشہ ڈرائیوروں کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیلتا۔ کبھی تو اپنا سب کچھ ہار جاتا اور کبھی کچھ جیت بھی جاتا۔ گھر کے اخراجات اس کا باپ پورے کر رہا تھا اس لیے رب نواز کو گھر کی کوئی فکر نہیں تھی۔

اور پھر ایک روز رب نواز کے میں باپ ٹریفک کے ایک حلوے میں ہلاک ہو گئے۔ سیالکوٹ میں رب نواز کا چچا شدید بیمار تھا۔ اس کے میں باپ اس کی عیادت کے لیے جارہے تھے کہ گوجرانوالہ کے قریب بس حلوے کا شکار ہو گئے۔ اس حلوے میں سولہ افراد جاں بحق ہوئے تھے جن میں رب نواز کے میں باپ بھی شامل تھے۔

رب نواز اب ہر پابندی سے آزاد ہو گیا تھا جب تک میں باپ زندہ تھے اس کی بیوی عابدہ کو کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن اب اسے بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اخراجات کی تنگی اور دیگر مسائل اس کی صحت کو بھی متاثر کرنے لگے۔ وہ جب اخراجات کے لیے رب نواز سے بات کرتی تو وہ لڑنا شروع کر دیتا۔

اس رات رب نواز دو بجے کے قریب گھر واپس آیا تھا۔ عابدہ اس کے انتظار میں جاگ رہی

تھی۔ اس رات اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں تو کھاتی کھل سے۔

”تم صبح جلتے ہو اور آدمی رات کے بعد لوٹتے ہو۔ تمہیں کچھ گھر کا بھی خیال ہے۔“ عابدہ نے رب نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔ گھر کو کیا ہوا ہے؟“ رب نواز نے اسے گھورا۔

”گھر میں راشن نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے آج کچھ کھایا بھی نہیں۔ اگر رکشہ چلانے سے کوئی آمدنی نہیں ہو رہی تو اسے بچ کر کوئی اور کام شروع کیوں نہیں کر دیتے جس سے دولت کی روٹی تو چلے۔“ عابدہ نے کہا۔

”میں صبح سے رات تک تو گھر سے باہر رہتا ہوں۔ کوئی سواری نہیں ملتی تو کیا کروں۔ کیسے خرچ پورا کروں گھر کا۔ تم بھی تو میرا کچھ ساتھ دو۔ دوسری عورتیں اپنے خاوندوں کے لیے کتنا کچھ کرتی ہیں۔“

”میں کیا کروں؟“ عابدہ نے اسے گھورا۔ ”میں پڑھی لکھی تو ہوں نہیں کہ کسی دفتر میں نوکری کر لوں۔ لوگوں کے گھروں میں برتن کپڑے دھونے کا کام کر سکتی ہوں۔ لیکن یہاں سب لوگ ہم جیسے ہی ہیں۔ عورتیں گھروں کا کام خود کرتی ہیں۔ کسی میں نوکر رکھنے کی ہمت نہیں۔ مجھے کون کام دے گا۔“

”تمہیں ایسے کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے میری جان۔“ رب نواز نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ”یہ گورے گورے نازک ہاتھ لوگوں کے برتن کپڑے دھونے کے لیے نہیں ہیں۔ یہ تو لوگوں کی جیبوں سے نوٹ نکالنے کے لیے ہیں۔“

”کیا مطلب۔“ عابدہ نے اسے گھورا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں لوگوں کی جیبیں کاٹنا شروع کر دوں۔“

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ رب نواز بولا۔ ”لوگوں کی جیبوں سے نوٹ نکلوانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ تم اپنے آپ کو دیکھو نا..... کتنی حسین ہو۔ تم جیسی حسین عورتیں تو حسن کا لشکارہ دے کر لوگوں کی جیبیں خالی کروا لیتی ہیں۔ میں رکشہ چلاتا ہوں۔ سارا دن دیکھتا رہتا ہوں۔ عیش کرتی ہیں وہ عورتیں۔“

”کیا تمہاری غیرت مر گئی ہے جو مجھے اس قسم کی باتیں سمجھا رہے ہو۔“ عابدہ ایک جھٹکے سے اس کے قریب سے اٹھ گئی۔ ”تم مجھے بھگا کر نہیں لائے جو مجھ سے اس قسم کے کام کروانا چاہتے ہو۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ عزت ہوں تمہاری۔ شرم آتی چاہیے تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“

”شرم..... غیرت.....“ رب نواز بے غیرتی سے مسکرایا۔ ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں..... فلسفے کرنے اور بھوک سے اڑیاں رگڑنے سے تمہاری عزت نہیں بڑھے گی۔ خدا نے تمہیں حسن کی دولت دی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ خود بھی عیش کرو اور میرے دن بھی آرام سے گزرنے دو۔“

”آئندہ مجھ سے ایسی بات مت کرنا“ عابدہ نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔
رب نواز صبح ہوٹل سے ناشتہ اور کھانا لے آیا۔ ناشتے کے بعد وہ جانے لگا تو عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”میری باتوں پر غور کرنا۔ عیش کرو گی۔“

عابدہ دن بھر پڑی رب نواز کی باتوں پر سوچتی اور کڑھتی رہی۔ اس رات بھی اسے بھوکا رہنا پڑا تھا اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ رب نواز خود تو باہر سے کھا کر آتا اور عائدہ بھوکی پڑی رہتی۔ وہ ہر رات اسے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اس کی بات مان لے تو اسے فاقوں سے نجات مل جائے گی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور پھر ایک رات رب نواز واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا اور پھر اس رات عابدہ کی عزت نیلام ہو گئی۔

صبح جب رب نواز گھر سے نکلا تو عابدہ دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔
”آج رات میں جلدی واپس آجاؤں گا۔ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا۔ کپڑے ذرا ڈھنگ کے پہننا۔“ رب نواز نے گھر سے نکلنے سے پہلے کہا۔

جواب میں عابدہ نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔
اس رات رب نواز گیارہ بجے کے قریب واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ رکشہ مکان کے سامنے روک کر دروازے کی بلبل بجاتا رہا۔ لیکن بہت دیر تک اندر سے دروازہ نہیں کھلا تو رب نواز پریشان ہو گیا۔ وہ دیوار کو دھک دے اندر داخل ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے بتی جلائی تو اس کے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

عابدہ بچکے سے لنگی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں دوپٹے کا پھندا پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور زبان باہر لنگی ہوئی تھی۔ فرش پر ایک کرسی الٹی پڑی تھی اور دوسری کرسی پر ایک کانڈ پڑا ہوا تھا۔ رب نواز نے وہ کانڈ اٹھا کر دیکھا۔ عابدہ پانچ چھ جماعت پڑھی ہوئی تھی۔ آڑھی ترچھی اور شکستہ ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا کہ وہ خودکشی کر رہی ہے۔ اس نے رب نواز پر ایسے الزامات لگائے تھے کہ اگر یہ پرچہ پولیس کے ہاتھ آگیا تو وہ لمبی مدت کے لیے اندر ہو جائے گا۔ اس نے

پرچہ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور کمرے سے باہر آکر باہر والا دروازہ کھول دیا۔ رب نواز کے ساتھ آنے والے شخص کو صورتحال کا پتا چلا تو وہ رفوچکر ہو گیا۔

رب نواز نے پڑوس کا دروازہ کھٹکٹا دیا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں عابدہ کی خودکشی کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی اور لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پولیس بھی آئی۔ وقوعہ کا معائنہ کرنے کے بعد پولیس نے لاش اسپتال بھجوا دی اور لوگوں کے بیانات لیے جانے لگے۔ پولیس کو رب نواز پر اپنی بیوی کو قتل کا شبہ تھا۔ لیکن بعض پڑوسیوں نے بیان دیا کہ رب نواز صبح جب رکشہ لے کر نکلا تھا تو عابدہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے بعد نہ تو رب نواز واپس آیا تھا اور نہ ہی عابدہ کو دیکھا گیا تھا۔

رب نواز نے چھندی یہ کی تھی کہ پولیس کے آنے سے پہلے اس نے عابدہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ ضائع کر دیا تھا۔ اگر وہ پرچہ پولیس کے ہاتھ آجاتا تو رب نواز بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ پولیس رب نواز پر کوئی الزام ثابت نہیں کر سکی تھی۔ لوگوں کے بیانات اور حالات کی روشنی میں پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عابدہ نے غریت سے تنگ آکر خودکشی کی تھی۔

رب نواز پر اگرچہ کوئی الزام ثابت نہیں ہوا تھا لیکن پولیس نے اسے خوب اچھی طرح نچوڑ لیا تھا۔ اس نے اپنا رکشہ بیچ دیا۔ جو بھی پیسہ ملا اس میں سے زیادہ تر پولیس کی نذر ہو گیا۔

رب نواز کے پاس اب کوئی کام دھندہ نہیں تھا۔ اس کا زیادہ وقت ہیرامنڈی کے علاقے میں گزرتا۔ اس کے دوستوں میں گلزار نام کا بھی ایک آدمی تھا جو ہیروئن بیچتا تھا۔ گلزار دراصل حاجی کے گروہ کا آدمی تھا اس نے رب نواز کو بھی اپنے کام میں لگا لیا۔

رب نواز کو گلزار کے ساتھ کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ وہ حاجی کے گروہ میں شامل ہے لیکن اسے آج تک حاجی سے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ملنا تو درکنار اس نے حاجی کو کبھی قریب سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسے چھوٹے لوگوں کو جب اپنے آقا کے قریب آنے کا موقع ملے تو وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں اور خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں۔ اس روز جب گلزار نے اس سے بات کی کہ حاجی عبداللہ چند روز اس کے گھر مہمان بن کر رہنا چاہتا ہے تو رب نواز کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

رب نواز اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں حاجی عبداللہ کا ستارہ گردش میں ہے۔ ایک طرف پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ اور دوسری طرف شارق اور شینہ اسے پے درپے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس نے شارق اور شینہ کو بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اتنا وہ جانتا تھا کہ یہ دونوں پہلے حاجی کے لیے کام کرتے تھے پھر کسی بات پر جھگڑا ہوا اور وہ حاجی کے دشمن بن گئے۔ حاجی کو سب سے

رب نواز حاجی کے قدموں پر گرا جا رہا تھا۔ وہ انہیں کمرے میں لے آیا۔ کمرہ اور اس کا مازوسلان دیکھ کر حاجی کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے کبھی ایسی جگہ پر بھی رہنا پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے اب اس پر برا وقت آگیا تھا اور اس جیسی جگہ پر رہنا مجبوری تھی۔

حاجی کے ساتھ دونوں آدمی اس کے ہڈی گاڑ رہے تھے۔ وہ بظاہر خلی ہاتھ تھے لیکن قیمنوں کے نیچے ریوالور پوشیدہ تھے۔

”معاف کرنا حاجی جی۔“ رب نواز حاجی کے سامنے متوجہ انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے دلا۔ ”میں غریب سا بندہ ہوں جی۔ میں آپ کے گھر جیسا آرام تو نہیں ملے گا۔ پر کوشش کروں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔“

”تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ پر ایک بات کا خیال رکھنا۔ کسی کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں اور میں کیوں ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں جی۔“ رب نواز نے جواب دیا۔ ”اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گا یا لکھتے سے میرے ابا کے رشتہ دار آئے ہوئے ہیں۔ ابا زندہ تھا تو مہمان آتے رہتے تھے۔ کسی نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ کون آیا ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ حاجی نے کہا۔ ”اب تم جا کر برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔“

حاجی عبداللہ دو دن رب نواز کے گھر میں چھپا رہا۔ یہاں اسے کوئی آرام نہیں تھا، البتہ بے آراہی زیادہ تھی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ بان کی چارپائی پر سویا تھا۔ کھانے پینے کی بھی تکلیف تھی۔ رب نواز اپنی حیثیت کے مطابق حاجی کی خدمت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیسہ تو حاجی فرج کر رہا تھا اور رب نواز آگے پیچھے دوڑا پھر رہا تھا۔ ہوٹل سے صبح کا ناشہ اور دوپہر رات کا کھانا۔

حاجی دو دن میں ہی پریشان ہو گیا۔ لیکن وہ رب نواز کی خدمت سے بہت خوش ہوا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہ وفادار کتا ہے جو اپنے مالک کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔

یہاں حاجی کو دوسری تکالیف تو تھیں ہی، سب سے بڑا مسئلہ بیرونی رابطے کا تھا۔ اس مکان میں ٹیلی فون نہیں تھا اور وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ہڈی گاڑ میں سے کسی کو باہر میں بھیجنا چاہتا تھا اور رب نواز میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ باہر جا کر صورتحال معلوم کرے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کن لوگوں سے کیسے رابطہ کرنا ہے۔ حاجی کے دونوں ہڈی گاڑ بھی تنگ آ گئے تھے۔ اس چھوٹے سے مکان میں وہ لوگ ایک طرح سے قید ہو کر رہ گئے

زیادہ نقصان شارق اور ٹینہ ہی نے پہنچایا تھا۔ وہ اس کے کئی اڈے تباہ کر چکے تھے اور حاجی آجکل ان دونوں اور پولیس کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا۔

رب نواز کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ حاجی عبداللہ جیسا آدمی کسی کے خوف سے چھپتا پھر رہا ہے۔ وہ تو بہت بڑا آدمی تھا۔ اسمبلیوں میں اس کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اس کے ہاتھ سے کانپتے تھے۔ حکومت کے وزیر اس کے گھر پر حاضری دیتے تھے۔ لیکن وہ شارق اور ٹینہ سے ڈر رہا تھا۔

اس روز گزار نے جب بات کی تو رب نواز اچھل پڑا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ گزار مذاق کر رہا ہے۔ لیکن گزار بالکل سنجیدہ تھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ۔“ گزار نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”حاجی کی جتنی بھی بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں وہ دوسروں کی نظروں میں ہیں۔ حاجی چند روز ایسی جگہ رہنا چاہتا ہے جس کے بارے میں کسی کو شبہ نہ ہو۔ اس لیے میں نے حاجی کے سامنے تمہارا نام پیش کیا تھا۔ ہم اور تم ایسے لوگ ہیں جن کے بارے میں لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ ہم حاجی کے گروہ کے ہیں لیکن کوئی شبہ نہیں کر سکتا کہ حاجی ہم جیسے لوگوں کے گھر میں بھی آسکتا ہے۔ میں نے تم پر اعتماد کرتے ہوئے حاجی کو تمہارا نام دیا تھا۔ لیکن اگر یہ راز کھل گیا کہ حاجی تمہارے گھر پر ہے تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔“

”تم فکر ہی نہ کرو جی۔“ رب نواز نے کہا۔ ”کسی کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم آج شام کے بعد گھر پر ہی رہنا۔ حاجی عبداللہ رات کو کسی بھی وقت تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔“ گزار نے کہا۔

رب نواز اس روز شام سے پہلے ہی اپنے گھر پہنچ گیا اور جلدی جلدی صفائی کرنے لگا۔ اس کے گھر میں بانس کی دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر میلا کچلا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس نے بستر درست کر کے چادر پلٹ دی اور دوسری چارپائی پر چادر بچھا دی۔ اور جس حد تک ممکن ہو سکا گھر کی صفائی کر ڈالی۔

رات دس بجے کے قریب ایک بیجو اس کے مکان کے سامنے آکر رکی۔ رب نواز برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا پہلے ایک آدمی بیجو سے اتر۔ اس نے اوپر اوپر دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیجو کی طرف اشارہ کیا۔ حاجی اور ایک دوسرا آدمی بیجو سے اتر کر جلدی سے مکان میں داخل ہو گئے اور بیجو آگے چلی گئی۔

تھے۔

تیسرے روز شام کو حاجی نے رب نواز کو اپنے پاس بلا لیا۔

”فاروق احمد کو جانتے ہو؟“ حاجی نے پوچھا۔

”وہ جو گلبہرگ میں رہتا ہے؟“ رب نواز بولا۔

”ہاں۔ وہی۔ مین بلے روڈ پر اس کی کوٹھی ہے۔“ حاجی نے کہا۔

”نام سنا ہے جی۔ ان کی کوٹھی بھی دیکھی ہے۔ پر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ بڑے لوگ ہیں جی۔ ہم تو.....“

”تم ابھی گلبہرگ چلے جاؤ۔“ حاجی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اے میرا نام بتانا اور کہنا کہ

میں بلا رہا ہوں۔ فوراً“ چلا آئے اور اسے میری یہ انگوٹھی دکھا دیا۔ سمجھ جائے گا کہ میں نے ہی

تمہیں بھیجا ہے۔“ حاجی نے اپنی انگلی سے چاندی کی انگوٹھی اتار کر اسے دیدی۔ اس میں عقیق

جڑا ہوا تھا۔ ”یہاں سے ٹیکسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور اسے ساتھ لے کر آنا۔“

”ٹھیک ہے جی۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔“ رب نواز نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پھن لی اور

فورا“ ہی گھر سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد حاجی کے گارڈز نے بیرونی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور وہ تینوں

ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

تقریباً“ دو گھنٹے بعد دروازے کے سامنے ایک گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ جب دروازے

کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ تو ایک محافظ نے اٹھ کر پہلے دروازے کی جھری میں سے جھانکا پھر

دروازہ کھول دیا۔

وہ سفید رنگ کی ہونڈا سوک کار تھی۔ رب نواز کے ساتھ ایک اور آدمی دروازے کے

سامنے کھڑا تھا۔ محافظ نے دروازہ کھول دیا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔ رب نواز کے ساتھ دوسرا آدمی

فاروق احمد تھا۔

حاجی عبداللہ کچھ دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا پھر وہ سب لوگ جانے کے لیے تیار

ہو گئے۔

”تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“ حاجی نے رب نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری

خدمت گزاری سے بہت خوش ہوا ہوں۔ تم سے کچھ اور کام لینا چاہتا ہوں۔ آئندہ تم میرے

ساتھ ہی رہو گے۔“

وہ لوگ مکان سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ رب نواز نے مکان کو تالا لگا دیا تھا۔ حاجی اور

لوہے دیے تھے۔

اس کے پاڑی گاڑ پچھلی سیٹ پر تھے جبکہ رب نواز آگے والی سیٹ پر تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار

ایسی شاندار کار میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر عابدہ اسے دھوکا دے کر خودکشی نہ کر لیتی تو وہ

اس کے لیے سونے کی کلن ثابت ہوتی اور آج اس کے پاس بھی ایسی ہی گاڑی ہوتی۔

وہ مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے ایک گھنٹے بعد گلبہرگ میں فاروق احمد کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔

فاروق احمد نے زیادہ طویل چکر یہ دیکھنے کے لیے لگایا تھا کہ کوئی ان کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔

مین روڈ پر واقع وہ کوٹھی بہت بڑی تھی۔ اس کے پچھلی طرف ایک بہت بڑا گندہ نالہ تھا۔

کوٹھی میں آم اور جامن کے کئی درخت تھے۔ پھولوں کے پودوں سے سجا ہوا خوبصورت لان بھی

تھا۔

فاروق احمد حاجی کا پرانا نمک خوار تھا۔ اور کبھی بکھار اس سے کام بھی لے لیا کرتا تھا۔ وہ

امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا تھا اور کم از کم تین مرتبہ اس نے حاجی کا مال اپنے مال کے ساتھ

اس طرح بیرون ملک بھیجا تھا کہ کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکا تھا۔ بہت عرصہ سے حاجی نے اس

سے کام نہیں لیا تھا اور وہ اسے تقریباً“ بھول ہی گیا تھا۔ رب نواز کے کوٹھری نما مکان میں رہتے

ہوئے حاجی ان لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا جو اس وقت اس کے کام آسکتے تھے اس کے ذہن

میں فاروق احمد کا نام بھی آگیا۔ اور اس نے فوراً“ ہی فاروق احمد کی کوٹھی پر منتقل ہونے کا فیصلہ

کر لیا تھا۔

فاروق کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن گوری چٹی رنگت کے ساتھ صحت بھی قابل

رشتہ تھی۔ وہ اپنی عمر سے کم لگتا تھا۔ اس کی بیوی رعنا اس سے عمر میں اگرچہ آٹھ سال چھوٹی

تھی لیکن وہ بھی جسمانی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے پینتیس چھتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

فاروق احمد کو خدا نے ساری نعمتیں دے رکھی تھیں لیکن وہ اولاد جیسی نعمت سے محروم ہی

رہا۔ شروع شروع میں انہوں نے اپنا علاج بھی کروایا۔ بیروں کے تعویذ بھی گھول گھول کر پئے۔

مزاروں پر حاضریاں بھی دیں مگر مراد بر نہیں آئی۔ اور بالآخر وہ اولاد کے معاملے میں راضی بہ رضا

ہو کر بیٹھ رہے۔

حاجی سے فاروق احمد کی ملاقات کینیڈا کے سفر کے دوران جہاز پر ہوئی تھی اس کے بعد بھی

وہ ملتے رہے تھے۔ اور پھر ایک روز فاروق احمد پر انکشاف ہوا کہ حاجی منشیات کا بہت بڑا بین

لااقوامی اسمگلر ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کس طرح حاجی کے چکر میں آگیا تھا۔ لیکن ماضی میں کم

از کم تین مرتبہ حاجی کا مال اپنے مال کے ساتھ باہر بھجوا چکا تھا۔ اور حاجی نے ہر مرتبہ اسے لاکھوں

لوہے دیے تھے۔

ہے ہمارے پاس ہے۔ اس کی وجہ سے بڑی سوتیں ہیں۔“
 ”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ باہر جا کر کسی کو بتا دے کہ“ حاجی کتے کتے خاموش ہو گیا۔
 بی چہ اس وقت ایک ڈش اٹھائے کچن سے نکل رہ تھا۔

”نہیں حاجی صاحب۔“ فاروق احمد نے پری چہ کے جانے کے بعد کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ
 آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور پھر یہ گھر کی باتیں باہر نہیں کرتا۔“
 ”یہ قوم بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔“ حاجی نے کہا۔
 ”آپ مطمئن رہیں جی۔ اس کی وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔“ فاروق احمد نے جواب
 دیا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ رعنا کچھ دیر ان کے پاس بیٹھنے کے
 بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حاجی اور فاروق اکیلے بیٹھے صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔
 ”حاجی صاحب۔“ فاروق احمد کہہ رہا تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون آدمی ہے جو آپ
 کے خلاف تجبری کر رہا ہے۔“

”پتا چل جائے گا۔“ حاجی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر میں اسے ایسی عبرتاک سزا دوں
 گا کہ دنیا کا کوئی اور شخص اپنے مالک سے غداری کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔“ وہ چند لمحوں کو
 خاموش ہوا پھر بولا۔ ”اچھا بھئی۔ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ نیند آرہی ہے۔ پچھلے دو دن تو
 بی بے آرامی میں گزرے ہیں۔“

”آئیے۔ میں آپ کو کرا دکھا دوں۔“ فاروق احمد اٹھ گیا۔ اسی وقت رعنا بھی آگئی۔ اس نے
 لباس تبدیل کر لیا تھا اور اس وقت وہ شب خوبائی کا ڈھیلا ڈھالا سالیاس پہنے ہوئے تھی۔ وہ حاجی
 کی طرف دیکھ کر مسکرا دی لیکن حاجی نے منہ پھیر لیا۔ وہ دونوں میاں بیوی حاجی کو اس کا کمرہ دکھا
 کر چلے گئے۔

پچھلے دو روز واقعی بے آرامی میں گزرے تھے۔ اس وقت حاجی بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ اور پھر
 اس کی آنکھ صبح ہی کھلی تھی۔

اس روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے جس سے موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ عام خیال یہ
 تھا کہ بارش ہوگی لیکن پورا دن گزر گیا۔ بادل گرجتے رہے۔ لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی آسمان سے
 نہیں برسلا البتہ اس سے اگلے روز صبح ہی سے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی۔ کبھی پھوار پڑنے
 لگی اور کبھی رک جاتی۔

دوپہر کے وقت بارش تیز ہو گئی۔ حاجی اس وقت ڈرائنگ روم میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس

فاروق اچھی طرح جانتا تھا کہ حاجی آجکل زیر عتاب ہے اور پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ
 چھاپے مار رہی ہے لیکن جب رب نواز کے ذریعے حاجی کا پیغام ملا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر
 اسے اپنے ہاں لے آیا تھا۔

حاجی نے فاروق کی کونٹھ میں پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے چائے بنا
 کر پی۔ فاروق کی بیوی رعنا نے پہلے سے حاجی کے استقبال کی تیاری کر لی تھی۔ وہ تھوڑے حشر
 سلامتیوں کے ساتھ خوب بن ٹھن کر حاجی کے سامنے آئی تھی۔ وہ بہت بے تکلفانہ انداز میں
 حاجی سے باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ اٹھ کر کھانے کی میز پر آگئے۔

فاروق نے رعنا کو جب یہ بتایا تھا کہ وہ حاجی عبداللہ کو لینے جا رہا ہے تو رعنا نے اپنی ملازمہ
 سے کہہ کر کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ان کی ملازمہ بھی ایک عجوبہ چیز تھی۔ اس کا شمار
 توصف نازک میں کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی اسے مردوں کی صف میں گننا کیا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ
 اپنے آپ کو عورت ہی کہلاتا تھا۔ نہ صرف کپڑے عورتوں جیسے پہنتا بلکہ عورتوں کی طرح میک
 اپ بھی کرتا۔ موٹی موٹی آنکھیں اور چہرے کے نقوش بڑے غضب کے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ
 پری چہ رکھا ہوا تھا۔ وہ پچھلے بارہ تیرہ سال سے ان کے ہاں کام کر رہا تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ گلڈر
 سے آیا تھا تو اس کی عمر بارہ سال تھی اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ دلچسپ انکشاف ہوا تھا کہ
 اسکا تعلق تیسری جنس سے ہے اور پھر بالکل فطری طور پر اس میں ایسی باتیں آئی گئیں جو اس
 جنس کے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔

فاروق اور رعنا شروع شروع میں پریشان ہوئے تھے لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی باتوں اور
 عادتوں کے عادی ہوتے چلے گئے۔

پری چہ نے گھر کے سارے کام سنبھال رکھے تھے۔ وہ کھانے بھی بہت لذیذ تیار کرتی تھی۔
 وہ چونکہ اپنے آپکو صنف نازک میں شمار کرتا تھا اس لیے فاروق اور اس کی بیوی بھی اس سے
 عورتوں ہی کی طرح بات کرتے تھے۔

اس وقت میز پر کھانا لگاتے ہوئے بھی وہ بڑی معنی خیز حرکتیں کر رہا تھا وہ اگرچہ قاتل اعما
 ملازم تھا مگر اسے حاجی کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ اس سے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ وہ فاروق
 ایک بہت پرانا دوست ہے جو ساہیوال کا ایک بہت بڑا زمیندار ہے۔ اور چند روز پہل رہے گا۔
 ”یہ تم نے کیا تماشہ رکھا ہوا ہے گھر میں فاروق احمد۔“ کھانا کھانے کے دوران حاجی نے
 فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پرانا خدا منگار ہے۔ بڑا محنتی اور قاتل اعما بندہ ہے۔“ فاروق احمد نے جواب دیا۔ ”بچپن سے“

”اتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔ ہمیں راستے میں کون دیکھے گا اور ہاں شفقت کو فون پر بتا دو کہ میں کہاں ہوں۔ ماتریال سے آنے والے لوگ اس سے رابطہ کریں گے۔ شفقت سے کو جیسے ہی وہ لوگ آئیں مجھے اطلاع دے دے۔“

”بہتر ہے جی۔ میں اسے بتا دوں گا۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

حاجی نے فون بند کر دیا اور تقریباً اسی وقت رعنا اندر داخل ہوئی تھی اس نے آج صبح اٹھتے ہی بناؤ سنگھار کر لیا تھا اور حاجی کے ارد گرد پہنڈلاتی پھر رہی تھی۔ بناؤ سنگھار کرنے اور حاجی کے ارد گرد منڈلانے کا مقصد کچھ اور نہیں تھا وہ تو اسے صرف یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایک سال پہلے آخری مرتبہ جب فاروق نے اپنے مال کے ساتھ اس کا مال بھیجا تھا۔ مال منزل پر پہنچنے کی اطلاع پا کر حاجی نے اپنی کوششی میں ان کی دعوت کی تھی اور اس نے رعنا کو ڈائمنڈ کا ایک قیمتی اور خوبصورت سیٹ تحفے میں دیا تھا۔

حاجی ان کے گھر میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ وہ پولیس اور شارک وغیرہ سے چھپتا پھر رہا تھا۔ وہ یقیناً پریشان تھا اور رعنا اسے یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

”حاجی صاحب۔ آج دپہر کا کھانا ذرا دیر سے ملے گا۔ آپ کو بھوک تو نہیں لگ رہی؟“ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ جب کھانا پک جائے گا کھالیں گے۔“ حاجی نے جواب دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر وہ موسم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ رعنا حاجی کی دلجوئی کی کوشش کر رہی تھی اور حاجی کو الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد رعنا وہیں سے اٹھ کر گئی تو حاجی نے اطمینان کا سانس لیا۔

ایک گھنٹہ کے بعد مقصود پہنچ گیا۔ حاجی کے ایک باڈی گارڈ عرفان نے گیٹ کھول دیا اور وہ بیچرو اندر لے آیا تھا۔ رعنا مقصود کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں الجھن کی محسوس کرنے لگی۔

”چلیں حاجی صاحب۔“ مقصود نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔

”ہاں چلو۔“ حاجی عبداللہ صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہیں حاجی صاحب۔ کھانا تیار ہو چکا ہے۔“ رعنا نے کہا۔

”ایک بہت ضروری کام ہے۔ کھانا ہم واپس آکر کھالیں گے۔“ حاجی نے جواب دیا۔ اور باہر آکر پورچ میں کھڑی ہوئی بیچرو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ عرفان اور دوسرا باڈی گارڈ دلدور پچھلی

کے دونوں باڈی گارڈ اور رب نواز باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فاروق صبح ہی سے کسی کام سے گیا ہوا تھا اور رعنا پری چہرہ کے ساتھ کچن میں تھی۔

حاجی کچھ دیر تنہا بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا اور ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کل کسی عورت نے ریسیور کی تھی۔

”حاجی عبداللہ بول رہا ہوں۔ مقصود کو بلاؤ۔“ حاجی نے کہا۔

”ہولڈ کریں جی۔ میں ابھی بلاتی ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر

ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

”مقصود بول رہا ہوں حاجی صاحب۔ آپ کہاں غائب ہیں۔ میں رب نواز کے مکان پر گیا تھا۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ خدا نخواستہ.....“

”حاجی پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے۔“ حاجی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہاں مجھے بے آراہی محسوس ہو رہی تھی۔ ٹیلی فون بھی نہیں تھا کہ کسی سے رابطہ کر سکتا۔ میں فاروق احمد کے ہاں آ گیا ہوں۔ گلبرگ میں۔“

”اوہ..... میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ حاجی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولا۔ ”بند روڈ والے اڈے کی حفاظت کا کیا بندوبست کیا ہے۔ تمہارے آدمی وہاں پہنچے یا نہیں۔“

”دو آدمی تو میں نے اسی دن بھیج دیئے تھے حاجی صاحب۔ لیکن آپ کو اس اڈے کا اچانک کیسے خیال آ گیا۔“

”بس ایسے ہی خیال آ گیا۔ اب وہی اڈا سب سے اہم ہے۔ وہاں کم سے کم ساٹھ کروڑ کا مال موجود ہے۔ ماتریال والی پارٹی کو مال دینا ہے۔ وہ لوگ آجکل میں لاہور پہنچ جائیں گے۔ اس لیے جب تک مال ان کے حوالے نہیں کر دیا جاتا اس اڈے کی حفاظت بہت ضروری ہے۔“ حاجی نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں حاجی صاحب۔ کوئی غیر متعلقہ آدمی ہمارے اس اڈے کے قریب سے گزر بھی نہیں سکتا۔“ مقصود نے کہا۔

”پتا نہیں مجھے کیوں وہم سا ہو گیا ہے۔“ حاجی بولا۔ ”تم ایسا کرد بیچرو لے کر فاروق احمد کی کوٹہ پر آ جاؤ۔ ہم ایک چکر لگا لیتے ہیں۔ میں اس اڈے کے بارے میں پوری طرح اطمینان کر لینا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جی۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ لیکن کیا باہر نکلتا آپ کے لیے خطرناک نہیں ہو گا؟“ مقصود نے کہا۔

اترنے کے بعد ہی رک گیا۔ نہ خانے کا منظر دیکھ کر اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ الماریاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور نہ خانے کے فرش پر تقریباً ایک فٹ پانی جمع تھا اور ہیروئن کے تمام تھیلے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ باہر سے آنے والا ربد کا ایک پاپ سیرھیوں پر پڑا ہوا تھا جس سے پانی کی موٹی دھار بہہ رہی تھی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر حاجی عبداللہ اس طرح چیختے لگا جیسے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔ عرفان اور دلاور اس کی آواز سن کر دوڑے۔ دلاور نے سیرھیوں پر پڑا ہوا پاپ اٹھا لیا اور اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ رب نواز برآمدے میں کھڑا تھا۔

”ہوشیار رہنا۔ کوئی بھی نظر آئے اسے گولیوں سے بھون دو۔“ اس نے چیخ کر کہا اور دوبارہ اندر چلا گیا۔

مقصود بھی گاڑی سے اتر کر اندر آگیا۔ یہاں کی صورت حال دیکھ کر اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ نہ خانے میں کروڑوں روپے کی ہیروئن پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے بڑے اطمینان سے یہ کام کیا تھا۔

حاجی پر واقعی پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ چیختا ہوا نہ خانے سے باہر آگیا۔ اور فرش پر بندھے ہوئے اللہ دتہ کو زور دار ٹھوکر مار دی۔ وہ شاید واقعی بے ہوش تھا کیونکہ زوردار ٹھوکر لگنے کے بعد بھی کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

”ان تینوں نمک حراموں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔ بعد میں نمٹوں گا ان لوگوں سے۔“ حاجی نے چیخ کر کہا۔

عرفان اور دلاور ان تینوں کو باری باری اٹھا کر باہر لے جانے لگے۔ حاجی عبداللہ مقصود کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

”دیکھو۔ دیکھ لیا تم نے۔ اس حرامزادے شارق اور شینہ نے مجھے بالکل تباہ کر دیا ہے۔ کہیں انہیں چھوڑا انہوں نے مجھے۔ اس لیے میں کہتا تھا کہ یہاں دو چار بندے اور بھیج دو۔ لیکن تم کہتے تھے بڑا مضبوط انتظام ہے۔ کوئی اجنبی احاطے کے سامنے سے بھی نہیں گزر سکتا۔ لیکن دیکھ لیا تم نے۔ کیا کیا ہے۔ ان لوگوں نے۔“

”خفاقت کا انتظام تو ٹھیک ہی تھا حاجی صاحب۔“ مقصود دھیمے لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے اور انہوں نے دھوکے سے ہمارے آدمیوں کو قابو کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شارق وغیرہ کو اس ٹھکانے کا پتا کیسے چلا۔“

”یہ۔ یہ حرامزادہ۔“ حاجی نے چیختے ہوئے انسپکٹر عثمان کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے

سیٹ پر ہی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ بیٹھنے سے پہلے انہوں نے سب سے آخر والی سیر کے نیچے سے کلاشنکوف رائفلیں نکال لی تھیں۔ حاجی اکثر اسی جیچو پر آتا جاتا تھا اور اس میں رائفلیں ہر وقت موجود رہتی تھیں تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ رب نواز کو بھی ایک رائفل دیدی گئی تھی اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مقصود نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا اور جیچو کو گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔ پری چہرہ نے گیٹ بند کر دیا۔ رعنا برآمدے میں کھڑی جیچو کو سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر پانی جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اگلوں کا گاڑیاں ہی سڑکوں پر دکھائی دے رہی تھیں۔ جیچو کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ وہ مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی بند روڈ پر آگئی اور پھر سروس روڈ پر اتر گئی۔

جب جیچو احاطے کے پچانک کے سامنے رکی تو بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ مقصود نے دو تین مرتبہ ہارن بجایا لیکن کوئی بھی باہر نہیں آیا۔

رب نواز نیچے اتر گیا۔ اس نے کل بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر گیٹ کا ذیلی دروازہ چند انچ کے قریب کھلا دیکھ کر وہ آگے بڑھ گیا اور اندر داخل ہو کر پچانک پوری طرح کھول دیا۔ جیچو اندر داخل ہو گئی۔

پچانک کا ذیلی دروازہ کھلا دیکھ کر حاجی کا ہاتھ ٹھکا تھا۔ جیچو برآمدے کے سامنے رکی تو وہ عرفان اور دلاور کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ مقصود اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

برآمدے والا دروازہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ عرفان اور دلاور ایک دم چوکس ہو گئے۔ عرفان نے اللہ دتہ اور تھور کو کئی آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ حاجی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اللہ دتہ تھور اور لن کا تیسرا ساتھی رسیوں سے بندھے پڑے تھے۔ وہ تینوں بے ہوش تھے یا ان کی آوازیں سن کر انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایک طرف انسپکٹر عثمان کی لاش دیکھ کر حاجی عبداللہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”لوہ۔ تو یہ ہے وہ حرامزادہ جو ہماری بخبری کرتا رہا ہے۔“ حاجی نے عثمان کی لاش کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ پھر عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ادھر ادھر دیکھو۔ کوئی نہ کوئی یہاں ضرور ہوگا۔“

حاجی ایک کمرے میں آگیا۔ نہ خانے کا راستہ اس کمرے میں تھا۔ راستہ کھلا ہوا دیکھ کر اس کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ تیزی سے سیرھیاں اترنے لگا۔ لیکن تین چار سیرھیاں

ہوش میں لاؤ۔ میں آتا ہوں ابھی۔“

عرفان نہ خانے میں چلا گیا۔ حاجی ڈرائنگ روم میں ٹھکرا رہا۔ اس کے منہ سے بار بار ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی زخمی ناگ پھنکار رہا ہو۔ رعنا اور فاروق احمد ایک طرف کھڑے دیکھ رہے تھے۔ انہیں ابھی تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ رعنا نے آگے بڑھ کر حاجی سے کچھ کہنا چاہا مگر فاروق احمد نے اسے روک دیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

حاجی عبداللہ کمرے میں ٹھکرا اور سانپ کی طرح پھنکارتا رہا۔



ثینہ اور شارق رات کا کھانا کھانے کے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب گھر سے نکلے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شارق بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سفید پینٹ اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس پر سامنے کے رخ پر بائیں طرف پلے بوائے کا سیمبل بنا ہوا تھا۔ ثینہ نے لان کا خوبصورت پرنٹ والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ میپنگ کلر کا دوپٹہ بھی تھا جو مخصوص انداز میں پشت بھر چوڑی پٹی کی طرح باندھ کر کے بائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں نے اپنے چہرے چھپانے کے لیے کسی قسم کا میک اپ نہیں کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ صرف پولیس بلکہ حاجی کے آدمی بھی شکاری کتوں کی طرح انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اور اس کے باوجود انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

گزشتہ روز انہوں نے حاجی کے بند روڈ والے اڈے پر دھوا بول کر کروٹوں روپے کی ہیروئن پانی میں بہا دی تھی۔ اس مہم میں انسپکٹر عثمان مارا گیا تھا۔ انہیں شہر پری کے ذریعے انسپکٹر عثمان کے عزائم کا پتا چل گیا تھا۔ اور شارق نے تو یہی منصوبہ بنایا تھا کہ اس مہم کے دوران عثمان کا بھی کلام تمام کر دیا جائے لیکن یہ اتفاق تھا کہ انہیں عثمان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگتے پڑے تھے اور وہ حاجی کے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

شارق اگرچہ اس مہم میں شریک نہیں تھا۔ لیکن تیزبارش کی وجہ سے ثینہ وغیرہ کے بارے میں معلوم کرنے گھر سے نکلا تھا اور اتفاق سے اس وقت وہاں پہنچا تھا جب حاجی کی بیٹی اس احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ اور اس نے جس انداز میں حاجی اور اس کے آدمیوں کو وہاں سے نکلتے دیکھا تھا اس سے اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ثینہ اور نوکھا وغیرہ اپنا کلام کر گئے تھے۔ گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے ایک جگہ رک کر اس نے علاقے کے ایس پی کو

بہت کچھ معلوم تھا۔ کس طرح میرے آگے پیچھے دم ہلاتا پھرتا تھا کتے کی طرح۔ حاجی جی معاف کر دو۔ دوسروں سے بھی سفارشیں کروا رہا تھا۔ کتنا حرامزادہ نکلا یہ۔ کاش! یہ زندہ میرے ہاتھ میں آتا تو میں اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دیتا۔“

”اس لاش کو بھی گاڑی میں ڈال دیں حاجی جی۔“ عرفان نے ان کے قریب آکر کہا۔

”نہیں۔ اسے یہیں چھوڑ دو۔ اور چلو یہاں سے۔ کوئی بھروسہ نہیں، ان حرامزادوں نے پولیس کو بھی اطلاع دیدی ہو اور پولیس یہاں پہنچنے والی ہو۔“ حاجی نے کہا۔ وہ لوگ باہر آکر بیچرو میں بیٹھ گئے۔ سیٹ کے پچھلی طرف کچھ جگہ تھی۔ اللہ دتہ اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کے نیچے اوپر وہیں بندھے پڑے تھے۔

بیچرو گیٹ سے باہر آکر بائیں طرف مڑ گئی۔ انہوں نے گیٹ بند کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

بیچرو گیٹ سے نکل کر رکے بغیر بائیں طرف سروس روڈ پر مڑ گئی اگر انہوں نے سامنے دیکھا ہوتا تو انہیں بند روڈ پر دوسری طرف کھڑی ہوئی وہ کار نظر آجاتی جس میں حاجی کا دشمن نمبر ایک شارق بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر حاجی اسے دیکھ لیتا تو پاگل کتے کی طرح اس پر چڑھ دوڑتا۔

واپس آنے میں بھی انہیں تقریباً ایک گھنٹہ لگا تھا۔ بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ فاروق اس وقت گھر پر موجود تھا۔ پری چہرہ اور رعنا بھی برآمدے میں کھڑے تھے۔ حاجی کی حالت دیکھ کر انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

”تمہاری کوٹھی میں کوئی ایسا کمرہ ہے جہاں ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی جاسکے۔“ حاجی نے فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے بیچرو میں بندھے ہوئے اللہ دتہ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

”ایسا کمرہ تو کوئی نہیں جہاں سے آواز باہر نہ جاسکے۔ البتہ نہ خانہ ہے جسے ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا۔“ فاروق نے جواب دیا۔ اسے پوچھ گچھ کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”انہیں نہ خانے میں ڈال دو۔ بعد میں پوچھوں گا ان سے۔“ حاجی نے کہا اور جب ان تینوں کو بیچرو سے نکالا گیا تو پری چہرہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”ہاے اللہ۔ انہیں کیوں باندھا ہوا ہے۔ یہ کون ہیں بیچارے۔“

”یہ گاڈز میں میرے گھر سے زیور لے کر بھاگے تھے۔ آج پکڑے گئے ہیں۔“ حاجی نے کہا اور پری چہرہ کو اس طرح گھورا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکا۔ ان تینوں کو نہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

”اوائے عرفان۔“ حاجی ہڈی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نہ خانے میں جا کر انہیں

اپنا نام بتا کر فون کر دیا کہ وہ پولیس پارٹی لے کر حاجی کے بند روڈ والے اڈے پر پہنچ جائے۔ اس نے احاطے کا پتا سمجھا دیا تھا۔

شارق گھر واپس پہنچا تو ٹینہ اور نوکھا وغیرہ اس سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ شارق نے ٹینہ سے پروگرام بتایا تھا کہ وہ شام کو شفقت سے حاجی کے نئے ٹھکانے کا پتا معلوم کریں گے لیکن شام کو پھر تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ جو رات تک جاری رہی۔ وہ لوگ گھر سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ پولیس نے کوئی کارروائی کی تھی یا نہیں۔

صبح ہونے سے پہلے بارش بند ہو گئی تھی۔ اخبار والا اخبار بھی ڈال گیا تھا۔ شارق خود ہی باہر سے اخبار اٹھا کر لایا تھا اور پھر اخبار دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ہیڈلائن وہی تھی جس کی شارق کو توقع تھی۔

وہ برآمدے ہی میں کھڑا اخبار پڑھتا رہا۔ ہیڈلائن کے علاوہ پہلے اور آخری صفحہ پر حاجی کے حوالے سے کئی خبریں تھیں۔ اسپیکر عثمان کی لاش اور احاطے کے کانچ، اس کے تہ خانے اور دوسری جگہوں کی کئی تصویریں تھیں۔ اسپیکر عثمان کا قتل بھی حاجی کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ ایس پی الطاف علی کی ہنگامی پریس کانفرنس کی تفصیل بھی صفحہ اول پر شائع ہوئی تھی۔ ایس پی نے یہ اعتراف کیا تھا کہ حاجی کے اس اڈے کے بارے میں اطلاع ٹیلی فون پر شارق نے دی تھی۔ ایس پی نے اس وثوق کا اظہار بھی کیا تھا کہ حاجی کا یہ اڈا اور دوسرے اڈے تباہ کرنے میں بھی شارق اور ٹینہ کا ہاتھ تھا۔ اس کے بیان سے ڈھکے چھپے الفاظ میں ان دونوں کے لیے ہمدردی کا اظہار جھلکتا تھا۔

شارق اخبار لے کر اندر آگیا۔ نوکھا وغیرہ بھی جاگ گئے تھے۔ شارق ان سب کو خبریں پڑھ کر سنا رہا تھا۔

”حاجی کی حالت قاتل دید ہوگی۔“ ٹینہ نے کہا۔ ”کاش! میں اسے دیکھ سکتی یا کم از کم اس سے فون پر بات کر سکتی۔“

”آج میں معلوم کروں گا کہ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔“ شارق نے کہا۔

اور پھر ناشتے کے بعد شارق اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ اس کا حلیہ ایسا تھا جیسے ابھی ابھی کسی گاؤں سے آیا ہو۔ اجڑ، دیہاتی۔ وہ دن بھر مختلف علاقوں میں گھومتا رہا اور دوپہر کے قریب ہیرامنڈی کے علاقے میں گھزار سے سامنا ہو گیا۔ ظاہر ہے گھزار اسے نہیں پہچانتا تھا۔ شارق نے اسے بتایا کہ وہ چوکی کا رہنے والا ہے۔ وہاں اپنے دوسرے کام کے ساتھ ہیروئن بھی بیچتا ہے۔ لیکن وہ شہر میں جس شخص سے ہیروئن خریدتا تھا وہ دن سے غائب ہے۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“ اس سے لے جاؤ ہیروئن جتنی چاہیے۔“ گھزار نے کہا۔ ”اس وقت تو میں شفقت باؤ کی تلاش میں اس طرف آنکلا تھا۔ اگر آج وہ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ کل یہاں آکر تم سے ہی لے لوں گا۔“ شارق نے جواب دیا۔

”شفقت باؤ۔“ گھزار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو ہیروئن سپلائی نہیں کرتا۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ اس بندے سے مجھے شفقت باؤ ہی نے ملایا تھا۔ اب وہ بندہ نہیں ہے تو پہلے شفقت باؤ سے ہی ملوں گا کہ وہ مجھے کسی صبح بندے سے ملاوے اور میرے ساتھ کوئی دھوکا نہ ہو۔“

”بہت عقلمند ہو۔“ گھزار مسکرا دیا۔ ”مگر شفقت باؤ تو اس علاقے میں کبھی نہیں آیا۔ وہ ہمیں دس دن پورے میں ملے گا۔ امام دین 1 پٹ پر رہتا ہے۔ ابھی چار پانچ دن پہلے ہی میں اس سے مل کر آیا ہوں۔“ وہ چند لمحوں کو خامن ہوا پھر بولا۔ ”تم تو ہمارے اوپر والوں کے دوست نکلے۔ آؤ۔ تمہیں چائے پلاؤں۔“

”چائے تو میں نہیں پیتا۔ لی شیشی۔۔۔۔۔“

”چلو۔ لی پلا دوں گا۔“ گھزار نے کہا۔

وہ دودھ دہی کی ایک دکان پر آگئے۔ ان کا سارا سازوسامان باہر والے تھڑے پر تھا۔ دکان کے اندر گاہکوں کے لیے بیٹھ بچھے ہوئے تھے۔ اس وقت اندر کوئی گاہک نہیں تھا۔ گھزار نے دو گلاس لی کے لیے کہہ دیا اور دونوں اندر آکر بیٹھ گئے۔

”شفقت باؤ کو تم کیسے جانتے ہو؟“ گھزار نے پوچھا۔

”شفقت باؤ اصل میں میرے بڑے بھائی کا دوست ہے۔ وہ کبھی کبھی چوکی میرے بھائی کے پاس آیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے میرے بھائی کا انتقال ہوا ہے شفقت باؤ نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔ میں ہی کبھی کبھی لاہور آجاتا ہوں۔ اس کے ملنے کی کوئی خاص جگہ نہیں ہے لیکن کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔“

”شفقت باؤ بہت اچھا اور بہت شریف آدمی ہے۔“ گھزار نے کہا۔ ”وہ اس لین کا آدمی نہیں ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حاجی کے جال میں کیسے پھنس گیا۔“

”حاجی۔“ شارق کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ”یہ حاجی کون ہے؟“

”کمال ہے۔ تم یہ دھندہ کرتے ہو اور دہی کو نہیں جانتے۔ دہی تو بگ باس ہے۔ لاہور اور اس پاس کے علاقوں کا سارا بزنس اسی کے کنٹرول میں ہے۔ لیکن آجکل اس کا ستارہ گردش میں

ہے۔ تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ سارا اخبار اسی کے نام سے بھرا ہوا ہے۔
”مجھے پڑھنا ہی نہیں آتا۔“ شارق نے جواب دیا۔

اور پھر لکی پیتے ہوئے وہ گزار جیسے گھاگھ آدمی کے منہ سے باتیں اگلاتا رہا۔ اس سے یہ پتا چل گیا کہ دو تین دن پہلے حاجی اس کے ایک کارندے رب نواز کے گھر پر چھا ہوا تھا۔ پھر اچانک ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔ اور رب نواز بھی شاید حاجی کے ساتھ ہی ہے۔
شارق اس شام جب گھر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ وہ صرف حاجی کا ٹھکانہ معلوم نہیں کر سکتا تھا تاہم گزار سے حاجی کے قریب رہنے والے چند اور آدمیوں کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کر لی تھیں۔

”اب شفقت ہی ایسا شخص ہے جس سے حاجی کے نئے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔“ شارق نے شینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گزار سے شفقت کے گھر کا پتا بھی معلوم ہو گیا ہے۔ ہم اسی منصوبے پر عمل کریں گے جو تم نے بنایا تھا۔“
”ٹھیک ہے۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد چلیں گے۔“ شینہ نے کہا۔

اور اب وہ دونوں شفقت کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ دن پورہ مین روڈ پر پہنچ کر انہیں امام دین اسٹریٹ تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گاڑی انہوں نے گلی کے موڑ پر سڑک کے کنارے روک لی اور نیچے اتر کر گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی دس بارہ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں طرف پرانی طرز کے دو منزلہ مکان تھے۔ شارق کو گزار سے صرف گلی کا پتا چلا تھا۔ مکان کا نمبر اور صحیح لوکیشن اس نے جان بوجھ کر دریافت نہیں کی تھی گلی میں چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شارق نے سامنے سے آنے والے ایک اوجڑ عمر آدمی کو روک کر شفقت باؤ کے بارے میں دریافت کیا۔

”وہ دائیں طرف چوٹھا مکان ہے۔ جس کے سامنے بجلی کا کھمبا لگا ہوا ہے۔ وہی دروازہ ہے۔“ اس شخص نے اشارے سے بتایا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گھر گیا ہے۔“
شارق نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے اور اس مکان کے سامنے رک گئے۔ گلی میں اکلوا لوگوں کی آمدورفت تھی۔ شارق کے اشارے پر شینہ نے کل بیل بجا دی۔ صرف ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ شفقت ہی تھا جو ابھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”جی فرمائیے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ اس نے شینہ کی طرف دیکھتے ہی پوچھا۔ ”اگر آپ مشر شفقت ہیں تو ہمیں آپ ہی سے ملنا ہے۔“ شینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کیا آپ

ہیں اندر بیٹھنے کو نہیں کہیں گے۔ ہم تو آپ کے لیے ایک اہم پیغام لے کر بہت دور سے آئے ہیں۔“

شفقت نے ایک بار پھر ابھی ہوئی نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھا پھر انہیں رکنے کا اشارہ کرتا ہوا اندر چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ دو منٹ بعد دائیں طرف بیٹھک کا دروازہ کھلا۔ شینہ اور شارق اندر داخل ہو گئے۔ پہلے شینہ اندر داخل ہوئی تھی پھر شارق۔ شارق نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

”بیٹھے۔“ شفقت نے اشارہ کیا۔ پھر بولا۔ ”آپ لوگ کون ہیں اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جمل تک مجھے یاد پڑتا ہے اس سے پہلے ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“
”شاید آپ بھول رہے ہیں۔“ شارق نے براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری ایک ملاقات ہو چکی ہے۔ لیکن وہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ آپ نے مجھے ذہن میں نہیں رکھا لیکن میں آپ کو نہیں بھولا ہوں۔“

”اگر ایسا ہے تو مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا۔“ شفقت نے کہا۔ ”لیکن کیا آپ بتائیں گے کہ ہماری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟“

”یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”داروغہ والا میں حاجی عبداللہ کی کونٹری میں ہم ملے تھے لیکن آپ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں سے چلے گئے تھے۔ حاجی عبداللہ نے ہمارا تعارف بھی کر لیا تھا۔ آپ میرا چہرہ بھول گئے ہیں لیکن میرا نام اب بھی آپ کے ذہن میں محفوظ ہوگا۔“

حاجی عبداللہ کے نام پر شفقت بری طرح چونک گیا تھا۔ ایک لمحہ کو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا وہ گہری نظروں سے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ نے نہیں پہچانا۔ لیکن نام بتا دوں تو آپ کو یاد آجائے گا۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام شارق ہے۔ حاجی عبداللہ کا سب سے قریبی اور گہرا دوست۔“
شفقت کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جائیے مشر شفقت۔“ شارق نے کہا۔ ”ہم کسی برے ارادے سے یہاں نہیں آئے۔ ہمیں اپنا دوست سمجھئے۔ ہمیں آپ کی ہمدردی یہاں کھینچ لائی ہے۔ اگر ہم بری نیت سے آئے ہوتے تو ہماری آمد کا انداز بھی کچھ اور ہوتا۔“

اس طرح تلاشی لی گئی کہ اندر سے بوگی کے تختے تک اوچر دیئے گئے۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس روز میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ ٹرین تین گھنٹے لیٹ ہو گئی۔ اس دوران مجھ سے بھی بچہ چھ ہوتی رہی۔ لیکن میرے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہو سکی تھی۔

”اس روز میں بچ تو گیا تھا لیکن ریلوے حکام کی نظروں میں مشکوک ہو گیا تھا۔ مجھ پر ہیروئن کی اسنگنگ کا الزام تو ثابت نہیں ہو سکتا تھا لیکن کچھ اور الزامات لگا کر مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ میں نے ہائیکورٹ میں ریلوے حکام کے اس فیصلے کے خلاف اپیل تو کر دی لیکن اپنے کس کی باقاعدہ پیروی نہ کر سکا اور مقدمہ خارج ہو گیا۔“

”اس واقعہ کو ڈیڑھ سال گزر چکا ہے۔ اس دوران حاجی نے مختلف ذرائع سے مجھ سے رابطہ رکھا۔ وہ اپنے آدمیوں کے ہاتھ کبھی کبھی مجھے کچھ رقم بھی بھیج دیتا تھا۔ میں حاجی سے پیچھا چھڑانا ہانا تھا لیکن وہ میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر حاجی سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا۔“

”حاجی کی داروغہ والا کی کوٹھی پر تم سے بہت مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہوا۔ تم سے دوبارہ کبھی ملاقات کا موقع نہیں مل سکا لیکن مجھے پتا چلا رہتا تھا۔ تم نے حاجی کے لیے بہت کچھ کیا۔ تمہارے ساتھ ٹینہ کا نام بھی سننے میں آتا رہا۔ تم دونوں حاجی کے سب سے زیادہ قابل اعتماد اور معتمد ساتھی سمجھے جاتے تھے۔ اس سے حاجی کے کچھ پرانے خدمت گار ناراض بھی ہوئے۔ لیکن اس نے کبھی پروا نہیں کی۔“

”پھر نجانے کیا ہوا کہ حاجی تم دونوں کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ اس نے تم لوگوں کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک سازش کے تحت افغانستان بھیج دیا۔ اس کا خیال تھا کہ تم لوگوں کو افغانستان میں ختم کر دیا جائے گا تو اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا لیکن تم لوگ اس سازش سے بچ گئے۔“

”اس دوران حاجی نے تمہاری ماں اور بہن کو کوٹھی سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اور جب اسے یہ پتا چلا کہ تم ایک زندہ بچ کر افغانستان سے واپس آ گئے ہو تو اس نے اپنے تمام آدمیوں کو حکم دے دیا کہ تم لوگوں کو ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد تمہارے ہاتھوں حاجی کی تباہی کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس سے وہ بری طرح بدحواس ہو رہا ہے۔ کل بھی تم لوگوں نے جو کچھ کیا اس پر تو حاجی کو پاگل ہونا چاہیے۔“

”حاجی اس وقت کہل ہے۔“ ٹینہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ”پہلے وہ میرے گھر

شفقت چند لمحے متوحش نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگے تھیں۔ وہ دھم سے صوفے پر گر گیا۔ اور ٹینہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”اگر تم شارق ہو تو یہ“ اس کی آواز حلق میں ایک گئی۔ ”درست سمجھا۔“ شارق بولا۔ ”یہ ٹینہ ہے۔ لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کو کوئی نقصان پہنچانے نہیں آئے۔ ہماری آپ سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔“

”میرا حاجی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ شفقت اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”جب تم دونوں افغانستان گئے ہوئے تھے تو میں نے حاجی کو بہت سمجھایا تھا کہ تمہاری والدہ اور بہن کو نہ چھیڑا جائے۔ لیکن اس نے میری ایک بات نہیں مانی اور ان دونوں کو ذلیل کرنے کی کوشش سے نکل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ تم دونوں بھی افغانستان میں مارے جا چکے ہو گے۔ اس نے ایک سازش کے تحت تم لوگوں کو افغانستان بھیجا تھا۔“

”ہمیں سب معلوم ہے۔“ ٹینہ بولی۔ ”اور اس کی یہ غلطی ہی اس کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہ کرتا تو“

”میں جانتا ہوں۔“ شفقت بولا۔ ”دھوکا“ فریب اور مکاری اس کی فطرت میں شامل ہے۔ مجھے بھی اس نے دھوکے سے پھانسا تھا۔ میں آج پچھتا رہا ہوں کہ میں نے اس کی بات کیوں مانی تھی۔“

”میں جان چکا ہوں کہ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔“ شارق نے کہا۔ ”آپ کے جاننے والے آپ کے کردار کی تعریفیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ اس کے چکر میں کیسے پھنسے تھے؟“

”میں ریلوے میں گارڈ تھا۔“ شفقت نے بتایا۔ ”ٹرین ڈیوٹی کے سلسلے میں اکثر پشاور آنا جانا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ حاجی یہاں میرے گھر پر آیا اور مجھے پیش کش کی کہ اگر میں اس کا مال لے آیا کروں تو وہ مجھے معقول کمیشن دے گا۔ میں اس وقت لالچ میں آ گیا اور اس کے کام کی حاشی بھری۔ میں مہینے میں صرف ایک مرتبہ اس کا مال لے کر آتا تھا اور مجھے کمیشن کے طور پر تین چار لاکھ روپے مل جاتے تھے۔“

”میں دو سال تک اس کے لیے کام کرتا رہا۔ کسی کو شبہ نہیں ہوا۔ میں پہلے اس مکان کے ایک حصے میں کرائے دار تھا۔ لیکن دو سال میں میرے پاس اتنا پیسہ جمع ہو گیا کہ میں نے یہ مکان خرید لیا اور گلیبرگ میں بھی چار کنال کا ایک پلاٹ خرید لیا۔ لیکن ایک روز جب میں پشاور سے خیبر میل لے کر روانہ ہونے والا تھا، ٹرین پر چھاپہ پڑ گیا۔ پولیس، کسٹمز اور اینٹی نارکوٹکس اسکورڈ نے مشترکہ کارروائی کی تھی۔ کسی نے میرے بارے میں خبری کر دی تھی۔ میرے کمپارٹمنٹ کی

میں تھا۔ باغبانپورے والے اڑے کی تباہی کے بعد ٹینے نے فون پر اس سے بات کی تو وہ یہاں سے چلا گیا۔ بلکہ میں نے اسے خود یہاں سے چلتا کیا تھا۔ ”شفقت چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا ”دراصل میری بیوی کو شبہ ہو گیا تھا۔ میری بھی جوان بیٹیاں ہیں۔ اس روز مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ مجھے حاذق جیسے آدمیوں کو اپنے گھر سے دور ہی رکھنا چاہیے۔“

”اس وقت وہ کہاں ہے۔“ ٹینے نے اپنا سوال دہرایا۔

”گلبرگ میں۔“ شفقت نے جواب دیا۔ ”تین دن پہلے اس کے ایک آدمی مقصود نے بڑے اطلاع دی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ دراصل مائٹریال سے ایک پارٹی مل لینے کے لئے آنے والی ہے، اپنے مقامی ایجنٹ کے ذریعے مجھ سے ہی رابطہ کریں گے۔ اس لئے مجھے حاجی کے ٹھکانے کا پتہ دیا گیا تھا کہ وہ لوگ آجائیں تو میں حاجی کو مطلع کر دوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب حاجی لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرے گا۔ اس کے پاس کچھ بچا ہی نہیں تو وہ مائٹریال والوں کو کیا دے گا۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”حاجی کے بارے میں یہ سب بات میں نے تم لوگوں کو اس لئے بتا دیا ہے کہ مجھے حاجی سے نفرت ہو گئی ہے خاص طور پر اس وقت سے جب اس نے تمہاری ماں اور بہن کو کوٹھی سے ذلیل کر کے نکالا تھا۔ لیکن تم میری ہمدردی میں یہاں آئے ہو۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ مجھ سے کیا ہمدردی ہے۔“

”آپ کے بارے میں ہمیں کئی روز پہلے معلوم ہو گیا تھا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”آپ ایک شریف آدمی ہیں اور دھوکے اور لالچ میں حاجی کے چنگل میں پھنس گئے تھے جس کے نتیجے میں آپ کو اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ لیکن اب صورت حال کچھ مزید سنگین ہو گئی ہے۔“

”مثلاً؟“ شفقت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”حاجی کو شبہ ہے کہ اس کے اندر کا کوئی آدمی اس کے خلاف تجبیری کر رہا ہے۔ ان مشہور افراد کی فہرست میں آپ کا نام بھی ہے۔ ایک دو روز میں وہ آپ سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے والا ہے۔ حاجی کے ساتھیوں میں عرفان نام کا کوئی آدمی ہے۔ اس کے ذمہ یہ کام سونپا ہے کہ جب آپ کو پوچھ گچھ کے لئے بلایا جائے تو وہ آپ کی بیٹی کو اٹھا کر لے جائے۔ اس طرح آپ کچھ بتانے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

شفقت کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ شارق اور ٹینے اس کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرائے تھے۔ یہ ٹینے ہی کا منصوبہ تھا کہ بیٹی کا نام لے کر شفقت کو دہشت زدہ کیا جائے تاکہ اسے جان

نے نفرت ہو جائے اور اس طرح حاجی ایک قاتل اعتماد ساتھی سے محروم ہو جائے۔ شارق آج ارادن اسی لئے پھرتا رہا تھا کہ اسے کچھ ایسی معلومات حاصل ہو جائیں جنہیں شفقت جھوٹ نہ سمجھے۔ عرفان کا نام بھی گھڑا سے ہی معلوم ہوا تھا۔

”اب آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ کسی کو بتائے بغیر چند روز کے لئے بچوں کو لے کر لاہور سے باہر چلے جائیں۔“ شارق نے کہا۔

شفقت چند لمحے گنگ سا بیٹھا رہا پھر غبارے کی طرح پھٹ پڑا۔ حاجی کے خلاف کچھ باتیں تو پہلے ہی بتا چکا تھا لیکن اب وہ کچھ ایسی باتیں بھی بتا رہا تھا جو شارق اور ٹینے کے لئے سنسنی خیز شقائق کی حیثیت رکھتی تھیں۔

”ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ ٹینے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ احتیاطاً بچوں کو لے کر چند روز کے لئے شہر سے باہر چلے جائیے۔“

شفقت اس طرح خاموش بیٹھا تھا جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔ اور پھر ٹینے ہی نے پوچھنے پر اس نے گلبرگ میں فاروق احمد کی کوٹھی کا پتہ اور فون نمبر بھی بتا دیا۔

ٹینے اور شارق، شفقت کے مکان سے نکلے تو ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ دونوں ایک سرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

گھر پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ٹینے جاتے ہی ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گئی۔ ان نے فون کا ریسیور اٹھایا اور شفقت کا دیا ہوا نمبر ملائے لگی۔ تیسری گھنٹی پر کل ریسیور لی گئی اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”ہیلو کون؟“

”حاجی عبداللہ سے بات کرنی ہے۔“ ٹینے نے کہا۔

”یہاں کوئی عبداللہ نہیں رہتا۔ تم کون ہو؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ آواز میں ایسا تاثر ناچیسے وہ عورت حاجی عبداللہ کا نام سن کر چونک گئی ہو۔

”اگر تمہارے ہاں کوئی حاجی عبداللہ نہیں ہے تو میرے بارے میں کیوں جاننا چاہتی ہو کہ میں کون ہوں۔“ ٹینے نے کہا اور ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کسی قدر درشت لہجے میں بولی۔ ”حاجی کو فون پر بلاؤ۔ ایک منٹ کے اندر اندر۔“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا البتہ کھسک پھسکی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

”تم کس سے بات کرنا چاہتی ہو۔ یہاں حاجی عبداللہ نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔“

”تم غالباً فاروق احمد بول رہے ہو۔“ ثینہ درشت لمبے میں بولی۔

”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس وقت تمہاری کون کون موجد ہے۔ اگر تم نے ایک منٹ کے اندر اندر حاجی عبداللہ کو فون پر نہ بلایا تو۔“

”تم کون ہو اور میرا نام کیسے جانتی ہو۔“ دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ دی گئی۔

”صرف نام ہی نہیں میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ اگر تم میرا نام جانتا چاہتے ہو تو عبداللہ کو بتاؤ کہ ثینہ بات کرنا چاہتی ہے۔“ ثینہ نے کہا۔

”ٹٹ۔۔۔ ٹٹ۔۔۔ ٹٹ۔۔۔“

اور پھر یوں لگا جیسے دوسری طرف بات کرنے والے کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا ہو۔ مگر ریسیور گرنے کی آواز ثینہ کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔



کونکھی کے نیچے وہ تہ خانہ بہت گندہ تھا۔ فرش پر گرد کی تہ جی ہوئی تھی۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی کرسیاں اور دوسرے کاٹھ کباز کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کاری دو سینیٹیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے کشن پھٹے ہوئے تھے۔ ان پر بھی گرد کی تہ جی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس تہ خانے کو عرصہ سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

اس وقت تہ خانے میں حاجی عبداللہ کے ساتھ عرفان، دلاور اور رب نواز بھی موجود تھے۔ حاجی کی بند روڈ والی کونکھی کے تینوں محافظ اللہ دتہ، قادر اور غلام رسول فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ ان تینوں کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کی اچھی خاصی خاطر تواضع ہو چکی تھی۔ غلام رسول دونوں ہاتھوں سے اپنی دائیں ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا۔ غالباً پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے۔

حاجی عبداللہ کے ہاتھ میں کرسی کا ایک ٹوٹا ہوا پایا تھا۔ رب نواز کے ہاتھ میں بید کی پتھر کی چھڑی تھی۔ حاجی عبداللہ نے آگے بڑھ کر اللہ دتہ کے پہلے زور دار ٹھوکر ماری پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی سے اس کے بازو پر زور دار ضرب لگائی۔ اللہ دتہ بلبلا اٹھا۔

”تمہاری آواز اس تہ خانے سے باہر نہیں جائے گی۔“ حاجی عبداللہ نے چیخ کر کہا۔ ”تم لوگوں کی زبانیں کھلوانے کے لئے یہ تین بندے کافی ہیں۔ مگر میرے کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی تو تم تینوں کی آنے والی سات سلیس بھی نہیں کر سکیں گی اس لئے میں تمہاری آنے والی سلیس ہی ختم کر دوں گا۔ میں خود تم لوگوں سے پوچھوں گا کہ وہ لوگ وہاں کیسے پہنچے تھے۔ بتاؤ۔ جلدی بتا شارق اور اس کے ساتھی وہاں

کیسے پہنچے تھے اور انہیں تہ خانے کا راستہ کس نے بتایا تھا۔ جلدی بولو۔“

”یہ تہ خانے کا راستہ ہم نے نہیں بتایا حاجی جی۔“ اللہ دتہ گھکھایا۔ ”ہم تو یہ بھی نہیں مانتے تھے کہ وہ کون لوگ تھے۔ وہ چھ سات آدمی تھے حاجی جی۔ تیز بارش میں وہ اچانک ہی دیوار کوڑ کر اندر آگئے تھے۔ انہوں نے ہمیں رانٹلوں کی زد میں لے لیا تھا۔ اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔“

”کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔“ حاجی نے لکڑی سے اسے ایک اور زور دار ضرب لگائی۔ ”تمہارے پاس بھی بندوقیں تھیں۔ تم لوگوں نے فائر کیوں نہیں کھول دیا۔ انہیں مار کیوں نہیں دیا اور خود کیوں نہیں مر گئے بے غیرت۔“ اس نے دو چار ضربیں لگائیں پھر بولا۔ ”بات وہ نہیں جو تم مجھے بتا رہے ہو۔ میں سچ سنتا چاہتا ہوں۔ بتاؤ وہ لوگ اندر کیسے آئے تھے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں حاجی جی۔“ اللہ دتہ تکلیف ضبط کرتے ہوئے کہا۔ حاجی نے اس پر ٹوکروں کی بارش کر دی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی سے بھی ضربیں لگا رہا تھا۔ اللہ دتہ فرش پر لٹے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا۔ حاجی عبداللہ رک گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس نے رب نواز کو اشارہ کیا۔

رب نواز نے بید کی پتھر کی چھڑی سے اللہ دتہ پر بارش کر دی۔ اللہ دتہ کی قیص پھٹ گئی۔ جسم پر جہاں بھی چھڑی پڑتی کھال اڑھڑ جاتی۔ دلاور اور عرفان بھی آگے بڑھ آئے اور وہ بھی اللہ دتہ پر ڈنڈوں کی بارش کرنے لگے۔ اللہ دتہ کا سر پھٹ گیا تھا جس سے خون بننے لگا تھا۔ قادر اور غلام رسول کے چہرے خوف سے دھواں ہو رہے تھے۔ اللہ دتہ کو پٹنے دیکھ کر ان کے دل کانپ رہے تھے۔

اللہ دتہ خاصا سخت جان ثابت ہوا تھا لیکن پھر بھی زیادہ دیر تک وہ اس تشدد کا مقابلہ نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ سر کے علاوہ جسم کے دو تین دوسرے حصوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

”تمہارا کیا ارادہ ہے اوئے۔“ حاجی عبداللہ قادر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مم۔۔۔ میں بتاتا ہوں حاجی جی۔“ قادر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”شبابش۔“ حاجی عبداللہ اسے ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ”عقل مند لگتے ہو۔ مگر میں سچ جانتا ہوں۔ اگر ایک لفظ بھی جھوٹ ثابت ہوا تو تمہاری بوٹیاں کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

”میں بالکل سچ بتاؤں گا حاجی جی۔ قادر نے بدستور ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ وہ چند لمبے خاموش باہر بھرتائے لگا کہ کس طرح وہ بخارے بارش سے بچنے کے لئے احاطے کے اندر آئے تھے۔“ وہ غار میں بڑی خوبصورت تھیں جی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ان میں سے ایک بخارن پانی لینے کے لئے آیا

بات دیکھ کر وہ کچھ اور بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ”آپ کے لئے فون آیا ہے۔“ اس نے رک رک کر کہا۔

”شفقت کا فون ہو گا۔ شاید مائٹریال والے آگئے ہوں گے۔ تم چلو میں ابھی اوپر آتا ہوں۔“

”نہیں حاجی جی۔ شفقت کا فون نہیں ہے۔“ فاروق نے کہا۔ اس کی آواز بدستور کپکپا رہی تھی۔

”تو پھر کس کا فون ہے۔“ حاجی نے اسے گھورا۔

”وہ۔۔۔ وہ اپنا نام۔۔۔ ثنینہ بتاتی ہے۔“ فاروق نے رک رک کر کہا۔

”کیا جانتے ہو۔۔۔“ حاجی دھاڑا۔ ”اسے کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں۔“

”ہپ۔۔۔ پتا نہیں جی۔“ فاروق بولا۔ ”آپ چل کر بات کر لیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ باہر ہے آپ یہاں ہیں۔ اگر ایک منٹ کے اندر آپ کو فون پر نہ بلایا گیا تو ہمیں کہیں اور چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔“

”چلو۔۔۔ میں بات کرتا ہوں اس حرامزادی سے۔“ حاجی نے کہا اور پھر عرفان اور رب نواز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم ذرا انہیں بتاؤ تاکہ حکم عدولی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ میں اس حرامزادی سے بات کر کے آتا ہوں۔“

حاجی فاروق کے ساتھ اوپر آگیا۔ ڈرائنگ روم میں رعنا بھی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی اڑ رہی تھیں۔ ٹیلی فون کا ریسیور ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ حاجی نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اور کتے کی طرح غراتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا حرامزادی۔ تم ایک بار میرے ہاتھ لگ جاؤ تو۔“

”ایسا موقع بھی جلد آنے والا ہے حاجی۔“ دوسری طرف سے ثنینہ کی پرسکون آواز سنائی دی۔ اس نے حاجی کی بات کاٹ دی تھی۔ ”ہماری اور تمہاری ملاقات ضرور ہو گی۔ لیکن ابھی نوڈا انتظار کرو۔ میرا خیال تھا کہ تم ہیروئن کے تلاب میں غوطے لگا کر پاگل ہو چکے ہو گے لیکن معلوم ہوتا ہے ابھی تمہارے پاگل ہونے میں کچھ کسر رہ گئی ہے۔ اور ہم چند روز میں یہ کسر بھی پوری کر دیں گے۔“

”تمہاری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو گی۔“ حاجی غرایا۔ ”میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ تم مجھے ہلے نقصان پہنچا سکتی ہو لیکن میرے قریب نہیں آ سکتیں۔“

”یہ تو پتا چل گیا ہے کہ تم واقعی آہنی اعصاب کے مالک ہو لیکن میں نے بھی عہد کر لیا ہے

کرتی تھی، اور یہ اللہ دے اس سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتا تھا۔ جب بارش تیز ہوئی تو اللہ دے نے ام بخارن اور اس کے سارے ساتھیوں کو اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ میں نے اس کی مخالفت کی تھی اور پھر یہ کہا تھا کہ اگر انہیں اندر آنے دیا ہے تو انہیں برآمدے ہی میں بٹھا دیا جائے۔ مگر اس پر تو ہوس سوار تھی۔ اس نے نہ صرف کانچ کا دروازہ کھول دیا بلکہ ان کے بندوں کے کمروں کے دروازے بھی کھول دیے تھے آپ غلام رسول سے پوچھ لیں جی۔“ وہ چند لمحوں کا خاموش ہوا اور پھر بولا۔ ”ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ ہم انہیں بخارے ہی سمجھتے تھے جو کئی روز سے احاطے کے سامنے بند روڈ کی ڈھلان پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ اندر آ کر انہوں نے اچانک ہی پستول نکال لئے تھے۔ اور ان میں سے ایک لڑکی نے بتایا کہ وہ ثنینہ ہے ایک آدمی کے چہرے سے نقلی مونچھ اتر گئی تھی اور اللہ دے نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ تھانیدار عثمان تھا۔ اللہ دے نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی تھی مگر پستول چل گیا اور تھانیدار عثمان مریا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں رسیوں میں باندھ دیا تھا۔“

”شارق بھی تھا؟“ حاجی نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ ان کے ساتھ شارق نہیں تھا۔“ قادر نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ خانے کا راستہ کس نے بتایا تھا؟“ حاجی نے دوسرا سوال کیا۔

”اللہ دے نے جی۔“ قادر نے جواب دیا۔

”میری طرف سے تم سب کو حکم مل چکا تھا کہ کسی اجنبی کو قریب بھی نہ پھنکنے دیا جائے اور یہ تو خاص طور پر کہا گیا تھا کہ خوبصورت عورتوں پر نگاہ رکھی جائے۔ تم لوگوں نے میرا نہیں مانا۔“ حاجی نے کہا۔

”غلطی ہو گئی جی۔“ قادر کہتے ہوئے اس کے پیروں پر گر گیا۔ ”اس مرتبہ معاف کر دیں جی

آئندہ۔۔۔“

”تم لوگ آئندہ کوئی غلطی کرنے کے لئے زندہ نہیں رہو گے۔“ حاجی نے کہا اور قادر

ٹھوکریں برسانے لگا۔

اسی وقت یہ خانے کا سیڑھیوں والا دروازہ کھلا اور فاروق احمد اندر داخل ہوا۔ اس کا

دھواں ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے فاروق احمد۔ تم کیوں بدحواس ہو رہے ہو۔“ حاجی نے اسے گھورا۔ ”کوئی

پولیس نے دھواں بول دیا ہے کیا؟“

”نہیں حاجی جی۔“ فاروق احمد کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔ اللہ دے اور اس کے ساتھیوں کو

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”چوروں کی طرح معمولی سا نقصان پہنچا کر سمجھ رہا ہے کہ اس نے بہت بڑا تیر مارا ہے۔ یہ معمولی سا نقصان تو میرے ہاتھوں کا میل ہے۔ لیکن یہ لونڈا ایک نہ ایک دن میرے ہاتھ ضرور آئے گا اور پھر اس حرامزادے سے پوچھوں گا۔“

”لونڈا!“ رعنا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”لیکن وہ تو ٹہینہ تھی۔“

”ہاں۔ پہلے اس حرامزادی نے بات کی تھی۔“ حاجی بولا۔ ”اس کا یار بھی اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا مگر۔۔۔ تم لوگ کیوں خوفزدہ ہو؟“

”انہیں پتا چل گیا ہے کہ آپ یہاں ہیں۔ اگر انہوں نے۔۔۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔“ حاجی نے فاردق کی بات کٹ دی۔ ”میرے ہوتے ہوئے تم لوگوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دونوں بہت خبیث ہیں کبھی قریب آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

”لیکن اگر انہوں نے پولیس کو اطلاع کردی تو۔“ رعنا خوفزدہ سے لہجے میں بولی۔

”وہ ایسا نہیں کریں گے۔“ حاجی نے جواب دیا۔ ”میں شارق اور ٹہینہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ ہماری آپس کی جنگ ہے اور وہ اس جنگ میں کسی اور کو نہیں لائیں گے۔ وہ دونوں میرے دشمن نمبر ایک ضرور ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اصول پرست ہیں۔ بہر حال، تم لوگ اطمینان رکھو۔ یہاں پولیس نہیں آئے گی۔“

حاجی ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر نہ خانے میں آگیا۔ اللہ دے اب بھی بے ہوش پڑا تھا اور عرفان وغیرہ قادر اور غلام رسول کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ نہ خانے میں ان کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ حاجی کو یہ اطمینان تھا کہ ان کی چیخیں اس کو بھی سنی جائیں گی۔ وہ کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں کھڑا تھا تو اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ یہاں کوٹھیاں اتنی بڑی اور ایک دوسرے سے اتنی دور تھیں کہ دوسری کو بھی آواز جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”انہیں اب زندہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ختم کر دو انہیں۔“ حاجی نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور ان لاشوں کا کیا کریں گے حاجی جی۔“ عرفان نے کہا۔

”کوٹھی کے پیچھے یہ اتنا بڑا گندہ ٹالہ بہہ رہا ہے۔ تیز پانی سارے شہر کی گندگی کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اس گندگی کو بھی لے جائے گا۔ پھیونک دو ان کی لاشیں ٹالے میں۔“ حاجی نے کہا۔

عرفان نے فوراً ہی پستول نکال لیا۔ قادر اور غلام رسول حاجی کے قدموں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔ حاجی نے انہیں ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ عرفان نے پہلے قادر کی کھوپڑی میں گولی ماری اور پھر غلام رسول اور اللہ دے کی کھوپڑیوں میں بھی گولیاں اتار دیں وہ گرد آلود فرش

کہ میں تمہیں اپنے قدموں میں جھکنے پر مجبور کر دوں گی۔ میں جب چاہوں تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہوں۔ اس کا انداز تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ مجھے تمہارے ہر ٹھکانے کا پتا چل جاتا ہے۔ لیکن میں تمہیں نہیں ماروں گی۔ تم زندہ رہو گے تاکہ اپنی آنکھوں سے اپنی تباہی کے مناظر دیکھ سکو۔ اور ایک بات ذہن میں رکھنا پائی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے اس ٹھکانے کے بارے میں ک کو نہیں بتاؤں گی۔ پولیس کو بھی نہیں۔“

”تم نے میرا کیا بگاڑ لیا ہے جو پولیس بگاڑ لے گی۔“ حاجی نے چیختے ہوئے جواب دیا۔

”اس حساب سے تو تمہارا واقعی کچھ نہ بگاڑا کہ تمہارے ہاتھ پیر ابھی سلامت ہیں۔ ویسے میر وعدہ کر چکی ہوں کہ تمہارے اس ٹھکانے کے بارے میں پولیس کو اطلاع نہیں دوں گی۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس اب کوئی جگہ رہی ہی نہیں۔ تمہیں ایک نہ ایک روز سڑکوں پر آ پڑے گا۔ مقابلہ کرنے کے لئے نہیں، بھیک کے لئے ہاتھ پھیلانے کے لئے۔“ ٹہینہ نے کہا۔

”کاش! تم میرے سامنے ہوتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ میرے ہاتھ بھیک مانگنے کے لئے اٹھ کر گے یا تمہارا گلا گھونٹنے کے لئے۔“ حاجی چیخا۔

”تمہارے ہاتھوں میں اب اتنی طاقت نہیں رہی کہ کسی کا گلا گھونٹ سکو۔ تمہاری سارا طاقت سلب ہو چکی ہے۔ اور ہاں۔ ذرا اپنے دوست سے بات کر لو۔“ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر ریسپور پر شارق کی آواز سنائی دی۔ ”اپنی کیننگی کا تماشہ دیکھ لیا حاجی۔ اگر تم شرافت کا ثبوت دیتے تو تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے انتقام سے بچ جاؤ گے۔“ حاجی غرایا۔ ”میں تمہاری بوٹیاں کٹ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔“

”میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا حاجی۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”اب تک جو کچھ بھی کیا ہے ٹہینہ ہی نے کیا ہے میں تو ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہوں اور جس دن میں میدان میں آگیا اس دن تمہیں کہیں پہنچا بھی نہیں ملے گی۔ اب میں زیادہ دیر تم سے بات نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اگر تم اسی طرح چیختے رہے تو تمہارے پیچھے پھٹ جائیں گے۔“

حاجی چیخ دھاڑ رہا تھا لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ دی گئی تھی۔ حاجی کو جب لائن جان جان ہونے کا احساس ہوا تو اس نے بھی غصے سے ریسپور شیخ دیا۔ قریب کھڑی ہوئی رعنا خوفزدہ ہو کر اچھل پڑی تھی۔

”کل کا لونڈا اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھنے لگا ہے۔“ حاجی باری باری رعنا اور فاردق کی

پر تڑپنے لگے۔ حاجی نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر عرفان وغیرہ کو لاشیں ٹھکانے لگانے کی ہدایت دیتا ہوا اوپر آگیا۔

رعنا اور فاروق احمد ہل کمرے میں بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے شاید وہ اس وقت کو کوس رہے تھے جب انہوں نے حاجی کو اپنے گھر آنے کی اجازت دی تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر شائق نے خود یہاں حملہ کر دیا یا پولیس کو اطلاع دیدی تو وہ بھی مارے جائیں گے۔ حاجی کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔

”تمہارا پری چہرہ کہاں ہے۔ اس سے کچھ بچائے۔ بڑی شدت سے طلب ہو رہی ہے۔“ حاجی نے رعنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ساڑھے دس بجے ہی سو جاتا ہے حاجی صاحب۔ میں چائے بناتی ہوں۔“ رعنا اٹھتے ہوئے بولی۔ ”مگر آپ نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”بھوک نہیں ہے مجھے۔ چائے پینا چاہتا ہوں۔“ حاجی نے کہا اور وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

رعنا اٹھ کر باروچی خانے میں چلی گئی۔ اور پندرہ بیس منٹ بعد چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے اپنے اور فاروق کے لئے بھی چائے بنائی تھی۔

وہ چائے پی رہے تھے کہ رب نواز اور دلاور اللہ دتہ کی لاش اٹھائے ایک کمرے سے برآمد ہوئے۔ یہ خانے کا راستہ اسی کمرے میں سے تھا۔ لاش کے سر سے خون ٹپک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رعنا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ پھوٹ گیا۔ گرم گرم چائے اس کے اوپر گری اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا۔؟“ آواز اس کے حلق میں پھنس گئی تھی۔ ”گندگی ہے۔ پیچھے نالے میں پھینکنے جا رہے ہیں۔“ حاجی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

یہ خانے میں سے یکے بعد دیگرے تین لاشوں کو باہر لے جاتے دیکھ کر رعنا اور فاروق کانپ کر رہ گئے۔ ان تینوں کو آج دوپہر ہی رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔ پری چہرہ کے سامنے تو حاجی نے یہ کہا تھا کہ وہ تینوں گاؤں میں سے اس کے گھر سے قیمتی زیورات چرا کر بھاگے ہوئے تھے اور آج پکڑے گئے تھے لیکن بعد میں فاروق کو پتا چل گیا تھا کہ وہ تینوں بند روڈ والے اس بنگلے کے محافظ تھے جس کے یہ خانے میں پڑی ہوئی کروڑوں روپے کی ہیروئن ضائع کر دی گئی تھی۔ فاروق نے رعنا کو بتا دیا تھا کہ وہ تینوں کون تھے۔

ان دونوں کا خیال تھا کہ انہیں مار پیٹ کر چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن یہ تو وہ سوچ بھی نہیں

سمجھتے تھے کہ حاجی اتنا سفاک ثابت ہو گا۔ پہلے تو ان تینوں کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر سروں میں گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حاجی نے رعنا کی بات کا جواب اس طرح دیا تھا جیسے انسانی زندگی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

رعنا اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ گرم گرم چائے گرنے سے نہ صرف اس کے کپڑوں کا ستیا تاس ہو گیا تھا بلکہ اس کا جسم بھی جھلس گیا تھا۔ اس نے فاروق کی طرف دیکھا اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔

فاروق احمد بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور رعنا کی طرف بڑھا۔ رعنا میں اب کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ فاروق آگے بڑھا تو وہ اس سے لپٹ گئی۔ فاروق نے اسے بند پر پر بٹھا دیا۔

”اپنے آپ کو قابو میں رکھو رعنا۔“ فاروق نے کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

”تم اس خونی کولے کر کیوں آئے تھے۔“ رعنا نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نکالو اس قاتل کو گھر سے۔ ورنہ یہ ہمیں بھی مار ڈالے گا۔“

”اسی لئے تو کہتا ہوں اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔“ فاروق نے کہا۔ ”میں نے تو اسے صرف منشیات کا اسمگلر سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ اس قدر سفاک اور بے رحم ثابت ہو گا۔ اگر ہماری طرف سے کوئی بات ہو گئی۔ اور اسے ہم پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تو یہ ہمیں بھی اس طرح مار کر گندے نالے میں پھینک دے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ پری چہرہ سویا ہوا ہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ دیکھ لیتا تو شور مچا دیتا۔“

”جتنی جلد ممکن ہو سکے ان لوگوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔“ رعنا اٹھ کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ ”اگر پولیس کو ان کی یہاں موجودگی کی بھنک بھی مل گئی تو یہ لوگ تو شاید اپنی جانیں بچا کر بھاگ جائیں گے لیکن ہم نہیں بچ سکیں گے۔ اس لئے جتنی جلد ممکن ہو سکے انہیں یہاں سے چلا کرنے کی کوشش کرو۔“

”کوشش کروں گا کہ یہ لوگ کل یہاں سے چلے جائیں۔“ فاروق احمد نے جواب دیا۔ رعنا الماری سے کپڑے نکال کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ فاروق احمد چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر کمرے سے باہر آگیا۔ ہل کی طرف جانے سے پہلے اس نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تھا۔



اگلے روز پھر بارش شروع ہو گئی تھی۔ بارش اگرچہ تیز نہیں تھی ہلکی بوندا باندی تھی لیکن

”ہم یہی تو کر رہے ہیں۔“ نوکھانے کہا۔ ”اے تو چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ اگر ہم لوگ اسے اسی طرح بڑے بڑے نقصان پہنچاتے رہے تو وہ کب تک برداشت کرے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس کے ہیروئن کے سارے اڈے ختم نہیں ہو گئے۔ مزید اڈے بھی ہوں گے جن کا ہمیں سراغ لگانا چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے اس کے کسی اسلحہ ڈپو پر بلہ بولا جائے۔ ہیروئن کے اڈوں پر تو اس نے حفاظتی انتظامات پہلے سے زیادہ سخت کر دیے ہوں گے۔ البتہ اسلحہ کے ڈپو کے خلاف کارروائی کا موقع مل سکتا ہے۔“

”تو پھر اسلحہ ڈپو ہی کا سراغ لگایا جائے۔“ شارق بولا۔

”ہاں۔ اس سلسلے میں ہمیں کچھ محنت کرنی پڑے گی۔“ نوکھانے جواب دیا۔

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں ایک مرتبہ مانجھے گجر کے ایک آدمی کے ساتھ راوی روڈ پر نمبر مارکیٹ گیا تھا۔ اس وقت مانجھے گجر سے ہمارے تعلقات بھی اچھے تھے اور حاجی کے بھی۔ مانجھے گجر کا وہ بندہ مجھے سڑک پر ہی چھوڑ گیا تھا اور اندر کسی گلی سے دو کلاشنکوف رائفلیں لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں حاجی کا اسلحہ کا گودام ہے۔ انہیں جب اپنے گاہکوں کے لئے بھی اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ یہاں سے لے جاتے ہیں۔ اب معلوم نہیں وہ اڑا وہاں ہے یا نہیں؟“

”یہ میرا خیال ہے بہت پرانی بات ہے۔“ شارق بولا۔ ”اس قسم کے اڈے آسانی سے منتقل نہیں ہوتے۔ معلوم کرنا پڑے گا۔“

”تو معلوم کر لیتے ہیں۔“ نوکھانے کہا۔ ”میں کل صبح ہی اپنے مشن پر نکل جاؤں گا۔“

”تم جاؤ گے؟“ ٹینہ نے اسے گھورا۔

”مجھے ابھی زنگ نہیں لگا ٹینہ بی بی۔“ نوکھانے کہا۔ ”ان ہاتھوں میں اب بھی اتنی طاقت

ہے کہ دو چار آدمیوں کی گردنیں مروڑ سکیں۔ بند روڈ والے مشن کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ کام تم کرو گے۔“ شارق بولا۔ ”اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا کہ حاجی جس کو بھی میں ٹھہرا ہوا ہے وہاں کتنے آدمی ہیں شفقت نے بتایا تھا کہ یہ کو بھی فاروق احمد نام کے کسی شخص کی ملکیت ہے۔ یہ فاروق احمد کون ہے اور حاجی سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”تعلق تو ناجائز ہی ہو گا۔“ نوکھانے بولا۔ ”طفیل کو بھیج دو۔ وہ معلوم کر کے آجائے گا۔“

”طفیل نہیں میں خود جاؤں گا۔“ شارق نے کہا۔ ”میں کھانا کھانے کے بعد یہاں سے نکل

جاؤں گا۔“

”کیس پھنس مت جانا۔“ نوکھانے کہا۔

اس سے بھی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ پچھلے تین چار روز کی بارشوں سے شہر کی ساری سڑکیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں اور جگہ جگہ پانی جمع تھا۔

شارق اور ٹینہ وغیرہ گھر پر ہی تھے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے بوریٹ ہونے لگی تو نوکھانے تاش نکال لیے اور وہ سب ٹینہ والے کمرے میں بیڈ پر بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ رضیہ اور ٹینہ پارنر تھیں جبکہ دوسری پارٹی نوکھانے اور شارق پر مشتمل تھی۔ شاہ پری کو تاش کا کوئی کھیل نہیں آتا تھا۔ وہ قریب بیٹھی انہیں کھیلنے ہوتے دیکھتی رہی۔ طفیل برآمدے میں کرسی پر بیٹھا بارش کے مزے لے رہا تھا۔

دوسرے قریب بارش بند ہو گئی۔ بادل چھٹ گئے اور دھوپ نکل آئی۔

وہ لوگ صبح سے تاش کھیل رہے تھے لیکن اب اس کھیل سے بھی بوریٹ ہونے لگی تھی۔ شارق نے پتے پھینک دیے۔ اور انگڑائی لیتا ہوا بیڈ سے اٹھ کر ایزی چیئر پر بیٹھ گیا اور پیر سامنے کو پھیلا لئے۔ اور پھر نوکھانے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”حاجی کے ہیروئن کے ذخیرے تو ہم نے تباہ کر دیے۔ اس کے اڈوں کی تباہی کو بین الاقوامی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا نے بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اس کی تباہی کی خبریں پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں۔ اب کوئی بین الاقوامی اسمگلر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ منشیات کے حوالے سے تو یہ سمجھو حاجی ختم ہو گیا لیکن اس کے پاس اسلحے کے ذخیرے ابھی باقی ہیں۔ اس نے ہماری ملتان روڈ والی حویلی سے بھی اسلحہ اٹھا لیا تھا اب معلوم کرنا ہے کہ اسلحے کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں۔ یہ اڈے بھی ختم ہو جائیں تو وہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا“ ٹینہ نے کہا۔ ”اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک خود کشی کر چکا ہوتا یا کم از کم پاگل خانے پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت تسلیم پڑے گی کہ یہاں کروڑوں روپے کی ہیروئن کی تباہی سے اس کی صحت پر زیادہ اثر نہیں پڑا۔ تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ اس کے تعلقات بڑے بڑے بین الاقوامی گروہوں سے ہیں۔ ان سب کا مفاد حاجی کی زندگی سے وابستہ ہے۔ وہ اسے اس طرح ختم نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اسے سارا دیں گے اپنی طرف سے بڑی بڑی رقمیں دے کر۔ یہ لوگ ایک ایک سودے میں اربوں ڈالر منافع کماتے ہیں اس لئے یہ چھوٹا موٹا نقصان ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور پھر حاجی خود ایسا گیا گزرا نہیں ہے یہاں لاہور میں اس کی اربوں کی جائیداد ہے۔ خفیہ بینک اکاؤنٹس ہیں جن میں اربوں ڈالر جمع ہوں گے۔ حاجی جیسے شخص کو مالی طور پر تباہ کرنا بڑا مشکل ہو گا۔ البتہ ہم یہ کوشش کرتے رہیں گے کہ وہ چین سے ایک جگہ پر نہ بیٹھ سکے اور اس گھناؤنے کاروبار کے سلسلے میں دوبارہ کھڑا نہ ہو سکے۔“

”شارق کو پھانسا آسان نہیں ہے۔“ شارق مسکرایا۔

اور پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد تین بجے کے قریب شارق گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس نے گزشتہ دو دن سے شیو نہیں کیا تھا۔ اس نے جو کپڑے پہنے وہ بھی بہت میلے کچیلے تھے۔ شلوار کا ایک پانچواں اڑھڑا ہوا تھا۔ قمیص کے اوپر کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ کھلے ہوئے گریبان سے اس کا بالوں بھرا سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کندھے پر میلا سا پٹا رکھا ہوا تھا۔ اور پیروں میں ہوائی چپل تھی۔ جلیے سے وہ بہت غریب لگتا تھا۔

گھر سے نکل کر جی ٹی روڈ پر تیزاب احاطے کے موڑ تک آتے ہوئے شارق کا حلیہ اور بھی بگڑ گیا۔ اس کے پیر کچڑ میں بھر گئے تھے اور ہوائی چپل سے اڑنے والے کپڑے کے چھینٹوں نے اس کی شلوار اور قمیص کو بھی پیچھے سے مزید گندہ کر دیا تھا۔

جی ٹی روڈ پر تیزاب احاطے کے موڑ کے قریب ہی دو ایسے ورکشاپ تھے جہاں رکشے کرائے پر ملتے تھے ایک ورکشاپ کے سامنے تین چار رکشے کھڑے تھے۔ شارق وہاں پہنچ گیا۔

”رکشہ چاہئے استاد جی۔“ شارق نے ورکشاپ کے مالک سے کہا۔ ”ایک ہفتہ گزر گیا ہے“ کوئی کام دھندہ ہی نہیں ملتا۔

”ڈرائیونگ لائسنس ہے تمہارے پاس؟“ استاد جی نے اسے گھورا۔

”لائسنس تو نہیں ہے استاد جی۔ میں دو سال تک گوجرانوالہ میں رکشہ چلاتا رہا ہوں“ شارق نے جواب دیا۔

”یہ بات نہیں ہے کہ تمہیں رکشہ چلانا آتا ہے یا نہیں۔“ استاد جی نے جواب دیا۔ ”لائسنس نہ ہو تو آج کل پولیس والے رکشہ بند کر دیتے ہیں تھانے میں۔“

”ایسا نہیں ہو گا استاد جی۔“ شارق بولا۔ ”ساری بات پانچ دس روپے کی ہوتی ہے۔ رکشہ رکٹے ہی نوٹ سنتری کی مٹھی میں دباؤ تو وہ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ لائسنس یا رکشے کے کاغذ ہیں یا نہیں۔“

”کہاں رہتے ہو۔“ شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس۔“ استاد جی نے کہا۔

”چاہ میراں میں رہتا ہوں جی۔“ شفیع کبہہ کی حویلی میں۔ اور یہ ہے میرا شناختی کارڈ۔“ شارق نے جیب سے ایک شناختی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

محمد الیاس نامی شخص کا یہ کارڈ گوجرانوالے کا بنا ہوا تھا۔ اس پر تصویر شارق کی تھی جس میں اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس تصویر میں بھی شارق کی حیثیت سے پہچانا مشکل تھا۔ شارق اور اس کے ساتھیوں کے پاس ایسے کئی شناختی کارڈ تھے جن پر انہوں نے تصویریں لگا رکھی تھیں۔

استاد جی نے پہلے کارڈ پھر شارق کی طرف دیکھا اور ایک رجسٹر کھول کر اس کا نام اور موجودہ پتہ لکھنے لگا۔

”سو روپیہ جمع کرا دو۔ یہ کارڈ میرے پاس رہے گا۔ رکشہ واپس لے کر آؤ گے تو کارڈ واپس مل جائے گا۔ رکشے میں پیٹرول تمہیں ڈلوانا ہو گا اور ہر قسم کی نوٹ پھوٹ کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔ یہاں دستخط کر دو اور وہ سامنے والا رکشہ لے جاؤ۔ اگر رات دس بجے کے بعد آئے تو اگلے دن کا کرایہ وصول ہو گا۔“

”ٹھیک ہے استاد جی۔“ شارق نے سو کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا اور رجسٹر پر دستخط کر کے باہر آ گیا۔

اس نے قریبی پیٹرول پمپ سے ٹنکی میں پیٹرول بھرا دیا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب فی الحال بارش کا امکان نہیں تھا۔ سورج کبھی بادلوں میں چھپ جاتا اور کبھی دھوپ چمکنے لگتی۔ پیٹرول پمپ سے نکلتے ہی شارق کو مزنگ کی سواریاں مل گئی۔ وہ دو جوان عورتیں تھیں۔ جو راستے بھر زور زور سے باتیں کرتی رہیں۔ انہیں مزنگ چھوڑ کر شارق نے رکشہ گلبرگ کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

نسر کے پل پر فوارے والے چوک کے قریب اسے ایک سواری مل گئی جسے لہٹی جانا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس نے چہرے پر اس طرح لیپا پوتی کی ہوئی تھی جیسے مقابلہ حسن میں حصہ لینے جا رہی ہو۔

اس عورت کو لہٹی مارکیٹ چھوڑ کر شارق سنیما والے چوک پر نکل آیا اور رکشہ ایک سایہ دار جگہ پر روک کر انجن بند کر دیا۔ سامنے ہی چائے کی دکان تھی۔ شارق نے لڑکے کو آواز دے کر چائے کا ایک گلاس منگوا لیا اور پچھلی سیٹ پر نیم دراز پوزیشن میں بیٹھ کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے دن بھر رکشہ چلاتے چلاتے بری طرح تھک گیا ہو۔ اس دوران دو تین لوگ آئے تھے مگر شارق نے انکار کر دیا تھا۔

چائے پینے کے بعد بھی وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ سو رہا ہو۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اور پھر شور کی آواز سن کر وہ چونک گیا اور آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

چند گز دور دکانوں کے سامنے پندرہ سولہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ایک عورت کا پرس چھین کر بھاگا تھا۔ عورت کے شور چمانے پر کچھ لوگ اس لڑکے کے پیچھے لپکے اور اسے ایک گلی میں مڑتے ہوئے پکڑ لیا۔ اس لڑکے کے ساتھ وہی ہوا جو ایسے موقع پر عام طور پر ہوتا ہے۔ قریب کھڑا ہوا ہر

فحش اس لڑکے کو ایک دو ہاتھ جڑ رہا تھا۔ اس دوران ایک پولیس والا اس طرف آ نکلا۔ اور اس جیب تراش لڑکے کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

عورت کا پرس اس کو لوٹا دیا گیا اور پولیس والا اس لڑکے کو مارتا پیٹتا رکشے کے قریب آ گیا۔
”کیا بات ہے سنتری بادشاہ۔ کیوں پکڑ لیا ہے بیچارے کو؟“ شارق نے پچھلی سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ بیچارہ ہے۔“ پولیس والے نے لڑکے کی گردن پر ایک اور ہاتھ جڑ دیا۔ ”جیب کترا ہے یہ۔ اسے تھانے لے کر جانا ہے۔ چلو تم رکشہ اشارت کرو۔“

شارق مزید کچھ کہے بغیر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رکشہ اشارت کر دیا۔ پولیس والا اس لڑکے کو لے کر پیچھے بیٹھ گیا۔ رکشے کے آس پاس سات آٹھ آدمی کھڑے تھے۔

”اس کو چھوڑنا مت سنتری بادشاہ۔ بند کر دو اسے تھانے میں۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”اے تو ایسا بند کروں گا کہ اس کی بے بے یاد کرتی رہے گی اسے۔“ سنتری نے جواب دیا۔
شارق نے رکشہ آگے بڑھا دیا اور چند گز آگے جا کر ایک اور سڑک پر موڑ دیا۔ وہ اس سڑک پر زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ پولیس والے کی آواز سنائی دی۔
”رکشہ روکو ذرا۔“

شارق نے رکشہ سڑک کے کنارے پر روک لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پولیس والے نے رکشہ کیوں روک لیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پولیس والا اس لڑکے کی پٹائی کرتے ہوئے گندی گالیاں بک رہا تھا اور اس کے لباس کی تلاشی بھی لے رہا تھا۔ لڑکا خاموش سے پٹ رہا تھا۔

”تھانے لے جاؤں گا تو بند کر دیے جاؤ گے اور پھر کم از کم چھ مہینے کی سزا ہو جائے گی۔ پیسے نکال کہاں چھپائے ہوئے ہیں۔“ کانٹیل نے تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے جی۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

لیکن سنتری بادشاہ نے اس کی جیب سے سترہ روپے اور شلوار کے نیپے سے ساڑھے تین سو روپے نکال لئے۔

”تم تو کہتے تھے کچھ نہیں ہے۔“ سنتری نے اسے ایک اور تھپڑ مارا۔

”یہ پیسے میرے نہیں ہیں جی۔ میری ماں بیمار۔۔۔“

”چپ کر اوئے ماں دے بچے۔“ کانٹیل نے اسے ایک اور ہاتھ رسید کر دیا۔ ”چل بھاگ جا یہاں سے اگر دوبارہ اس علاقے میں نظر آیا تو پکڑ کر بند کر دوں گا۔“

”سرجی۔ مجھے بس کے کرائے کے پیسے تو دیدیں۔“ لڑکے نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا۔

کانٹیل نے دس کانٹ اس طرح لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا جیسے اسے بھیک دے رہا ہو۔
پھر شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے اگلے چوک پر چھوڑ دینا یار۔“

”سنتری بادشاہ۔ اس طرح روز کا کتنا کمالیتے ہو۔“ شارق نے رکشہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
”بس یار۔ دال روٹی کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ تنخواہ میں تو پوری نہیں پڑتی۔“ سنتری بادشاہ نے

جواب دیا۔

اگلے چوک پر شارق نے رکشہ روک لیا۔ اور کانٹیل اتر کر ایک طرف جانے لگا تو شارق نے آواز لگائی۔

”سنتری بادشاہ۔ کرایہ تو دیدو۔“

”اوئے۔۔۔ قنون سے کرایہ مانگتا ہے۔ لائسنس ہے تمہارے پاس۔“ کانٹیل نے مڑ کر اسے گھورا۔

”جیو سنتری بادشاہ۔“ شارق بولا۔ ”ہم بھی تم جیسے قنون کے محافظوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ کم مکار پر ہی اپنا رکشہ چل رہا ہے۔“

شارق رکشہ لے کر گلیگڑ کی مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا۔ شفقت نے فاروق احمد کی کوٹھی کا زہا بتایا تھا وہ زیادہ مشکل نہیں تھا وہ دو مرتبہ اس کوٹھی کے سامنے سے گزرا تھا۔ تیسری مرتبہ اس طرف پہنچا تو شام کے چھ بجنے والے تھے۔ اس نے کوٹھی کے عین سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک درخت کے نیچے رکشہ روک لیا اور نیچے اتر کر اپنی سیٹ اونڈھادی اور انجن کو اس لمح دیکھنے لگا جیسے کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔

وہ تقریباً پندرہ منٹ تک انجن کو دیکھتا رہا۔ اس نے پلگ بھی نکال کر صاف کیا تھا۔ اس دوران وہ بار بار سڑک کے دوسری طرف فاروق احمد کی کوٹھی کو دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر ایک عورت کو کوٹھی کے گیٹ سے نکلتے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ دراز قامت عورت خاصی حسین تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹوکری تھی اور دوسرے ہاتھ میں پرس تھا۔ وہ اس طرح منک منک کر ہل رہی تھی جیسے کسی فیشن شو میں کیٹ واک کا مظاہرہ کر رہی ہو۔

سڑک پر آکر اس نے ایک سیکنڈ کو رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر سڑک پار کر کے اس طرف آئے گی۔ وہ سڑک کے درمیان میں گرین بیلٹ پر پہنچ چکی تھی۔ شارق کن اکھیں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی بہت حسین تھی۔ شارق کے خیال میں وہ فاروق احمد کی بیوی ہو سکتی تھی۔

آئے تھے۔ ہمارا صاحب بہت اچھا ہے۔ بیگم صاحب مجھے بہت چاہتی ہیں۔ گھر کا سارا حساب میرے پاس رہتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے کبھی مجھ سے حساب نہیں پوچھا۔ میں جو چاہوں خرچ کرتی ہوں۔

”میں نے تمہارے صاحب کو دیکھا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے۔“ شارق نے بولا۔

”تم نے کہاں دیکھا تھا؟“ پری چہرہ نے پوچھا۔

”ایک روز اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور وہ میرے رکشہ پر دفتر گیا تھا۔ اس نے مجھے کرائے سے پانچ روپے زیادہ دیے تھے۔“ شارق نے کہا۔

”ہمارا صاحب واقعی بہت اچھا ہے لیکن آجکل بہت پریشان ہے۔“

”کیوں۔ کیا کاروبار میں کوئی گھٹا ہو گیا ہے۔“ شارق نے پلگ صاف کرتے ہوئے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں جی۔“ پری چہرہ نے کہا۔ ”اس کے کوئی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کم بخت ہر وقت گھر میں ہی گھسے رہتے ہیں۔ کبھی باہر بھی نہیں جاتے۔ وہ جب سے آئے ہوئے ہیں صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں۔“

”تمہارا صاحب ان مہمانوں کو نکال کیوں نہیں دیتا۔ کون ہیں وہ لوگ؟“ شارق بولا۔

”اپنے آپ کو حاجی کہتا ہے۔ میں تو اسے پاجی کہتی ہوں۔ اس کے ساتھ تین اور آدمی ہیں۔ لپے ہیں سارے۔ پرسوں رات ایک تو مجھے کھینچ کر سرونٹ کوارٹر میں لے جا رہا تھا۔ میں ہاتھ جھڑا کر بھاگ گئی۔“ پری چہرہ نے بتایا۔

”ایسے لوگوں کو تو گھر میں رکھنا ہی نہیں چاہئے۔“ شارق بولا۔ ”پرسوں اس نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا۔ کسی دن تمہاری بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑ لے گا۔ تمہاری بیگم صاحبہ شاید اسی لئے ڈری ڈری رہتی ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ پری چہرہ نے کہا۔ ”وہ جو پاجی ہے نا بڑا خراب آدمی ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ جس دن تیز بارش ہو رہی تھی نا اس دن یہ تین آدمیوں کو رسیوں سے باندھ کر لے آئے تھے۔ پاجی نے بتایا تھا کہ یہ تینوں گاؤں میں اس کی حویلی سے قیمتی زیور چرا کر بھاگے ہوئے تھے۔ آخر انہیں پکڑ ہی لیا۔ ان تینوں کو نہ خانے میں لے جا کر بہت مارا تھا۔ کل رات تک وہ تینوں نہ خانے میں تھے۔ آج پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ غائب ہو گئے ہیں۔“ شارق نے پوچھا۔

”آج دوپہر میں چوری چھپے نہ خانے میں گئی تھی۔“ پری چہرہ نے بتایا۔ ”وہ تینوں نہ خانے

وہ خوبصورت عورت سڑک پار کر کے قریب پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی شارق کے سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ اس کا تعلق تیسری جنس سے تھا۔

”کتنے جانا ہے سو ہینو!“ اس کے قریب پہنچنے پر شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لبٹی مارکیٹ۔ پانچ روپے دوں گی۔“ اس نے منک کر جواب دیا۔ ”روزانہ سودا لینے جاؤ ہوں۔ اتنے ہی پیسے دیتی ہوں۔“

”تم یہ بھی نہ دینا سو ہینو۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا نام سو ہینو نہیں۔ پری چہرہ ہے۔“ اس نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تم واقعی پری چہرہ ہو۔“ شارق بولا۔ ”اگر تم واقعی عورت ہو تیں تو تمہارے لئے لوگ ایک دوسرے کا خون کر سکتے تھے۔“

”لوگ لڑتے تو اب بھی ہیں۔“ پری چہرہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جب میں مارکیٹ جاؤ ہوں تو لوگ مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کوئی مجھے آئس کریم کھلاتا ہے کوئی لسی پلاتا ہے۔ اور کوئی مجھے ساتھ چلنے کو کہتا ہے۔ مگر میں کوئی آوارہ تھوڑی ہوں جو کسی کے ساتھ چل پڑوں۔ یہ مر کتنے بیوقوف ہوتے ہیں۔ میرے لئے لڑ پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ایسی گندی گندی گالیاں دیتے ہیں۔ کہ توبہ توبہ۔ شرم آنے لگتی ہے مجھے بھی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

”آج تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔“ شارق نے کہا۔ ”میں تمہیں مارکیٹ اتار کر تمہارا انتظار کروں گا اور تمہیں واپس بھی چھوڑ دوں گا۔“

”پھر مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہو گے۔“ پری چہرہ نے کہا۔

”نہیں میں ایسا آوارہ مرد نہیں ہوں۔“ شارق نے جواب دیا۔ اس نے لبٹی مارکیٹ میں ایک جگہ رکشہ روک لیا اور پری چہرہ کو بتا دیا کہ وہ اس جگہ اس کا انتظار کرے گا۔

پری چہرہ سودا لے کر تقریباً پون گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس کے بیٹھے ہی شارق نے رکشہ اشارت کر دیا۔ مارکیٹ کے علاقے سے کشادہ سڑک پر پہنچتے ہی رکشے کا انجن کھانسنے لگا۔ اور بلاآخر شارق کو ایک جگہ رکشہ روکنا پڑا۔ سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت تھی لیکن قرب و جوار میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کی طرف توجہ دیتا۔ شارق نے نیچے اتر کر اپنی سیٹ اونڈھا دی اور پانے کی مڈ سے پلگ کھولنے لگا۔

”تم اس کو نمی کے ملازم ہو؟“ شارق نے اس طرح کہا جیسے وقت گزارنے کے لئے بائنا کرنا چاہتا ہو۔

”میں بچپن سے ان کے پاس ہوں۔“ پری چہرہ نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ مجھے گاؤں سے لے

میں نہیں تھے۔ فرش پر خون بکھرا ہوا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو بتایا تو انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں کسی کو یہ بات نہ بتاؤں۔

”تمہاری بیگم صاحبہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“ شارق بولا۔ ”اگر تم نے کسی کو بتایا تو وہ حاجی اور اس کے بندے تمہیں بھی مار دیں گے۔“

”میں تو بابا کل پنڈ چلی جاؤں گی۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے یہاں، اور تم کسی سے مت کہنا کہ میں نے تمہیں کوئی بات بتائی ہے۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے کسی کو بتانے کی۔“ شارق پلگ فٹ کرنے لگا۔ اس کا مطلب پورا ہو گیا تھا۔ اب وہاں رکے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

پری چہرہ کو اس کی کوشی کے سامنے اتارتے ہی اس نے رکشہ آگے بڑھا دیا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

راستے میں کئی لوگوں نے رکشہ روکنے کا اشارہ کیا تھا مگر شارق نے کوئی توجہ نہیں دی۔

آٹھ بجے اس نے رکشہ واپس کر دیا۔ استاد سے اپنا شناختی کارڈ واپس لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

پری چہرہ نے بڑا سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جن تین آدمیوں کو ریسوں سے باندھ کر لایا گیا تھا وہ بند روڈ والی کوشی کے محافظ تھے۔ اس روز شارق نے خود انہیں بیچو میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا اور پری چہرہ کی باتوں سے اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ حاجی نے ان تینوں کو قتل کر کے لاشیں کہیں پھکوا دی تھیں۔

نو لکھا گھر پر نہیں تھا۔ ٹینے نے بتایا کہ وہ بھی اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد حاجی کے اسلحہ ڈپو کی تلاش میں نکل گیا تھا۔

نو لکھا تقریباً دس بجے واپس آیا۔ وہ ایک ملنگ کے بھیس میں تھا گلے میں کئی رنگ برنگے موتیوں والی مالاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ اس نے راوی روڈ کے قریب نمبر مارکیٹ کے علاقے میں اسلحہ ڈپو کا سراغ لگا لیا ہے اور وہاں اس وقت بھی اسلحہ کی پیشیاں بھری ہوئی ہیں۔

”گڈ۔“ شارق مسکرا دیا۔ ”اس ڈپو کا بندوبست آج ہی ہو جائے گا۔ لیکن پہلے حاجی سے ایک اور بات کر لوں۔“

اس نے فون کا ریسور اٹھا کر فاروق احمد کا نمبر ملایا۔ کال اس کی بیوی نے ریسور کی تھی۔

”ریسور حاجی عبداللہ کو دو۔ اس سے کہو اس کا پرانا دوست شارق بات کرنا چاہتا ہے۔“

شارق نے کہا۔

اور پھر اس کے دو تین سیکنڈ بعد ہی حاجی کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کیا کوئی نئی دھمکی دینا چاہتے ہو۔ تم یہ یقین کر لو کہ میرے ہاتھ آگئے تو تمہاری بوٹیاں چیلوں اور گردھوں کو کھلاؤں گا۔“

”تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔“ شارق نے کہا۔ ”اس وقت تو میں تمہیں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ تم اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے چلے جا رہے ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ حاجی کتے کی طرح غرایا۔

”بے گناہوں کے خون سے کب تک ہاتھ رنگتے رہو گے۔ بہتر ہے اپنے راستے میں مزید کانٹے بونے کے بجائے اپنے آپ کو سرنڈر کر دو۔“

”میں سرنڈر کر دوں؟“ حاجی چیخا۔ ”میں تو تمہیں اپنے قدموں پر گراؤں گا۔“

”سنو حاجی۔“ شارق نے کہا۔ ”مجھے پتا چل گیا ہے کہ تم بند روڈ والے احاطے سے اپنے جن تین محافظوں کو لے کر گئے تھے انہیں تم نے قتل کر کے لاشیں غائب کر دی ہیں۔ میں تو پولیس کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن جب لاشیں ملیں گی تو پولیس خود ہی تمہارے پیچھے لگ جائے گی۔“

”کیا کہتے ہو۔“ حاجی چیخا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں تمہاری ایک ایک حرکت سے واقف ہوں۔ ویسے کل تم ایک اور بہت زبردست خوشخبری سنو گے۔“ شارق نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ سب کچھ دیر تک حاجی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر شارق بولا۔

”میرا خیال ہے علاقے کے ایس پی کو اس اسلحہ ڈپو کے بارے میں اطلاع دیدی جائے۔ تاکہ آج رات ہی یہ کہانی بھی مکمل ہو جائے۔“

”کیا وہ گمتم اطلاع پر یقین کر لے گا؟“ ٹینہ بولی۔

”یہ علاقہ اس ایس پی کا ہے جسے میں نے بند روڈ والے اڈے کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ اور پھر یہ اطلاع گمتم نہیں اپنے نام سے دوں گا۔ اسے یقین کرنا ہی پڑے گا۔“ شارق نے کہا۔

”تو پھر کرد بات۔“ ٹینہ بولی۔

ایس پی کا دفتر اس وقت بند تھا۔ شارق نے اسی علاقے کے ایک پولیس اسٹیشن کا نمبر ملا کر

ہات ہوں گا۔ آپ ٹھیک ایک گھنٹے بعد منو پارک کے بالکل سامنے رنجیت سنگھ کی سلامی کے پاس آجائیے۔ آپ سادہ لباس میں اور اکیلے ہوں گے۔ میں ایک بار پھر یہ بتا رہا ہوں کہ اگر کوئی دھوکا ہوا تو آپ بھی وہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکیں گے۔

”میں اکیلا آؤں گا اور سادہ لباس میں آؤں گا۔ کوئی میرے ساتھ نہیں ہوگا۔“ الطاف علی نے جواب دیا۔

شارق نے مزید کچھ کہے بغیر ریسور رکھ دیا اور رواں گی کی تیاری کرنے لگا۔ شارق کے ساتھ ٹینہ اور نو لکھا بھی تیار ہو رہے تھے۔

وہ تینوں گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ انہیں مقررہ جگہ پر پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ ٹینہ اسے رنجیت سنگھ کی سلامی والے موڑ پر اتار کر گاڑی آگے نکال لے گئی اور تقریباً سو گز دور روک کر انجن اور ہیڈ لمپس بند کر دیے۔

اس سڑک پر ٹریفک اس وقت بھی زیادہ تھا۔ دوسرے شہروں سے آنے والی اور شہر سے باہر جانے والی تمام بسیں اسی سڑک سے گزرتی تھیں۔

شارق سلامی سے ذرا ہٹ کر ایک تاریک گوشے میں کھڑا تھا اس کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں رکھے ہوئے پستول پر تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد سفید رنگ کی ایک کار سامنے آکر رکی۔ ایک دروازہ قامت آدمی کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

شارق نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس پاس کوئی مشتبہ گاڑی نظر نہیں آئی۔ وہ تاریکی سے نکل کر پنے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اور پھر چند سیکنڈ بعد ایس پی الطاف علی اور شارق ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔



ایس پی کے گھر کا فون نمبر دریافت کیا تو دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”آپ کون ہیں جی۔ گھر کا نمبر کیوں مانگ رہے ہیں۔“

”میں ان کا دوست ہوں کراچی سے آیا ہوں۔ اس وقت ایئرپورٹ سے بول رہا ہوں۔ دو گھنٹے بعد والی فلاٹ سے اسلام آباد جا رہا ہوں سوچا اپنے دوست الطاف علی سے فون پر ہی بات کر لوں۔ اس وقت دفتر بند ہے اور گھر کا فون نمبر میرے پاس نہیں ہے۔“ شارق نے کہا۔

”آپ نمبر نوٹ کرو جی۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر اسے ایس پی الطاف علی کے گھر کا نمبر بتا دیا گیا۔

شارق نے کریڈل ٹیپ کر کے وہ نمبر ملایا۔ اس وقت سوا گیارہ بجے تھے۔ کل فوراً ہی ریسور کر لی گئی۔

”میں الطاف علی صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ شارق بولا۔ ”میں بول رہا ہوں۔ آپ کون؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”میں شارق ہوں جناب۔“ شارق بولا۔ ”دو دن پہلے حاجی عبداللہ کے بیروٹن کے ایک اڈے کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ اس وقت بھی ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔“

”اوہ۔“ الطاف علی کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کیسی اطلاع؟“

”یہ اطلاع حاجی عبداللہ کے ایک اور اڈے کے بارے میں ہے جہاں اس وقت خطرناک قسم کے اسلحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ شارق نے کہا۔

”اس میں شبہ نہیں کہ تمہاری پہلی اطلاع درست نکلی تھی اور مجھے یقین ہے کہ یہ اطلاع بھی سو فیصد درست ہوگی۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”تم بھی اس وقت موسٹ واڈ ہو۔ لیکن کچھ عرصہ سے تم جو کچھ کر رہے ہو اسے اگرچہ قانون سے تعاون کا نام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ

تعاون کا طریقہ نہیں ہے۔ کیا تم مجھ سے ملاقات کر سکتے ہو۔“

”آپ سے ملاقات!“ شارق چونک گیا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ صرف میری اور تمہاری ملاقات ہوگی اور کسی اور کو اس کا علم نہیں ہوگا۔“ ایس پی الطاف علی نے کہا۔

”لیکن اگر میرے ساتھ دھوکا ہوا تو؟“ شارق بولا۔

”کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ میرا وعدہ ہے۔“ الطاف علی نے کہا۔

شارق نے ریسور پر ہاتھ رکھ کر ٹینہ وغیرہ سے مشورہ کیا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں آپ سے ملاقات کے لیے تیار ہوں لیکن اگر کسی قسم کا دھوکا ہوا تو میں پہلے سے بہت زیادہ خطرناک

”میں کوشش کروں گا کہ تمہارے اندر کا وہ اچھا آدمی زندہ رہے اور ایک روز تمہیں پچھاؤ دے۔“ الطاف علی نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آؤ وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اس پل پر۔ آج تو ہوا بھی بہت خوشگوار چل رہی ہے۔“

چند گز آگے سڑک کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹالا گزرتا تھا۔ یہ ٹالا برساتی پانی کے اخراج کے لئے بنایا گیا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بارش میں ٹالا تو کیا سڑک بھی پانی میں ڈوب جاتی تھی۔ دو دن پہلے جب تیز بارش ہوئی تھی تو یہی صورتحال تھی۔

وہ پل یا کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ شارق ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بائیں طرف بتدریج بلندی کی طرف جاتی ہوئی یہ سڑک شاہی قلعے کے مرکزی دروازے تک چلی گئی تھی۔ شاہی قلعے کی تفصیل اس پل یا سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔ سڑک کے دوسری طرف رنجیت سنگھ کی ساوھی تھی اور جس جگہ یہ سڑک مین روڈ سے ملتی تھی اس کے دوسری طرف اقبال پارک تھا جس کے وسط میں مینار پاکستان نظر آ رہا تھا۔

رات آٹھ نو بجے تک قلعے والی سڑک پر رونق رہتی تھی۔ لیکن اس وقت اس سڑک پر سناٹا

”اس میں شبہ نہیں کہ جب تک میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا اس وقت تک میں بھی نہیں خونخوار بھیڑیا ہی سمجھتا تھا۔“ الطاف علی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ایک اچھا بلکہ بہت اچھا انسان ضائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اسے میں قانون سے تعاون ہی کہوں گا۔ تم ایک برائی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن اس طرح تمہارے جرائم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ تم اپنے لئے بھی مشکلات پیدا کرتے رہے ہو اور وہ لڑکی شینہ۔ وہ تمہارے ساتھ مل کر جو کچھ کر رہی ہے۔ قابل تعریف ہے۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ یہ طریقہ غلط ہے۔“

”تو پھر صحیح طریقہ کیا ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔“ الطاف علی نے کہا۔

”مجھے قانون نے بگاڑا ہے اور میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کرتا۔“ شارق نے کہا۔ ”اس کے علاوہ اہم بات یہ ہے کہ قانون کی حراست میں آنے کے بعد قانون کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ اس وقت میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں آزاد رہ کر ہی کر رہا ہوں۔ اگر میں سلاخوں کے پیچھے ہو گیا تو کچھ نہیں کرسکوں گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ الطاف علی بولا۔

”یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں پہلے حاجی کا دایاں ہاتھ سمجھا جاتا تھا اس وقت مجھے حاجی

”میں اکیلا اور خالی ہاتھ ہوں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ آس پاس کوئی نہیں۔“ ایس پی الطاف نے شارق کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی ہاتھ جیب سے نکال لو۔ تمہیں پستول کے استعمال کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔“

”شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ہاتھ جیب سے نکال لیا اور پھر ان دونوں کے ہاتھ ملائے میں بڑی گرجوٹی دیکھنے میں آئی تھی۔“

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جیسا سمارٹ، مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان اس قسم کی ٹاپنڈیا سرگرمیوں میں ملوث ہو سکتا ہے۔“ ایس پی الطاف علی اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔

شارق کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے پون گھنٹہ تیار قلعے میں لگایا تھا۔ کئی دن کا بڑھا ہوا شیو بنانے کے علاوہ بال بھی بڑے سلیقے سے بنائے تھے۔ اسٹون واش جینز اور ڈینیم کے ہلکے بلیو رنگ کی شرٹ میں وہ خاصا سمارٹ لگ رہا تھا۔

”ٹاپنڈیا سرگرمیاں!“ شارق مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے بہت خوبصورت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ حالانکہ آپ کے محکمہ کے لوگ تو مجھے غنڈہ، قاتل، لٹیرا، درندہ، بھیڑیا اور نجائے کیا کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مجھے مجرم بنانے میں آپ ہی کے محکمہ کے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اگر شروع میں میری بات پر توجہ دے جاتی، مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا، تو آج شارق قاتل، لٹیرا اور سمگلر نہ ہوتا۔ ہو سکتا ہے“

آپ کی طرح کسی ایسی سیٹ پر بیٹھا ہوتا کہ اپنے لوگوں کی خدمت کرتا لیکن۔۔۔“

”مجھے سب معلوم ہے۔“ ایس پی الطاف علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے تمہاری پورڈ ہسٹری کا علم ہے۔ ایک ایک بات جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے صرف تمہاری تصویر دیکھی تھی۔ آج تم سے پہلی ملاقات ہوئی ہے اور چند جملوں کے تبادلے سے ہی اندازہ لگا چکا ہوں کہ تمہارے اندر ایک اچھے آدمی چھپا ہوا ہے۔“

”میں نے اپنے اندر کے اس اچھے آدمی کو کبھی بھی مرنے نہیں دیا۔“ شارق نے جواب دیا۔

”اگر میرے اندر کا وہ اچھا آدمی مرچکا ہوتا تو آج شارق ایک بہت طوفان بن چکا ہوتا۔“

کچھ اڈوں کا علم تھا لیکن جب سے ہم میں دشمنی پھٹی ہے اس نے بہت سے اڈے تبدیل کر دیے ہیں۔ اپنے ذرائع سے ان اڈوں کا پتا لگا کر انہیں تباہ کر رہا ہوں۔ ہیروئن کے کچھ اڈے تو میں نے تباہ کر دیئے ہیں کچھ ابھی باقی ہیں۔ ان کا بھی جلد ہی سراغ لگا لوں گا۔ لیکن آج اسلحہ کے جس اڈے کا پتا چلا ہے اسے تباہ کر کے آس پاس کی آبادی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس لئے میں نے آپ کو اطلاع دی تھی۔ تاکہ ریڈ کر کے اس اسلحہ کے ذخیرے کو سرکاری تحویل میں لے لیا جائے اور میں ایک بات اور بھی بتا دیتا چاہتا ہوں۔“ شارق چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہ مت سمجھئے کہ میں یہ سب کچھ صرف قانون سے تعاون کے لئے کر رہا ہوں۔ حاجی کے خلاف اس کارروائی میں میرے انتقام کا جذبہ بھی شامل ہے۔ میں پاکستان سے باہر تھا اور میری عدم موجودگی میں حاجی نے میری ماں اور بہن کی توہین کی تھی۔ انہیں ذلیل کر کے کوٹھی سے نکال دیا تھا۔ ملک سے باہر مجھے حاجی ہی نے ایک سازش کے تحت بھیجا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے افغانستان میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور اس طرح اس کا راستہ صاف ہو جائے گا لیکن سب کچھ اس کی توقع کے برعکس ہوا۔ میں اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا جب تک وہ مکمل طور پر تباہ نہیں ہو جاتا۔“

”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ مریم نام کی وہ عورت تمہاری ماں نہیں ہے۔“ الطاف علی نے کہا۔

”یہ درست ہے کہ میں نے اس کی کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ لیکن اولاد کو جنم دینے والی عورت ہی تو ماں نہیں ہوتی۔“ شارق نے کہا۔ ”مریم نے مجھے جنم نہیں دیا لیکن اس نے مجھے ماں کی طرح پیار دیا۔ اس سے مجھے بھرپور ماسٹا ملی۔ اس نے میرے لئے وہ کچھ کیا جو کوئی عورت سنگی اولاد کے لئے بھی نہیں کر سکتی۔ اگر اولاد کیلئے خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو میں اس عورت کو سجدہ کرتا جس نے مجھے اولاد سے بڑھ کر پیار دیا۔ میں اس کی توہین کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ ساری کارروائیاں حاجی سے ذاتی انتقام لینے کے لئے کر رہے ہو۔“ الطاف علی نے کہا۔

”نہیں۔“ شارق نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”جب میں افغانستان میں تھا تو اس وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں غلط کر رہا ہوں۔ میں نے اسی وقت عہد کیا تھا کہ ہیروئن کے ذہ کو پھیننے سے روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میں نے افغانستان میں بھی ہیروئن کی کئی فیکٹریاں تباہ کر دیں اور یہاں آ کر بھی بہت کچھ کیا۔ منشیات کی سگنگ کے حوالے سے

”کیا تم جانتے ہو کہ تم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہو۔“ الطاف علی نے کہا۔ ”ایک طرف حاجی کے آدمی پورے شہر میں شکاری کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور دوسری طرف پولیس پوری شدت کے ساتھ تمہاری تلاش میں ہے۔“

”اور کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس وقت میں پولیس کے ایک اعلیٰ آفیسر کے ساتھ بیٹھا آزادی سے باتیں کر رہا ہوں۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ آج تم سے ملاقات کے لئے اکیلا آؤں گا اور کسی کو میری اور تمہاری ملاقات کا علم نہیں ہو گا لیکن۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے کل کو یہ صورتحال نہ ہو۔“

”اگر آپ جیسا ذمہ دار آفیسر مجھے گرفتار کر سکے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ شارق کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”میں پولیس کے تمام بڑے بڑے آفیسرز سے واقف ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کون سا آفیسر ذمہ دار اور فرض شناس ہے اور کون راشی اور بے ضمیر۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر آپ کو فون کیا تھا۔ یہ ایسا موقع ہے کہ آپ جیسے رتبے کا آفیسر پبلک جھپکنے کی دیرینہ کڑوڑ پتی بن سکتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر آپ کو اطلاع دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں آپ کے کہنے پر ملاقات کے لئے یہاں اس لئے بھی آ گیا کہ مجھے آپ کے وعدہ پر اعتماد تھا۔ میری گرفتاری ہر پولیس والے کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے گھبرنے کا پورا پورا بندوبست کر کے یہاں آتا لیکن اس کی حسرت کبھی پوری نہ ہو پاتی۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تمہاری گرفتاری کا بندوبست کر کے نہیں آیا؟“ ایس بی الطاف علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جس طرح آپ نے مجھے منڈب اور شریف قرار دیا تھا اس طرح میں بھی آپ کو بہت منڈب، شریف اور قابل اعتماد سمجھتا ہوں۔“ شارق نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ آپ اس وقت میرے دو آدمیوں کی زد پر ہیں۔ میرے یہ دو آدمی کم سے کم بجائے پولیس والوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس ڈپو پر بہت سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ آپ کو ریڈ کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہو گا۔ چھاپہ مار پارٹی میں شامل پولیس کے جوانوں کو آخر تک یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

”میں قریب ترین پولیس سٹیشن پر پہنچنے ہی ڈی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔ لیکن اگر یہ اطلاع غلط نکلی تو۔۔۔۔“ الطاف علی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی سبکی ہو گی نا؟“ شارق اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”ایسی صورت میں اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سمیت آپ کے حوالے کر دوں گا۔ یہ شارق کا وعدہ ہے۔“

”بہت اعتماد ہے اپنے آپ پر اور اپنے ساتھیوں پر۔“ الطاف نے کہا۔

”اپنے آپ پر اور ساتھیوں پر اعتماد ہی تو مجھے اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”تو پھر کب ریڈ کر رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔“

”صبح ہونے سے پہلے پہلے۔“ الطاف علی بولا۔ ”لیکن تمہارا آدمی کہاں ملے گا؟“

”میں اپنا آدمی ابھی آپ کے ساتھ بھیج سکتا ہوں، لیکن اس کی آزادی اور زندگی کی ضمانت آپ کو دینی ہو گی۔“ شارق بولا۔

”اگر ریڈ کے دوران فائرنگ کا تبادلہ ہو گیا اور اتفاقہ کسی گولی کا نشانہ نہ بن گیا تو وہ صبح تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔“ الطاف علی نے کہا۔

”اور اس کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔“ شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”یقین کرو۔ میں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔“ الطاف علی نے جواب دیا۔

”تو پھر آپ بیس رک کر انتظار کریں۔“ شارق نے کہا اور الطاف علی کو وہیں چھوڑ کر سڑک پر اس طرف چلنے لگا جہاں ٹینہ اور نو لکھا کی کار کھڑی تھی۔

”کیا ہوا؟ کوئی گزربو؟“ سٹیرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی ٹینہ نے اس کے قریب پہنچتے ہی پوچھا۔

”نہیں۔ کوئی گزربو نہیں ہے۔ وہ حسب وعدہ اکیلا ہی آیا ہے۔“ شارق نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں تو میرے ساتھ سزا میں کچھ رعایت برتی جائے گی۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نو لکھا بولا۔

”ظاہر ہے میں اس کا یہ مشورہ نہیں مان سکتا۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے معلوم ہے تم اور تمہارے ساتھی بہت بہادر ہیں۔“ الطاف علی نے کہا۔ ”لیکن میری خواہش ہے کہ تم یہ کانٹوں بھرا راستہ چھوڑ کر سیدھے راستے پر آ جاؤ۔ تم مجھ پر اعتماد کر کے یہاں آئے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا ساتھ دینے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر قانون کے حوالے کر دو۔ ہو سکتا ہے تمہاری سزا میں کچھ نرمی برتی جائے۔“

”مجھ پر کئی آدمیوں کے قتل کا الزام ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”یہ صرف الزام ہی نہیں۔ واقعی بہت سے آدمی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ میرے ہاتھ خون میں اس طرح رنگے ہوئے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی صابن ان دھبوں کو صاف نہیں کر سکتا۔ میں کسی کی گولی سے مرنا پسند کروں گا لیکن میرے قدم پھانسی کے تختے کی طرف نہیں جائیں گے۔“

”یہ تمہاری اپنی سوچ ہے۔“ الطاف علی بولا۔ ”میں تمہاری بات بہت اوپر تک پہنچاؤں گا۔ حاجی جیسے شخص کے خلاف تم جس طرح قانون سے تعاون کر رہے ہو یہ تمہارا بہت بڑا کریڈٹ ہے اور تمہارا یہی کریڈٹ تمہیں بچا سکتا ہے۔“

”یہ محض کہنے کی باتیں ہیں۔“ شارق بولا۔ ”میں کوئی سیاستدان نہیں ہوں جس کے خلاف قتل اور ملک سے غداری کے مقدمات بھی واپس لے لئے جائیں۔ جس روز میں پکڑا گیا لوگ میرے لئے سرعام پھانسی سے کم مطالبہ نہیں کریں گے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ الطاف علی نے کہا۔ ”رائے عامہ تمہارے حق میں ہے۔ لوگ تمہیں مظلوم اور بے گناہ سمجھتے ہیں۔ عوام کا دباؤ بہت اہمیت رکھتا ہے۔“

”سیاسی معاملات میں تو عوامی دباؤ کو کچھ اہمیت دی جا سکتی ہے لیکن ایک ایسے شخص کے لئے جو موت کے سوداگر کے نام سے مشہور ہو چکا ہو عوام کا دباؤ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عدالت کوئی فیصلہ عوام کے دباؤ کے تحت نہیں حقائق اور شواہد کی روشنی میں سناتی ہے۔ نہیں الطاف صاحب۔ میں آپ کا یہ مشورہ نہیں مان سکتا۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر الطاف علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ بات تو رہ گئی جس کے لئے ہماری یہ ملاقات ہوئی ہے۔“

”اس بات کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔“ الطاف علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”حاجی کا اسلحہ کا وہ ڈپو کہاں ہے؟“

”وہ سامنے آپ نمبر مارکیٹ دیکھ رہے ہیں۔“ شارق نے بڑھا راوی والے چوک کی طرف اشارہ کیا۔ اس چوک کے دوسری طرف سڑک پر بہت لمبی چوڑی نمبر مارکیٹ اور اس کے پیچھے رہائشی علاقہ تھا۔ ”وہ ڈپو اس نمبر مارکیٹ میں ہے۔ میں نے وہ ڈپو نہیں دیکھا لیکن میرا آدمی اس

کے لئے رک گئے ہوں گے۔ پریشان مت ہو۔ کوئی گزرب نہیں ہو گی میرے ساتھ آؤ۔“ وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار کی طرف چلے گئے۔ شارق الطاف علی کے پیچھے تھا کہ کوئی گزرب ہو تو اسے پستول کی زد میں لے سکے۔

اس پولیس پارٹی کا انچارج ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس نے اپنے ایس پی کو فوراً ہی پہنچان لیا اور کھٹ سے سیلوٹ جھاڑ دیا۔ ایک اے ایس آئی اور چار کانسٹیبلوں نے بھی ایزیاں بجا دی تھیں۔ ”کیا بات ہے آفسر؟“ ایس پی الطاف علی نے سوالیہ نگاہوں سے سب انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ”مٹکوک نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ ہے۔“ الطاف علی نے کہا۔ ”تم لوگ جاؤ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“

”یس سر۔“ سب انسپکٹر بولا اور باری باری نو لکھا اور شارق کی طرف دیکھنے لگا۔ شارق کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی تھی۔ ”تم لوگ تھانے پہنچ کر میرا انتظار کرو۔ میں چند منٹ میں آ رہا ہوں۔“ الطاف علی نے کہا۔ سب انسپکٹر اور اس کے ماتحتوں نے ایزیاں بجا دیں اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ دوسرے ہی لمحہ جیپ وہاں سے روانہ ہو گئی۔

الطاف علی ٹیمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹیمینہ کار سے اتر گئی تھی۔ اس نے بھی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

”پہلی بار تمہیں دیکھا ہے۔“ وہ ٹیمینہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا تھا کہ تم بہت خوفناک قسم کی عورت ہو گی لیکن۔۔۔۔۔“

”اس حسن ظن کا شکریہ۔“ ٹیمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ آئندہ میں آپ کو نظر نہیں آؤں گی۔ کیا پروگرام ہے شارق؟“ اس نے آخری الفاظ شارق کی طرف دیکھ کر کہے تھے۔

”ہم چل رہے ہیں۔“ شارق نے کہا اور پھر الطاف علی کی طرف مڑ کر بڑی گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور ٹیمینہ کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ٹیمینہ نے انجن شارت کیا اور کار کو ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھا کر یو ٹرن لیتے ہوئے اس کی رفتار بڑھا دی۔



گندے نالے سے تین لاشوں کی دریافت نے اس علاقے میں سنسنی اور خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔

یہ لاشیں دس سے بارہ سال کی عمر کے تین چار بچوں نے دریافت کی تھیں۔ یہ بچے اس

لیکن اسلحہ کے گودام کی نشاندہی کے لئے تمہیں ان کے ساتھ جانا پڑے گا نو لکھے۔ میں نے ایس پی الطاف علی سے ضمانت لے لی ہے کہ تمہیں نہ تو کوئی نقصان پہنچایا جائے اور نہ ہی واپسی پر تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ کیا خیال ہے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے شارق باؤ۔“ نو لکھا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ تم کوئی بات کہو میں انکار کر دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چلو میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

”تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ شارق نے ٹیمینہ سے کہا اور نو لکھا کو ساتھ لے کر الطاف علی کے پاس آ گیا۔

نو لکھا اس وقت بھی ملنگ کے بھیس میں تھا۔ ہرے رنگ کا چونہ نما کرتا جو ٹخنوں تک لمبا تھا گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی کئی ملائیں تھیں۔ سر کے بال الجھے ہوئے اور دونوں کلائیوں میں اسٹیل کے کڑے تھے۔ جب وہ دونوں ہاتھوں کو حرکت دیتا تو آہنی کڑے آپس میں ٹکرا کر جھنجھٹا اٹھتے۔

”ایس پی الطاف علی چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر شارق کی طرف رخ کر کے بولا۔

”کیا یہی شخص ہماری رہنمائی کرے گا؟“

”ہاں۔“ شارق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اور اسے صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اسی طرح سنگل پیس میں میرے پاس واپس پہنچ جانا چاہئے۔“

”ایسا ہی ہو گا۔“ الطاف علی نے جواب دیا۔

وہ ابھی باتیں کر رہی تھے کہ کار کے ہارن کی آواز سن کر شارق نے اس طرف دیکھا اور چونک گیا۔ ٹیمینہ کی کار کے قریب پولیس کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ بڑک پر سے گزرنے والی بسوں کے ہیڈ لمپس کی روشنی میں تین چار مسلح پولیس والے بھی کار کو گھیرے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ شارق کا ہاتھ فوراً ہی پتلون کی جیب میں پہنچ گیا۔ نو لکھا نے بھی چونے کی سائیڈ والی جیب میں ہاتھ ڈال لیا تھا۔ ایس پی الطاف علی نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا پھر بولا۔

”کار میں کون ہے؟“

”میری دوست ٹیمینہ۔ اگر کوئی گزرب ہوئی تو تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

”الطاف علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔

”میرا خیال ہے وہ کوئی پٹرولنگ پارٹی ہے۔ اکیلی عورت کو کار میں بیٹھے دیکھ کر چپک کرنے

پانچ چھ جھگیاں تھیں جن میں مسلی رہائش پذیر تھے۔ یہ لوگ کانڈ، تنکوں اور مٹی کے کھلونے باکرہ شرم میں بیچتے تھے۔ اس وقت جھگیوں میں چند عورتیں اور دو آدمی تھے۔ وہ دونوں آدمی ایک روز پہلے کا تیار کیا ہوا مال بیچنے کے لئے جانے کی تیاری کر رہے تھے جبکہ عورتیں نیا مال تیار کر رہی تھیں۔

بچوں سے نالے میں لاش کی اطلاع پا کر وہ دونوں آدمی پل کی طرف آگئے۔ دو تین عورتیں بھی ان کے پیچھے چلی آئی تھیں۔ انہوں نے بھی لاش دیکھی۔

”تھانے جا کر بتا دو۔ پتہ نہیں کون نصیبوں مارا ہے۔“ ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

”ایسا نہ ہو پولیس والے ہمیں ہی تھانے میں بٹھالیں۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”تمہیں کیوں بٹھالیں گے۔ کوئی تم نے پھینکی ہے یہ لاش؟“ بوڑھی عورت نے کہا۔ ”جاؤ۔ تم دونوں تھانے چلے جاؤ۔“

وہ دونوں آدمی ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔ ان میں ایک نوجوان تھا اور دوسرا ادھیڑ لڑا اور پھر وہ دونوں تھانے کی طرف چل پڑے۔

وہ پولیس کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئے تھے۔ اس دوران پل پر دس بارہ آدمی نچ ہو چکے تھے اور پہلی لاش کے ساتھ ایک اور لاش بھی دریافت ہو چکی تھی۔

پولیس والوں نے اس مسلی نوجوان کو نالے میں اتار دیا جو تھانے اطلاع دینے گیا تھا۔ اس نے پل کی سطح پر جمع شدہ جھاڑیوں کو ہٹایا تو ان میں چھپی ہوئی تیسری لاش بھی دریافت ہو گئی۔

بڑی مشکل سے ان تینوں لاشوں کو پانی سے نکال کر پل پر ڈال دیا گیا۔ وہ مسلی نوجوان گندے پانی میں تیرتے ہوئے جھاڑیوں کو ہٹاتا رہا لیکن اور کوئی لاش نہیں ملی۔

تھانے سے آنے والی پولیس پارٹی تین آدمیوں پر مشتمل تھی۔ دو کانٹیل اور ایک ہیڈ کانٹیل۔ تین لاشوں کی دریافت نے ہیڈ کانٹیل کا دماغ گھما دیا۔ اس نے فوراً ہی ایک کانٹیل تھانے کی طرف دوڑا دیا۔

گندے نالے سے لاشوں کی دریافت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ لوگ پل کے آس پاس جمع ہونے لگے۔ دونوں پولیس والے لوگوں کو پل سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک سب انسپکٹر مزید پولیس اہلکاروں کو لے کر پہنچ گیا۔ سب انسپکٹر ان لاشوں کا معائنہ کرنے لگا۔ تینوں لاشوں پر ایسے نشانات تھے جیسے مرنے سے پہلے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ تینوں کے سروں پر گولیوں کے نشان تھے۔ جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا

گندے نالے کی طرف آباد چند جھگیوں میں رہائش پذیر تھے۔ دو تین روز پہلے کی شدید بارش سے نالہ پانی سے بھر گیا تھا۔ بعض مقامات پر تو پانی نالے کے کناروں سے بھی باہر بہ نکلا تھا۔ لیکن اس مقام پر پانی نالے کے اندر اپنی حد میں رہ کر بہ رہا تھا۔ اس جگہ نالے کے دونوں طرف کی آبادیوں کو ملانے کے لئے ایک پل بھی تھا۔ لیکن یہ پل قیام پاکستان سے پہلے بنا تھا اور جگہ جگہ سے ٹوٹ جانے کے باعث بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی مرمت کرنے کے بجائے اس سے تقریباً پانچ سو گز نیچے کی طرف ایک نیا پل بنا دیا گیا تھا۔ اور ٹریفک کی آمد و رفت اسی نئے پل سے تھی۔ یہ پرانا پل اگرچہ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا لیکن پیدل اور سائیکل سواروں کی آمد و رفت کے لئے اب بھی زیر استعمال تھا۔

جھگیوں میں رہنے والے دو تنگ دھڑنگ بچے کھیتے ہوئے پل پر آگئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں لمبی لمبی چھڑیاں تھیں اور وہ لوگ پل کی شکستہ ریٹنگ پر جھکے ان چھڑیوں سے پانی میں بہہ کر آنے والی چیزوں کو چھیڑ رہے تھے۔

نالے کے گندے پانی میں جھاڑ جھنکار اور ہر قسم کی چیزیں بہہ کر آ رہی تھیں۔ یہ پل نیچے سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے بہہ کر آنے والی جھاڑیاں وغیرہ پل سے انک کر رک گئی تھیں۔ پانی کے اخراج میں تو کوئی فرق نہیں آیا لیکن پانی کی سطح پر جھاڑیاں دور تک جمع ہو گئی تھیں۔

ایک گیارہ سال کی عمر کا بچہ ریٹنگ پر جھکا ہاتھ میں کڑی ہوئی چھڑی سے جھاڑیاں ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ سے وہ چند جھاڑیاں ہٹانے میں کامیاب ہو گیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ چونک گیا اور گہری نظروں سے جھاڑیوں میں چھنی ہوئی اس چیز کو دیکھنے لگا جس نے اس کی تمام توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔

وہ ایک انسانی پیر تھا جو ننھے ننھے نظر آ رہا تھا۔ وہ بچہ ریٹنگ پر کچھ اور آگے جبک کر جھاڑیوں کو ہٹانے لگا۔ اس کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ جھاڑیاں ہٹتے ہی پانی میں ڈوبی ہوئی ایک انسانی لاش اوپر آگئی۔ لاش دیکھ کر اس بچے کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

دوسرے بچے بھی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے اپنی اپنی چھڑیوں سے پانی میں بہہ کر آنے والی چیزوں کو ادھر ادھر کر رہے تھے۔ چیخ سن کر وہ اپنے اس ساتھی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”لاش۔۔۔۔۔“ وہ بچہ چیخ رہا تھا۔ ”یہ دیکھو لاش۔۔۔۔۔“

لاش اوندھی تھی۔ اس کا چہرہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بچے کچھ دیر تک لاش کو دیکھتے رہے پھر شور مچاتے ہوئے جھگیوں کی طرف دوڑے۔

کی پیٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کا ایک گیٹ مین روڈ کی طرف تھا اور دوسرا اس گلی میں جو
 بے نالے تک چلی گئی تھی۔ اس کے سامنے والی کوٹھی کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان
 بڑی کوٹھیوں کے پچھواڑے گندے نالے کی طرف تھے۔

پہلی مرتبہ بیل بجانے پر کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دوسری مرتبہ بٹن دیا دیا۔ اس کے پی ہی دیر بعد برآمدے میں ایک حسین عورت دکھائی دی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑی رہی پھر مدھ سے اتر کر مکتی ہوئی گیٹ کی طرف آگئی اور ذیلی دروازہ کھول دیا۔

”بسم اللہ۔۔۔۔۔ جی آیائے نون۔“ وہ سب اسپیکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ سب اسپیکر وحید لڑا رہا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ اس کا تعلق تیسری جنس سے تھا۔ وہ پری چہرہ تھا۔

”یہاں فاروق احمد صاحب رہتے ہیں، کیا وہ گھر پر ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“ سب ہلنے لگے۔

”صاحب تو گھر پر نہیں ہیں جی۔ میں بیگم صاحبہ کو بھیجتی ہوں۔“ پری چہرہ نے کہا اور جواب انتظار کرتے بغیر اندر چلا گیا۔

تقریباً "تین منٹ بعد رعنا باہر آئی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا خوف تھا۔ اور وہ اپنی کیفیت کو بانے کی کوشش کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

سب انسپکٹر وحید اس سے سوالات کرتا رہا اور رعنا رک رک کر جواب دیتی رہی۔ اس کے بے میں بھی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

انپکڑ وحید تقریباً "دس منٹ تک اس سے سوالات کرتا رہا پھر شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آگے والی کوٹھی کی بیل بجا رہا تھا۔

○○○

حاجی عبد اللہ کے لئے گندے نالے سے لاشوں کی دریافت والی خبر ہم دھماکے سے کم ثابت ہوئی تھی۔

یہ خبر اسے صبح دس بجے کے قریب ملی تھی۔ دراصل پری چرو گھر کا سودا لینے کے لئے لڑکٹ گیا تھا۔ اس نے یہ خبر راکٹ ہی میں سنی تھی۔ اس کی فطرت میں جتنس تھا۔ جتنس تیری نفس کا خلاصہ ہوتا ہے۔ یہ خبر سن کر وہ اپنے آپ کو زوک نہیں سکا تھا۔ وہ ایک آدمی کے ساتھ نفس کرتا ہوا گندے نالے کے بل پر پہنچ گیا۔

بل کے آس پاس بہت رش تھا۔ پولیس پہنچ چکی تھی اور دو پولیس والے لوگوں کو دور رکھنے
 نا کو شش کر رہے تھے۔ پری چہرہ لوگوں کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک پولیس والے نے

کہ ان تینوں کو تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد سروں میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ انسپکٹر کو یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ لاشیں چند گھنٹوں سے زیادہ پرانی نہیں تھیں اور انہیں گزشتہ روز ہی نالے میں پھینکا گیا تھا۔ اگر لاشیں زیادہ پرانی ہوتیں تو پھول کر خراب ہو چکی ہوتیں۔ ان تینوں کے لباس کی تلاشی بھی لی گئی تھی لیکن ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جو ان میں سے کسی کی شناخت ہو سکتی۔

ابتدائی کارروائی کے بعد ایسولینس منگوا کر تینوں لاشوں کو پہلے تھانے اور پھر ہسپتال بھجوا گیا۔ لاشیں اٹھوائے جانے کے بعد بھی لوگ پل کے پاس جمع ہوتے رہے۔

اس خبر سے پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ لوگ ادھر ادھر ٹولیوں میں کھڑے اپنے طور پر تبصرے کر رہے تھے۔

پولیس شیشن پر ایس اچ او انسپکٹر گل محمد اپنے سینئر ماتحتوں سے اس صورتحال پر تبادلہ خیال کر رہا تھا اور پھر اس نے یہ کیس سب انسپکٹر وحید کے حوالے کر دیا۔

تم تالے کے ساتھ ساتھ اوپر تک کا علاقہ چیک کرو۔ ان تیلوں کو تشدد کے بعد سروں میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لاشیں کہیں اور سے لا کر تالے میں پھینکی گئی ہوں لیکن تمہیں معلوم کرنا ہے کہ اس علاقے میں کہیں فائرنگ کی آواز تو نہیں سنی گئی۔“ انسپٹر گامحمد نے سب انسپٹر وحید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یس سر۔“ سب انکسپر و حید نے کہا اور دو ماتحتوں کو لے کر تحقیقات کے لئے روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے وہ اس یل پر پہنچا تھا جہاں سے لاشیں دریافت ہوئی تھیں۔ جگہوں میں ر۔

والوں کے ایک بار پھر بیانات لئے اور پھر سب انسپکٹر وحید دائیں کنارے پر بڑی بڑی کوشیوں اٹالے کے درمیان تک سی جگہ پر چلنے لگا۔

تقریباً نصف میل آگے اس نالے پر ایک اور پل تھا۔ اس پل میں بھی پانی میں بہہ کر آئی والی جھاڑیاں وغیرہ جمع تھیں۔ سب انسپکٹر وحید کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ تینوں لاشیں اس پل سے آگے کسی جگہ سے نالے میں پھینکی گئی تھیں۔ اگر اس پل سے پھینکی گئی ہوتیں تو آگے جانے کے بجائے اسی جگہ پر پھنس جاتیں۔

سب انپکٹر نے سرے والی کوٹھی سے معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ وہ چھ کوٹھیلوں چیک کر چکا تھا۔ ان کوٹھیوں کے کینوں میں سے کسی نے گزشتہ رات فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی اور نہ ہی کسی کے چپخنے کی آواز سنائی دی تھی۔

اس وقت وہ ساتویں کونٹھی کی بیل بجا رہا تھا۔ گیٹ کے ساتھ پلر پر فاروق احمد راجپوت

اسے روکنا چاہا تو وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

”کیا ہے رے۔ اگر میں وہ لاشیں دیکھ لوں گی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔“

”چل جا۔۔۔۔۔ جلدی سے دیکھ کر آ جا۔“ کانسیبل بولا۔ ”اگر ہمارے انچارج صاحب دیکھ لیا تو تجھے ہی لیجا کر حوالات میں بند کر دے گا۔“

”ارے وہ مجھے کیا بند کرے گا۔ میں ہی اسے بند کر دوں گی۔“ پری چہرہ کو لمبے منکھٹا، آگے بڑھ گیا۔

تینوں لاشیں بل پر ساتھ ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کانسیبل بھی قریب ہی کھڑا تھا۔ لاشوں کو دیکھ کر پری چرو کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا تھا۔ اس نے لاشوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہ تینوں آدمی تھے جنہیں بارش والے روز حاجی اور اس کے ساتھی رسیوں سے باندھ کر لائے تھے۔ ”ہائے اللہ! وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”مر گئے یہ۔۔۔۔۔“

”کیا تم سمجھتے ہو یہ زندہ ہیں اور یہاں لیٹے آرام کر رہے ہیں۔“ پولیس کانسیبل نے اے گھورا۔ ”جانتے ہو انہیں۔ کون ہیں یہ؟“

”مم۔۔۔۔ مجھے کیا معلوم یہ کون ہیں۔“ پری چہرہ ہکا کر بولا۔ ”مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ یہ مر گئے۔ انسان بھی کیا ہے۔ پانی کا بلبلہ۔“

”اچھا۔ اب باتیں نہ بنا اور بھاگ جا یہاں سے۔“ کانٹیل نے کہا۔
 پری چہرہ نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو لیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹوکرے، تھمرا

دوسرے ہاتھ سے گل پیٹتا اور بڑبڑاتا ہوا لوگوں کو ادھر ادھر پھٹاتا ہوا واپس چلنے لگا۔ لوگ لے جھیز رہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو پری چہرہ ان کی ماں بسن ایک کر دیتا۔ مگر اس وقت وہ خاموش سے سب کچھ برداشت کر گیا۔

سڑک پر آکر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دل میں عیب سا خوف سا گھیا تھا اور اس کی ٹانگیں کلب رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے چلا رہا تھا۔ اسے گھر

بچنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ٹوکری ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی اور رعنا کی تلاش میں پہلے کچن میں جھانکا۔ اسے وہاں نہ پا کر وہ کمرے کی طرف لپکا۔

اتفاق سے اس وقت ہال کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ورنہ اس کی بدحواسی اور چہرے کا خون دیکھ کر ضرور چونکتا۔

رعنا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ پری چہرہ نے ہینڈل گھمایا مگر دروازہ اندر سے لاک تھا۔ انہ نے زور سے دروازے پر ہاتھ مارا تو اندر سے رعنا کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”میں ہو رہتا تھا۔ جلدی سے دروازہ کھول۔“ پری چہرہ نے کہا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے کی ہنسنے اور ہینڈل گھومنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ چند انچ سے زیادہ نہیں کھلا تھا۔ رعنا بے کے پیچھے تھی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”رک جاؤ ذرا میں اس وقت کپڑے بدل رہی“

”ارے مجھ سے کیا پردہ رعنا آپ۔ مجھے اندر آنے دو۔ غضب ہو گیا۔ ان تینوں کی لاشیں ملی
پری چہرہ نے کہا اور ہاتھ سے دروازے پر دباؤ ڈالنے لگا۔

رعنا نے پیچھے ہٹتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور پری چہرہ کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے ہند کر کے لاک کی تاب چڑھا دی۔

”ایسا ہوا۔ کن کی لاشیں ملی ہیں؟“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے پری چہرہ کی طرف دیکھا۔
 ”ارے وہی تینوں۔ جنہیں یہ لوگ بارش والے دن رسیوں سے باندھ کر لائے تھے۔“ پری
 نے بتایا۔

رشنا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس کا دل اس شدت سے دھڑک اٹھا جیسے ہڈیوں کا بنجر توڑ کر باہر نکلے گا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ت----- تمہیں کیسے پتا چلا۔۔۔۔۔ کہاں سے ملی ہیں وہ لاشیں؟“ رعنا نے اپنی اندرونی ناپر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”اوسھر آگے۔ گندے نالے کے پل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ پولیس نے وہ لاشیں نالے سے ہٹائیں۔“ پری چہرہ نہ بتایا۔

”وہی تھے یا کوئی اور؟“ رعنا نے پوچھا۔
 ”وہی تینوں تھے۔ میں نے قریب سے ان کی لاشیں دیکھی ہیں۔“ پری چہرہ نے جواب دیا اور

دل لی خاموشی کے بعد بولا۔ ”یہ حاجی اور اس کے ساتھی بہت خطرناک لوگ ہیں۔ انہیں سے نکال دو یہاں سے۔“

”یہ تو تم نے بڑی خوفناک خبر سنائی ہے۔“ رعنا قمیض پہنچتے ہوئے بول۔ ”تم نے کسی کو بتایا تو کہ وہ کون لوگ تھے؟“

”میں رونا آپا۔ میں اتنی بیوقوف تو نہیں ہوں۔“ پری چہرہ نے کہا۔ ”اگر میں بتا دیتی تو والے مجھے ہی پکڑ کر لے جاتے۔“

اس نے پچھلے دو دن سے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ وہ جب بھی عرفان کے سامنے آتی وہ اسے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگتا۔ کبھی موقع پا کر وہ ایک آدھ چبھتا ہوا ذومنی جملہ بھی کہہ دیتا تھا اور اس وقت بھی اس نے کچھ ایسے ہی الفاظ کہے تھے کہ وہ تملتا کر رہ گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کے سامنے بہت کم آتی تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ جب حاجی وغیرہ یہاں آئے تھے تو اس نے بڑے شوق سے ان کے لئے کھانے وغیرہ تیار کئے تھے لیکن اب اس نے گھر کا سارا کام پری چہرہ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ لوگ پری چہرہ کو بھی چھڑتے رہتے تھے اور پری چہرہ بھی ان سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

رعنا اپنے شوہر فاروق کو فون کرنے کے لئے اپنے کمرے سے نکلی تھی لیکن ان دونوں کو یہاں بیٹھے دیکھ کر اس نے فون کرنے کا ارادہ بدل دیا۔ کچھ دیر میز کے پاس کھڑی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ فاروق احمد صبح آٹھ بجے کے قریب دفتر گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ بارہ بجے تک واپس آ جائے گا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ فاروق جلدی واپس آ جائے۔

”یہ تازہ صورتحال نہایت سنگین تھی۔ اس رات وہ جان گئی تھی کہ ان تینوں کو تمہ خانے میں قتل کر دیا گیا تھا اور ان کی لاشیں بھی اس کے سامنے ہی یہ خانے سے نکال کر کوٹھی کے عقب میں گندے نالے میں پھینک دی گئی تھیں اور اب وہ لاشیں مل گئی تھیں۔ رعنا تو یہ سوچ کر ہی کانپ رہی تھی کہ اگر پولیس ان لاشوں کے بارے میں تحقیقات کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی تو حاجی وغیرہ تو شاید فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں لیکن وہ لوگ دھر لئے جائیں گے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب فاروق آگیا۔ وہ شاید کچھ دیر بال کمرے میں رکھا تھا پھر رعنا کے کمرے میں آگیا۔ رعنا اس وقت بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ گئی اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

”کیا بات ہے رعنا۔“ فاروق اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”تم کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہی ہو۔ کوئی گڑبڑ؟“

”میری پریشانی کیا کم تھی کہ حاجی جیسے خطرناک لوگ ہمارے گھر موجود ہیں۔“ رعنا بولی۔ ”نتی پریشانی یہ ہے کہ وہ تینوں لاشیں پولیس کو مل گئی ہیں۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ فاروق احمد اچھل پڑا۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“

”پری چہرہ نے۔“ رعنا نے جواب دیا۔ ”وہ لاشیں دیکھ کر آیا ہے۔“

”کیا حاجی وغیرہ کو پتہ چل گیا ہے؟“ فاروق نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ میں نے پری چہرہ کو منع کر دیا تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے انہیں نہ

”تم نے پہلی بار زندگی میں عقل سے کام لیا ہے۔ یہاں بھی ابھی زبان بند ہی رکھنا۔ فار اس وقت دفتر گئے ہوئے ہیں۔ میں فون کر کے انہیں بلاتی ہوں۔“

رعنا نے اپنے کپڑے درست کئے۔ بالوں میں کنگھا کیا اور دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ چہرہ بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکلا تھا۔

رب نواز اور عرفان اس وقت ہال کمرے میں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ وہ جس سے یہاں آئے تھے ان میں سے کوئی بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ گھر سے باہر نکلنا تو کجا وہ تو برآمدے میں نہیں آئے تھے۔

رعنا ٹیلی فون کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی اور ڈائینگ ٹیبل پر رکھی ہوئی نوکری سے نکال نکال کر دیکھنے لگی۔ گوشت اور سبزی وغیرہ تھی۔ پری چہرہ بھی قریب کھڑا کن اکھینوں۔ عرفان اور رب نواز کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اوے پری چہرہ۔“ عرفان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یار چائے تو پلا دو۔“ پیاس لگ رہی ہے۔

”پیاس لگ رہی ہے تو ٹھنڈا پانی پو۔ چائے سے پیاس تو نہیں بجھتی۔“ پری چہرہ نے کہا۔ ”پیاس تو پانی سے بھی نہیں بجھتی۔“ عرفان نے ہنستے ہوئے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جب سے یہاں آئے ہیں پیاس بڑھتی جا رہی ہے۔ اچھا تم چائے تو بنا کر لاؤ۔“ ”تھوڑی دیر بعد بناؤں گی چائے۔ ابھی نہیں ملے گی۔“ پری چہرہ نے کہا۔

”یار بنا دو نا۔۔۔۔۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔“ عرفان بولا۔ ”بنا دو نا انہیں چائے۔ کیوں بحث کر رہے ہو۔“ رعنا نے پری چہرہ کو گھورتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔

”وہ اپنے پاجی اور دلاور سے بھی پوچھ لو۔ میں دوبارہ نہیں بناؤں گی۔“ پری چہرہ نے کہا۔ ”اوے۔ کیا کیا تم نے۔“ عرفان کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”اگر حاجی صاحب نے لیا تو تمہاری گردن اڑا دیں گے۔“

”میں نے کیا کہا ہے تمہارے حاجی کو۔“ پری چہرہ بولا۔ ”پاجی تو کہا ہے۔ بڑے بھائی کہتے ہیں۔“

”بنالے۔“ عرفان بولا۔ ”ان کے لئے بھی بنالے۔ چل جلدی کر۔“

پری چہرہ انہیں گھورتا ہوا کچن میں گھس گیا۔ رعنا میز کے پاس کھڑی نوکری سے نکال کر ٹرے میں رکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ عرفان اسے گھور رہا ہے۔

بتائے۔“ رعنا نے کہا۔

نہیں نکلو گے۔“

”آئے ہائے۔“ پری چہرہ مخصوص لمبے میں بولا۔ ”میں نے کیا جرم کیا ہے جو چھپ کر بیٹھا رہوں۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

آوازیں سن کر عرفان اور رب نواز بھی اندر آ گئے تھے۔ حاجی ان پر برس پڑا۔ وہ عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

”دیکھا۔ دیکھ لیا تم نے۔۔۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ انہیں یہ خانے کا فرش کھود کر دفن کر دو۔ مگر تم نے ہی کہا تھا کہ لاشوں کو نالے میں پھینک دیں۔ وہ پانی میں بہتی ہوئی دور چلی جائیں گی۔ مگر وہ تینوں لاشیں پل میں پھنس گئیں۔ اب پولیس نالے کے ساتھ ساتھ کوٹھیوں میں آ کر تحقیق ضرور کرے گی۔ اگر پولیس یہاں آگئی تو کیا کرو گے؟“

”ہمیں کیا معلوم تھا حاجی جی کہ لاشیں پل میں پھنس جائیں گی۔“ عرفان نے کہا۔ ”مگر آپ فکر نہ کریں جی۔ پولیس یہاں آ بھی گئی تو وہ آپ تک یا ہم تک نہیں پہنچ سکے گی۔“

”اب یہ جگہ ہمارے لئے خطرناک ہو گئی ہے۔“ حاجی بولا۔ ”ایک طرف پولیس اور دوسری طرف کم بخت ثینہ اور شارق۔۔۔۔۔ پولیس اگر اپنے طور پر یہاں تک نہ بھی پہنچی تو ان کی طرف سے خطرہ موجود ہے۔ وہ کم بخت کسی بھی وقت پولیس کو یہاں ہماری موجودگی کی اطلاع دے سکتے ہیں۔“

”مگر آپ نے کہا تھا کہ ثینہ اور شارق بہت اصول پرست ہیں۔ وہ پولیس کو ہمارے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“ عرفان نے کہا۔

”اوئے کسی کے دین ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں۔“ حاجی بولا۔ ”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اگر وہ پولیس کو اطلاع دے بھی دیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیں گے۔“

”تو اب کیا کیا جائے حاجی جی۔“ عرفان بولا۔

”تم رب نواز کو لے کر شادی پور چلے جاؤ۔ وہاں کرامت سے مل کر کہو کہ یہاں اگر گڑبڑ ہوئی تو ہو سکتا ہے ہم آج رات ہی اس کے پاس آجائیں۔ ہمارے لئے سارا بندوبست کر کے رکھو۔“ حاجی نے کہا۔

”ٹھیک ہے جی۔ ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔“ عرفان نے کہا۔
تھوڑی ہی دیر بعد دونوں کوٹھی سے نکل گئے۔ اتفاق سے کوٹھی سے نکلتے ہی انہیں ایک رکشہ مل گیا۔ رکشہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور ڈرائیور کچھلی سیٹ پر ہانگیں پارے بیٹھا ہوا تھا۔

”میں ابھی حاجی سے بات کرتا ہوں۔“ فاروق بولا۔ ”اس شخص کی وجہ سے ہم عجیب مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اگر پولیس یہاں تک پہنچ گئی تو ہم ہی قتل کے الزام میں دھر لے جائیں گے۔“

”خدا کے لئے انہیں یہاں سے نکالو۔“ رعنا بولی۔ ”اس طرح بات کرو کہ یہ لوگ خود یہاں سے دفعان ہو جائیں۔ ان کی وجہ سے تو ہر وقت میری جان سولی پر لٹکی رہتی ہے۔“
”دیکھو۔ میں حاجی سے بات کرتا ہوں۔“ فاروق کہتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
عرفان اور رب نواز اب بھی ہال ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فاروق حاجی والے کمرے میں گیا۔ حاجی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور دلاور اس کے پیر دبا رہا تھا۔

”بڑا غضب ہو گیا حاجی صاحب۔“ فاروق بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔
”آج کل میں ہر قسم کی بری خبریں سننے کے لئے تیار ہوں، نئی خبر کیا ہے؟“ حاجی نے پُر سکون لمبے میں پوچھا۔

”نئی خبر یہ ہے کہ پولیس کو ان تینوں کی لاشیں یہاں سے چند گز آگے نالے کے پرانے پل میں پھنسی ہوئی مل گئی ہیں۔“ فاروق نے بتایا۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“ حاجی اچھل کر بیٹھ گیا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“
”صبح پری چہرہ سودا لینے کے لئے گیا تھا تو اسے پتا چلا تھا۔ اس نے لاشیں بھی دیکھی تھیں۔

اس نے رعنا کو بتا دیا تھا اور رعنا میرے انتظار میں خاموش بیٹھی رہی تھی۔“
یہ خبر حاجی کے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس نے پری چہرہ کو بلایا اور اس سے تفصیل معلوم کرنے لگا۔ آخر میں وہ بولا۔

”تم نے کسی کو کچھ بتایا تو نہیں کہ وہ کون ہیں۔“
”میں تمہاری طرح بیوقوف تو نہیں ہوں۔“ پری چہرہ نے تڑ سے جواب دیا۔

حاجی اچھل پڑا۔ ”اوئے۔ مجھے بے وقوف کہتا ہے جس نے ساری دنیا کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ زبان سنبھال کر بات کیا کر مجھ سے ورنہ زبان کھینچ لوں گا۔“

”دنیا کو مٹھی میں لے رکھا ہے!“ پری چہرہ طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔ ”خود تو چھپ کر یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ اتنا بھادر ہے تو جا کر پولیس کو بتا دے تاکہ وہ تینوں کون تھے اور تم انہیں رسیوں میں باندھ کر کہاں سے لائے تھے۔“

”بند کر زبان اپنی۔“ حاجی غریبا۔ ”اور دفع ہو جا یہاں سے اور سنو۔ تم اب کوٹھی سے باہر

خاصہ پریشان تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے سوچا بھی تھا کہ حاجی سے شکایت کرے لیکن پھر خاموش ہی رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد رعنا پھر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ پری چہرہ کام میں مصروف رہا۔

پانچ بجے کے قریب کال بیل کی آواز سنائی دی۔ پری چہرہ اس وقت ہال میں اکیلا تھا۔ بیل کی آواز سن کر وہ باہر نکل آیا۔ گیٹ کھول کر جیسے ہی پولیس والوں پر نظر پڑی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ سب انسپکٹر سے مختصر سی بات کرنے کے بعد وہ اندر آ گیا۔

کال بیل کی آواز سن کر حاجی اور فاروق ہال کمرے میں آ گئے تھے۔ پری چہرہ نے پولیس کے بارے میں بتایا تو حاجی جلدی سے بولا۔

”تم باہر نہیں جاؤ گے۔ رعنا کو بھیجو۔“

فاروق ایک لمحہ کو الجھن میں مبتلا رہا پھر کمرے میں آ گیا اور رعنا کو پولیس کے بارے میں بتانے لگا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ فاروق نے کہا۔ ”وہ شاید ان لاشوں کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ مختصر بات کرنا اور اپنے حواس پر قابو رکھنا۔“

پولیس کا سن کر رعنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے میں اسے ایک منٹ لگا اور پھر وہ گیٹ پر آ گئی۔

وہ تقریباً دس منٹ تک پولیس آفیسر سے باتیں کرتی رہی اس کے دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی اور وہ بہت محتاط انداز میں پولیس آفیسر کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔

رعنا نے اندر آ کر سب کچھ بتا دیا۔ حاجی کے چہرے پر طمانیت سی آگئی تھی۔

”چلو۔۔۔ بلا ٹلی۔“ وہ بڑبڑایا۔

”پولیس والے آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے حاجی صاحب۔“ فاروق نے کہا۔ ”وہ اس طرح آسانی سے تحقیقات ختم نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے وہ دوبارہ آئیں اور اگر انہیں شبہ ہو گیا تو وہ کوٹھی کے اندر بھی آ سکتے ہیں۔“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ حاجی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

حاجی مطمئن ہو گیا تھا لیکن فاروق کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر

ادھر کوٹھی میں حاجی فاروق احمد سے بحث کر رہا تھا۔ فاروق اس بات پر خوف زدہ تھا کہ اگر پولیس اس کوٹھی تک پہنچ گئی تو وہ بھی مارے جائیں گے۔

”یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ ہم جیسے لوگوں سے دوستی بعض اوقات کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“ حاجی نے کہا۔ ”لیکن اس وقت تو تمہارے ذہن میں کچھ اور تھا۔ حاجی سونے کی چیزیاں تھا۔ مجھ سے لمبی لمبی رقیں لیتے ہوئے تم نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ رقیں تمہارے گلے کا پھندا بھی بن سکتی ہیں اور جب میں نے تمہاری بیوی کو ڈائمنڈ کا سیٹ دیا تھا تو تم دونوں کتنے خوش تھے اور اب کیوں مرے جا رہے ہو۔ مجھ سے دوستی کی ہے تو جگہ بھی رکھو۔ بزدل مت بنو۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔“

میں تو بزدل نہیں ہوں حاجی صاحب لیکن رعنا۔ آپ جانتے ہیں عورتوں کا دل کتنا چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ ڈر رہی ہے۔“ فاروق نے کہا۔

”لوئے ٹینہ بھی تو عورت ہے۔“ حاجی بولا۔ ”اسے دیکھو۔ اس نے ساری دنیا کو نچا رکھا ہے۔ اپنی بیوی کو سمجھاؤ۔ کچھ نہیں ہو گا اسے۔“

”میرا خیال ہے رعنا اور پری چہرہ کو گاؤں بھیج دوں۔“ فاروق بولا۔

”بالکل نہیں۔“ حاجی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”گاؤں جا کر وہ دونوں اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکیں گے اور تمہارا یہ جو کھسرا ہے نا۔ اس سے مجھے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ یہ قوم بڑی خطرناک ہوتی ہے جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا باہر جانا کم کر دو۔ اور تم ڈر مت۔ حاجی اپنے وفاداروں کو فراموش نہیں کرتا۔ یہ گڑبڑ ختم ہو لینے دو میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ ساری تکلیفیں بھول جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے حلٹی جی۔“ فاروق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”وہی کروں گا جو آپ کہتے ہیں۔“

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ رعنا بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”کیا کہتا ہے وہ؟“ رعنا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ آج رات کو یہاں سے چلے جائیں گے۔“ فاروق نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”عرفان اور رب نواز شادی پور گئے ہیں کسی اور جگہ کا انتظام کرنے کے لئے۔ خدا کرے ان کا بندوبست ہو جائے تو یہ لوگ آج ہی رات یہاں سے چلے جائیں۔“

”اب تم گھر پر ہی رہنا۔ کیس جانا مت۔“ رعنا اٹھتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں کیوں مجھے ان لوگوں سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔ عرفان تو کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتا رہتا ہے۔“

فاروق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رعنا یہ شکایت پہلے بھی کر چکی تھی اور وہ اس سلسلے میں

عجب سی نظروں سے رعنا کی طرف دیکھا۔ مگر اس وقت رعنا کو ان پُر ہوس نظروں کی پروا نہیں تھی کیونکہ اب اسے یقین تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔

نوبے کے قریب ان لوگوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کے پیچھے نالے کی طرف سے کچھ آوازیں سن کر وہ چونک گئے۔ فاروق کمرے سے نکل کر باہر آگیا اور عقبی دیوار کے قریب رک کر آوازیں سننے لگا۔ اور پھر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

دیوار کے دوسری طرف باتوں سے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ پولیس والے تھے۔ جو اس وقت بھی غالباً "ٹارچوں کی روشنی میں نالے اور کوٹھیوں کے درمیان کچھ جگہوں کا معائنہ کرتے پھر رہے تھے۔

"ادھر کی دو تین کوٹھیاں مشکوک ہیں۔" ایک آواز سنائی دی۔ "صبح سب سے پہلے انہی کو چیک کیا جائے گا۔ صبح ایک بار پھر ہمیں یہاں بھی آنا پڑے گا۔ تاکہ دن کی روشنی میں اس جگہ کا اچھی طرح معائنہ کیا جاسکے۔"

"ٹھیک ہے سر۔" دوسری آواز سنائی دی۔ "اب واپس چلیں۔ بدلو سے دماغ پھنا جا رہا ہے۔"

"چلو۔۔۔۔۔" یہ وہی پہلی آواز تھی۔ "باقی کام صبح دیکھا جائے گا۔"

فاروق احمد کلپ اٹھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آگیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا۔ گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" رعنا نے پوچھا۔

"پولیس۔" فاروق احمد نے کہا۔ آواز اس کے حلق میں انک رہی تھی۔ "پولیس والے اس وقت بھی نالے کے کنارے پر کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی نظروں میں ہماری کوٹھی مشکوک ہے۔ اس وقت وہ لوگ واپس جا رہے ہیں۔ صبح پھر آئیں گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب عرفان اور رب نواز وغیرہ لاشیں نہ خانے سے نکال کر لے گئے تھے تو ان کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ خون کے قطرے کوٹھی کے اندر قالین پر بھی گرے تھے اور باہر صحن میں بھی۔ ہو سکتا ہے کہ دیوار کے دوسری طرف بھی ایسے کوئی نشانات موجود ہوں۔ اگر صبح پولیس کو وہ نشان مل گئے تو ہم دونوں کو پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ وہ کم بخت تو چلے گئے اور ہمارے لئے مصیبتیں کھڑی کر گئے۔"

"اب کیا کیا جائے؟" رعنا نے کہا۔ اس کے لیے میں بھی ہلکی سی تھر تھراہٹ تھی۔

"ہمیں صبح کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔" فاروق احمد نے کہا۔ "فی الحال ہماری بھلائی اسی میں

سرگوشیوں میں رعنا سے باتیں کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے یہ لوگ آج رات یہاں سے چلے جائیں گے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر نہ گئے تو ہم کل صبح یہ کوٹھی چھوڑ دیں گے۔ آج رات تم اپنے تمام زیور، نقدی اور دوسری قیمتی چیزیں ایک چھوٹے سوٹ کیس میں رکھ لیتا۔ کل کسی وقت موقع ملے ہی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"کیا باقی سب کچھ یہیں چھوڑ دیں گے۔" رعنا بولی۔ "اتنا قیمتی ساز و سامان اور یہ کوٹھی۔۔۔۔۔ ہم نے یہ سب کچھ بنانے میں کتنی محنت کی تھی۔ یہ سب کچھ ہمیں چھوڑنا پڑے گا۔"

"جان سے زیادہ قیمتی تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔" فاروق بولا۔ "حالات بہتر ہوئے اور قسمت نے ساتھ دیا تو یہ سب کچھ دوبارہ بن جائے گا۔"

"کیا یہ لوگ ہمیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟" رعنا بولی۔

"تم اپنا سوٹ کیس تیار کر لیتا۔ رات ہی کو موقع پا کر میں سوٹ کیس کار کی ڈگی میں رکھ دوں گا۔ کل دن میں کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جائے گا۔ پری چہرہ کو ابھی یہ بات مت بتانا۔"

"ٹھیک ہے۔" رعنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عرفان اور رب نواز دوسرے کے کھانے سے پہلے گئے تھے۔ ان کی واپسی شام چھ بجے ہوئی تھی۔ وہ دونوں آتے ہی حاجی کے کمرے میں گھس گئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا تھا۔ حاجی نے فاروق احمد کو بلا لیا۔

"تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" حاجی نے کہا۔ "ہم آٹھ بجے کے قریب یہاں سے چلے جائیں گے اور اگر مناسب سمجھو تو تم لوگ بھی کوٹھی کو تلا لگا کر دو چار دن کے لئے کہیں چلے جاؤ تاکہ پولیس دوبارہ ادھر آئے تو تم لوگوں سے سامنا نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے حاجی جی۔" فاروق نے جواب دیا۔ "ہم صبح ہی گاؤں چلے جائیں گے۔"

فاروق نے رعنا کو بتایا تو اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ لیکن اسے مکمل اطمینان اسی وقت ہو سکتا تھا جب یہ لوگ یہاں سے چلے جاتے۔

چھ بجے کے قریب حاجی نے مقصود کو فون کر دیا کہ وہ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی لے کر پہنچ جائے۔

گاڑی ٹھیک آٹھ بجے پہنچ گئی تھی۔ وہی بیورو تھی۔ حاجی وغیرہ کے بیٹھنے کے بعد جب بیورو رخصت ہو گئی تو فاروق اور رعنا نے اطمینان کا سانس لیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے عرفان نے

ہے کہ ہم فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں۔“
”کہاں جائیں گے؟“ رعنا بولی۔

”گاؤں۔ بھائی جلال کے پاس۔“ فاروق نے جواب دیا۔ ”تم ایسا کرو تیاری شروع کرو۔ تمام زیور نقدی اور قیمتی چیزیں پیک کر لو۔۔۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپسی ہوگی۔ میرے واپس آتے ہی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں پری چہرہ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ہمارے آنے تک تم تیاری مکمل کر لو۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ رعنا نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”چوری۔“ فاروق نے جواب دیا۔ ”کوشش کروں گا کہ جلدی واپس آ جاؤں۔ تم تیاری شروع کر دو۔“

فاروق کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے پری چہرہ کو ساتھ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ رعنا نے باہر کا گیٹ بند کر دیا اور کمرے میں آکر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور پھر اس نے تیاری شروع کر دی۔ الماری کھول کر تمام اچھے کپڑے پلنگ پر ڈال دیئے۔ الماری کے نچلے حصے کی تجوری کھولی اور زیورات کے ڈبے نکال کرب یڈ پر رکھنے لگی۔ قیمتی زیورات کے کئی سیٹ تھے ان میں ڈائمنڈ کا وہ سیٹ بھی تھا جو اسے حاجی نے دیا تھا۔ اس نے تمام زیورات کے کئی سیٹ تھے۔ ان میں ڈائمنڈ کا وہ سیٹ بھی تھا جو اسے حاجی نے دیا تھا۔ اس نے تمام زیورات ڈبوں سے نکال لئے اور انہیں شیشے کے ایک خوبصورت صندوق میں رکھ کر تجوری میں سے نوٹوں کے بنڈل نکالنے لگی۔ ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو والے نوٹوں کے کئی بنڈل تھے۔ وہ تجوری میں سے پرائز بانڈ والے بنڈل نکال رہی تھی کہ باہر کی طرف آہٹ سن کر چونک گئی۔

اس نے کھڑکی کے شیشے سے جھانکنے کی کوشش کی مگر باہر کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔ چند لمحوں بعد آہٹ دوبارہ سنائی دی۔ وہ کمرے سے نکل کر ہال میں سے گزرتی ہوئی برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس وقت اسے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا حالانکہ صورتحال نہایت سنگین اور تکلیف دہ تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حاجی وغیرہ کے جانے کے بعد وہ اپنے آپ کو اپنے گھر میں محفوظ سمجھتی تھی۔ پولیس کا خوف اس لئے نہیں تھا کہ ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صبح سے پہلے یہاں نہیں آئیں گے اور کسی اور طرف سے ڈر خوف نہیں تھا۔ وہ کئی سال سے اس کوٹھی میں رہائش پذیر تھی۔ بیسیوں مرتبہ اکیلی رہی تھی۔ کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی اور اس نے کبھی کسی قسم کا ڈر خوف محسوس نہیں کیا تھا اور اب بھی اس کے دل میں کسی قسم کا ڈر خوف نہیں تھا۔

اس نے بولٹ ہٹا کر دروازہ کا ایک پٹ ذرا سا کھول دیا اور باہر جھانکتے ہوئے بولی۔ ”کون ہے؟“ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازہ کچھ اور کھول کر باہر جھانکا۔ برآمدے کا بلب بجھا ہوا تھا اور باہر تاریکی تھی۔ وہ چند لمحوں تاریکی میں گھورتی رہی پھر پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ دائیں طرف سے آہٹ سنائی دی اور باہر سے کسی نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔

دروازے کا پٹ رعنا کی پیشانی پر لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتی دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ رعنا نے سنبھل کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

عرفان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا چاقو تھا اور آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی۔ رعنا سرتاپا لرز اٹھی۔ اس نے چیخا چاہا مگر عرفان نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اسے اس طرح دبوچ لیا کہ اس کا ایک ہاتھ رعنا کے منہ پر تھا اور چاقو کی نوک اس کے سینے پر۔

”اگر تم نے چیخنے کی کوشش کی تو چاقو تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔“ عرفان کے لمبے میں بھینڑیے کی سی غراہٹ تھی۔ وہ اسے الٹے پیر گھینٹا ہوا اس کے بیڈ روم میں لے آیا۔ رعنا اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے مچل رہی تھی۔

کمرے میں بیڈ پر زیورات اور نوٹوں کے بنڈل دیکھ کر عرفان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

”بھاگنے کی تیاری ہو رہی ہے۔“ عرفان نے کہا اور رعنا کو دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔ ”اگر تم نے منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو تمہارے اس خوبصورت جسم کی بوٹیاں کر دوں گا۔“

”تنت۔۔۔۔۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ وہ ہلکائی۔

”میں جب سے یہاں آیا ہوں تمہارے حسن نے مجھے پاگل کر رکھا ہے۔ یہاں رہتے ہوئے تو مجھے تمہیں ہاتھ لگانے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں سے جاتے ہوئے میں حاجی سے بہانہ کر کے گاڑی سے اتر گیا۔ تمہارے اس خوبصورت بدن سے فیض یاب ہوئے بغیر میں کیسے جا سکتا تھا۔ میں باہر چھپا کھڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تمہارا کسم باہر ضرور جائے گا۔ اگر وہ باہر نہ بھی جاتا تو کچھ دیر بعد میں اندر آ ہی جاتا۔ اور مجھے اپنا مطلب پورا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی ہے کہ نہ صرف تمہارا کسم بلکہ وہ کھسرا بھی اس کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اب میں ہوں اور تم ہو۔ میں جس کام سے آیا ہوں وہ تو کر کے ہی جاؤں گا۔ اگر تم مجھ سے تعاون کرو گی تو

بڑی اچھی بات ہوگی۔ بصورت دیگر۔۔۔۔۔ یہ چاقو دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔ تمہارے جسم کی ایک ایک ہونی کاٹ کر پھینک دوں گا۔

”نہیں نہیں۔“ رعنا کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ ”خدا کے لئے مجھے کچھ مت کہو۔ یہ۔ سب کچھ لے جاؤ اور مجھے چھوڑ دو۔“

”یہ سب کچھ تو میں لے ہی جاؤں گا مگر تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ عرفان معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

”خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔“ رعنا گھٹکیائی۔

”رحم کرنا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں۔“ عرفان بولا۔ ”اگر رحم جیسی چیز سے آشنا ہوتا تو حاجی جیسے بھڑیئے کے ساتھ نہ ہوتا۔“

وہ مزید آگے بڑھا۔ رعنا نے اٹھ کر ایک طرف چھلانگ لگانی چاہی مگر عرفان نے اسے پکڑ کر پھر بیڈ پر گرا دیا۔ رعنا نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ عرفان نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ رعنا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

عرفان نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیڈ پر کپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ عرفان نے ایک دوپٹہ اٹھا لیا اور رعنا کے منہ پر اس طرح دوپٹہ باندھنے لگا جیسے گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالی جاتی ہے۔

رعنا بری طرح مچل رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر عرفان اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے نہ صرف اس کے منہ پر دوپٹہ باندھ دیا بلکہ اسے اس طرح دبوچ لیا کہ مزاحمت کے باوجود رعنا اپنے آپ کو اس کی گرفت سے نہیں نکال سکی۔

رعنا اپنے آپ کو بچانے کے لئے بری طرح ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ اس کے منہ سے خراہٹ کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مگر عرفان اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

رعنا چند منٹ سے زیادہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ وہ پر کئی چیزیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ ان کی دھینگا مشتی میں زیورات والا شیشے کا صندوق پر نیچے گر گیا تھا۔ شیشے ٹوٹا نہیں تھا لیکن ڈھسکا کھل جانے سے کچھ زیورات قالین پر بکھر گئے تھے۔ وہ نیچے جھک کر زیورات سمیٹنے لگا۔ اس دوران رعنا نے اپنے منہ پر بندھا ہوا دوپٹہ ہٹا دیا اور اٹھ کر چیختی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی۔

عرفان ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کی طرف لپکا اور اسے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ وہ رعنا کو گھسیٹا ہوا بیڈ پر لے آیا۔ چاقو بیڈ پر ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا۔ رعنا کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ اس نے چاقو کے وار سے بچنے کے لئے ایک طرف

بنا چاہا مگر عرفان نے اسے ایک گھٹنے کے دباؤ سے بھی بے بس کر رکھا تھا۔

چاقو پوری قوت سے رعنا کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کی چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگی۔ عرفان نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبائے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے اور پیٹ پر چاقو کے وار کرتا رہا۔ رعنا کے زخموں سے بننے والا خون بیڈ پر اور ادھر ادھر پھیلتا رہا۔ عرفان کے لباس پر بھی خون کے چھینٹے پڑے تھے۔

بالآخر وہ رعنا کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو اس کے سینے میں ہی پیوست رہنے دیا۔ رعنا کے منہ سے اب کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک تڑپی اور پھر بے حس و حرکت ہو گئی۔

عرفان نے ادھر ادھر دیکھا۔ کھلی ہوئی الماری میں فاروق احمد کے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور فاروق احمد کی ایک پینٹ شرٹ الماری سے نکال کر پہن لیا۔ پھر اس نے تمام زیورات اور نوٹوں کے بنڈل ایک کپڑے میں ڈال کر پوٹلی بنائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے کپڑے وہیں چھوڑ دیئے تھے۔ اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ بعد میں اسے کپڑوں کی وجہ سے شناخت کر لیا جائے گا۔

وہ ایک ہاتھ میں پوٹلی لئے گیٹ کھول کر باہر آگیا اور اطمینان سے چلتا ہوا سڑک پر آگیا۔ وہ سڑک پر رکا نہیں۔ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی بس لگنی اور وہ بس میں سوار ہو گیا۔

فاروق کی واپسی بارہ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ گیٹ کھلا دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹھنکا تھا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے رعنا کو دو تین آوازیں دیں مگر جواب نہ پا کر تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا۔ پری چہرہ بھی اس کے پیچھے تھا۔

برآمدے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فاروق احمد رعنا کو پکارتا ہوا تیز تیز قدم اٹاتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ اور پھر دروازے میں پہلا قدم رکھتے ہی اندر کا منظر دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک بانٹل گئی۔

○

شارق کو رات پھر نیند نہیں آئی تھی اور شینہ بھی جاگتی رہی تھی۔ ایس بی الطاف علی سے نکت کے بعد جب وہ گھر پہنچے تو ایک بچنے والا تھا۔ شاہ پری، رضیہ اور طفیل ان کے انتظار میں رہے تھے۔

”بہت دیر کر دی تم لوگوں نے۔“ شاہ پری انہیں دیکھتے ہی بولی۔ ”ہم تو پریشان ہو رہے تھے۔ تم تو یہ پروگرام بنا رہے تھے کہ مزید ایک گھنٹہ تک تم لوگ نہ آئے تو ہم لوگ تلاش میں

جس جگہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے وہاں سے سڑک بھی نظر آرہی تھی۔ وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات بیت گئی۔ دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ سامنے سڑک پر کچھ اندورفت شروع ہو گئی تھی۔

چھ بجے کے قریب ایک رکشہ گلی کے موڑ پر رکا اور نوکھا کو رکشے سے اترتے دیکھ کر ان دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ نوکھا رکشہ سے اتر کر چند لمحے وہیں کھڑا رہا اور جب رکشہ مڑ کر واپس چلا گیا تو وہ بھی آگے چلنے لگا۔

ثینہ نیچے آگئی اور اس نے نوکھا کے تیل بجانے سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا اور اسے لے کر اوپر آگئی۔ نوکھا بھی ان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا رہا؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ نوکھا نے جواب دیا۔ ”ایس پی الطاف علی مجھے لے کر پہلے تھانے پہنچا اور وہاں سے اپنے دفتر لے گیا۔ دفتر میں بیٹھ کر وہ بعض اعلیٰ افسروں کو ٹیلی فون کرتا رہا۔ پھر مجھے ساتھ لے کر ڈی آئی جی کے دفتر پہنچ گیا۔ تین بجے وہاں ڈی آئی جی کے علاوہ چند اور اعلیٰ افسران بھی جمع ہو گئے۔ مجھے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک میٹنگ کرتے رہے۔ پھر ایس پی الطاف علی نے مجھے بتایا کہ فوری طور پر اڑے پر چھاپہ مارنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کارروائی کل یعنی آج رات کی جائے گی اور اس کارروائی کے بارے میں میٹنگ میں شریک افسروں کے علاوہ کسی کو ہوا نہیں لگنے دی جائے گی۔ ایس پی الطاف علی نے مجھے آج رات آٹھ بجے اپنے دفتر آنے کو کہا ہے۔“

”اوہ۔“ شارق بولا۔ ”کیا الطاف علی نے اپنے افسروں کو تمہارے بارے میں بتایا تھا۔“

”ہاں۔“ نوکھا نے جواب دیا۔ ”اس نے ڈی آئی جی کے سامنے مجھے بھی پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ اسلحہ کے اڑے کے بارے میں اطلاع شارق نے دی تھی اور یہ شارق کا خاص آدمی ہے۔“

”پھر۔۔۔؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پھر کیا؟“ نوکھا بولا۔ ”ڈی آئی جی صاحب سمجھتے ہیں کہ بہت خون خرابہ ہو چکا۔ اب ہم لوگ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں۔ ہماری فراہم کردہ اطلاعات کی بدولت ہمیں حکومت رعایت مل جائے گی۔“

”اور میں جانتا ہوں کہ وہ رعایت کیسی ہوگی۔“ شارق نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اب نیند آرہی ہے چلو۔ تم لوگ بھی سو جاؤ۔“

نکلیں گے۔“

”ہماری تلاش میں کہاں جاتے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ایس پی الطاف علی کے گھر کا پتا معلوم کیا جاسکتا تھا۔“ شاہ پری نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر یہ پتا چل جاتا کہ تم لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے تو ہم الطاف علی کے گھر والوں کی یہ غلامی بنا لیتے۔ پھر دیکھتے کہ وہ تمہیں کیسے نہیں چھوڑتا۔“

”ایس پی الطاف علی فرض شناس اور ذمہ دار آفیسر ہے۔ میں نے اسی لئے اس کا انتخاب کیا تھا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”اس سے مجھے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے گرفتار کر کے کوشش کرے گا۔ وہ ایک ذہین آفیسر ہے۔ معاملات سے نمٹنا جانتا ہے۔“

”نوکھا کہاں ہے؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”وہ اسلحہ کے گودام کی نشاندہی کے لئے ایس پی کے ساتھ گیا ہے۔ میرا خیال ہے صبح تک واپس آجائے گا۔“ شارق نے کہا۔

”اگر اسے بند کر دیا گیا تو؟“ رضیہ بولی۔ ”میرا مطلب ہے ایسا نہ ہو کہ اسے یہ غلام بنا ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی جائے۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس وقت سب سے زیادہ مطلوب میں ہوں۔ اگر وہ مجھے گرفتار کرنا چاہتا تو مکمل تیاری کر کے آتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ثینہ کو پولیس سے بچایا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو ثینہ کے لئے یا سب کے لئے مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔“

شارق چند لمحے خاموش رہا پھر اسے بتانے لگا کہ کس طرح ثینہ پولیس کے ہاتھ آتے آ رہی تھی اور یہ بھی غنیمت تھا اس پر پولیس آفیسر نے ثینہ کو پہچانا نہیں تھا ورنہ الجھن پیدا جاتی۔

وہ لوگ تین بجے تک باتیں کرتے رہے۔ شاہ پری وغیرہ کو نیند آنے لگی تھی۔ وہ لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ شارق اٹھ کر اوپر والے ٹیرس میں آگیا اور کرسی پر بیٹھ کر صورتحال کا جائزہ لینے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ جب حاجی کے اسلحہ کے گودام پر چھاپہ پڑے گا تو حاجی کی حالت ہوگی۔

کچھ دیر بعد ثینہ بھی اوپر آگئی اور وہ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان دونوں میں سے کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔

گزشتہ دنوں کی بارشوں اور آسمان پر بادلوں کی وجہ سے موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ لوگ

شارق صبح نوبجے کے قریب اٹھ گیا۔ نوکھا وغیرہ بھی جاگ گئے تھے لیکن ٹینہ ابھی تک اڑنے والے کمرے میں سو رہی تھی۔ رضیہ نے شارق کے لئے ناشتہ بنا دیا اور ٹینہ کو جگانے کے لئے اوپر چلی گئی۔

”طفیل کہاں ہے۔ سو رہا ہے کیا؟“ شارق نے پوچھا۔

”کہہ رہا تھا گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا ہوں آج کا دن باہر رہ کر رکشہ چلاتے ہوئے گزراؤں گا۔“ نوکھا نے جواب دیا۔

”کیس کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔“ شارق بولا۔

”شارق باؤ۔“ نوکھا نے کہا۔ ”وہ رکشہ ڈرائیور ہے۔ اس نے گھٹ گھٹ کا پانی پیا ہے۔ برا نہ مانو تو میں یہ کہوں گا کہ وہ تم سے زیادہ چالاک ہے۔ اطمینان رکھو۔ وہ کوئی حماقت نہیں کرے گا۔“

”ہاں۔ چالاک تو وہ ہے۔“ شارق نے کہا۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ کچھ دیر بعد ٹینہ بھی اوپر سے آگئی۔ رضیہ نے اس کے لئے بھی ناشتہ بنا دیا۔

”آؤ یار۔ تاش کی بازی ہو جائے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے تو مجھ پر بھی بوریٹ طاری ہونے لگی ہے۔“ نوکھا نے کہا۔

وہ لوگ ڈائینگ ٹیبل پر ہی بیٹھ گئے۔ شاہ پری کو تاش کا کوئی کھیل نہیں آتا تھا۔ نوکھا نے شارق کو بلا ساسھی بتا لیا۔ ٹینہ اور رضیہ پارٹنر بن گئیں۔

دوبجے کے قریب ایک رکشہ دروازے کے سامنے رکا اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کل تیل کی آواز سنائی دی۔ شاہ پری نے جاکر دروازہ کھولا۔

وہ طفیل تھا۔ اس کا چہرہ اس طرح تھمتھا رہا تھا جیسے بہت برا معرکہ سر کر کے آیا ہو۔

”کیا بات ہے بہت خوش ہو۔“ شاہ پری نے پوچھا۔

”بات ہی ایسی ہے بہن شاہ پری۔“ طفیل نے کہا۔ ”میں نے آج حاجی کے ایک نئے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے۔ آؤ۔۔۔۔۔ اندر چل کر سب کے سامنے تفصیل بتاتا ہوں۔“

وہ دونوں اندر آگئے۔ شارق وغیرہ نے تاش کے پتے پھینک دیئے۔

”تم صبح سے کہاں غائب تھے بھئی؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”بڑی گرم خبر لایا ہوں شارق باؤ۔“ طفیل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے حاجی کے اس نئے ٹھکانے کا پتا لگا لیا ہے جہاں وہ آج کل میں منتقل ہونے والا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”شارق بھائی بات یہ ہے کہ آج میرا دل رکشہ چلانے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے سوچا ساتھ ہی بی بی کام بھی ہو جائے۔“ طفیل کہہ رہا تھا۔ ”میں گیارہ بجے کے قریب فاروق کی کوٹھی کے سامنے چا گیا اور رکشہ ایک درخت کے نیچے کھڑا کر کے پچھلی سیٹ پر آرام کرنے لگا۔ میں یہ سوچ کر بی بی رکھا تھا کہ یہ دیکھ سکوں کہ اس کوٹھی میں کون کون لوگ آتے ہیں۔ اتفاق سے تھوڑی ہی دیر بعد کوٹھی سے دو آدمی نکلے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ حاجی کا خاص بندہ عرفان تھا۔ اس کے ساتھی کا نام بعد میں معلوم ہوا کہ رب نواز ہے۔

انہوں نے مجھے شادی پور چلنے کو کہا۔ پہلے میں نے سوچا کہ انکار کر دوں۔ پھر انہیں رکشے پر باندھی لیا۔ شادی پور کے مین روڈ پر انہوں نے پٹھوں کی ایک دکان کے سامنے رکشہ رکھ دیا اور انتظار کرنے کو کہا۔

وہ بہت بڑا احاطہ ہے۔ سامنے پٹھوں کی دکان ہے اور پہلے بڑا لمبا چوڑا رقبہ ہے جہاں کئی رہے بنے ہوئے ہیں۔ میں بھی رکشے سے اتر آیا اور ٹکے سے پانی لے کر پینے لگا۔ عرفان نے نا پر بیٹھے ہوئے آدمی کو کرامت کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج رات آٹھ بجے کے بعد اس کے ہاں پروہنے آنے والے ہیں۔ وہ ان کی رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کر لے۔ وہ لوگ کئی دن رہیں گے۔

عرفان اور رب نواز دوبارہ رکشے پر بیٹھ گئے اور مجھے باغبانپورہ چلنے کو کہا۔ میں نے انہیں بندہ میں مدینہ چوک پر چھوڑا تھا۔ ان کے اتر جانے کے بعد میں کچھ دیر گھاس منڈی کے پیر کا اور پھر میراں آگیا۔ مجھے ان کے پروگرام کا پتا چل گیا تھا۔ اس لئے میں نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔“

”یہ تو تم نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔“ طفیل کے خاموش ہونے پر شارق نے کہا۔ ”اب نا کی کوٹھی کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔“

”لب لعنت بھیجو جی فاروق احمد کی کوٹھی پر۔“ طفیل نے کہا۔ ”اپنا مطلب پورا ہو گیا۔ اب طرف جانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”رکشے میں سفر کے دوران ان کی باتوں سے کچھ اندازہ لگایا؟“ شارق نے پوچھا۔

”وہ لوگ زیادہ دیر تک ایک عورت کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔“ طفیل نے دیا۔ ”رعنا نام ہے اس کا اور میرا خیال ہے وہ فاروق احمد کی بیوی ہے۔ اس کے بارے میں ان کی نیت کچھ اچھی نہیں لگتی۔“

گلی سے نکل کر سڑک پر آتے ہی اسے باغبانپورہ کی دو سواریاں مل گئیں اور پھر باغبانپورہ سے داروغہ والا تک کی بھی سواری مل گئی تھی۔ اگرچہ داروغہ والا موڑ پر بھی اسے رکشے کو شادی پور کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

شادی پور کے شاپ سے تقریباً ایک فرلانگ پہلے کرامت کی دکان تلاش کرنے میں اسے شادی پور کی پش نہیں آئی تھی۔ اس وقت اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دکان کی پیشانی پر ”چودھری کرامت“ لکھا تھا۔ اس پر بلب بھی جل رہا تھا۔ وہ فون نمبر دیکھ کر شارق کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی کہ حاجی نے شاید اس نئے ٹھکانے کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ یہاں فون بھی موجود تھا۔

چودھری کرامت کی اس بٹھ شاپ کے ساتھ ہی ایک تنگ سی گلی تھی۔ شارق نے رکشہ اسی گلی میں موڑ دیا۔ دکان کے پچھلی طرف خاصی بڑی جگہ تھی۔ گلی والی دیوار خاصی اونچی تھی جو در تک چلی گئی تھی۔ اس کے بعد دوسرے احاطے کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ اس احاطے میں بھی گلی کے رخ پر خراو کی تین دکانیں تھیں۔ اور اس وقت تینوں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔

شارق نے رکشہ واپس موڑ لیا۔ اس وقت پٹھوں سے لدی ہوئی ایک ٹریکٹر ٹرائی چودھری کرامت کی دکان کے سامنے رکی تھی اور دو آدمی پٹھوں کے گٹھے اتار کر نیچے پھینک رہے تھے۔ شارق نے رکشہ بائیں طرف گھما دیا اور تقریباً ”پچاس گز آگے چائے کی ایک دکان کے سامنے روک لیا اور لڑکے کو چائے کا کمرہ کر رکشے کی پچھلی سیٹ پر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔

اس وقت شام کے ساڑھے سات بجے تھے۔ رکشے پر بیٹھے چائے پیتے ہوئے شارق کرامت کی دکان کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں چودھری کرامت ٹریکٹر ٹرائی سے چارے کے گٹھے اتار رہا تھا۔

شارق جس جگہ پر موجود تھا وہاں سے ایک سڑک بجلی گھر کے علاقے کی طرف دوسری طرف دھڑی گاؤں بھینی کی طرف جاتی تھی۔ اس چھوٹے سے چوک پر خاصی رونق تھی۔ بھینی کے راستے میں اور بھی بہت سے دیہات تھے۔ دن کے وقت تو تین چار بسیں اس طرف جاتی تھیں لیکن شام کے بعد ان بسوں کی تعداد کم ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھینی کی طرف جانے والی بس کافی بڑے سے نہیں آئی تھی۔ موڑ پر لوگ جمع تھے۔ کچھ لوگ شارق کے پاس بھی آئے تھے اور اسے گھنٹی یا راستے کے کسی اور گاؤں چلنے کو کہا تھا لیکن شارق نے رکشہ ڈرائیوروں کے مخصوص انداز میں نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ دوسرے رکشہ والوں نے بھی جانے سے انکار ہی کیا تھا۔ شام کے بعد لڑکی بھی رکشہ یا تانگے والا اس طرف نہیں جاتا تھا۔

چائے پینے کے بعد بھی شارق رکشے پر اس طرح ٹانگیں پارے بیٹھا رہا جیسے بہت تھکا ہوا

”رکشہ کہاں سے لیا تھا اور واپس کب کرنا ہے؟“ شارق نے پوچھا۔
”اپنا ایک پرانا جاننے والا ہے۔ اس سے لیا تھا۔ شام آٹھ بجے تک کی بکنگ ہے۔“ طفیل نے بتایا۔

”تم اسے جا کر بتا دو کہ رکشہ آج شام کو نہیں ملے گا۔ کل کے پیسے بھی دے دیں۔“ شارق نے کہا۔
”تم اس وقت تو مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو نہیں دیا۔“

”اس نے آخری الفاظ رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ وہ لوگ کھانا کھاتے ہوئے بھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے۔“
”کھانا تو تیار ہے۔“ رضیہ کے بجائے شاہ پری نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تاش چھوڑیں تو میرا

ہو۔

نوجننے والے تھے۔ ٹریکٹر ٹرائل جا چکی تھی۔ چودھری کرامت دکان پر ہی موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکا بھی تھا جو گاہکوں کو پٹھے تول تول کر دے رہا تھا۔

سوانو بجے کے قریب ایک پیچرو دکان کے سامنے رکی۔ چودھری کرامت فوراً ہی پیچرو کے پاس آگیا۔ پیچرو سے تین آدمی اترے تھے۔ ان میں سے دو کو شارق نے پہچان لیا۔ ایک حاجی عبداللہ تھا دوسرا اس کا پرانا پاڈی گارڈ دلاور۔ تیسرے کو وہ نہیں پہچان سکا تھا۔ وہ تینوں پیچرو سے اتر کر فوراً ہی چارے کے گٹھوں کے درمیان ہوتے ہوئے دکان میں سے گزرتے ہوئے پچھلے حصے کی طرف چلے گئے۔ چودھری کرامت بھی ان کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ پیچرو یو ٹرن لیتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد چودھری کرامت دوبارہ باہر آگیا۔ اس نے ملازم لڑکے سے کچھ کہا اور وہ اپنا کام چھوڑ کر مخالف سمت میں دکانوں کی طرف چلا گیا۔

شارق نے رکشہ سٹارٹ کیا اور اسے ہلکی رفتار سے چلاتے ہوئے چودھری کرامت کی دکان کے سامنے روک لیا اور انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔

”دو کلو سون دیدو چودھری جی۔“ وہ پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔
”دو کلو کیا کرنے ہیں جو ان۔ روٹی کے سات کھانے ہیں۔“ چودھری کرامت نے گویا مذاق کیا تھا۔

”یہ بھی بہت ہیں چودھری جی۔ میری بکری اتنے میں گزارہ کر لیتی ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔

کرامت نے دو کلو پٹھے تول دیئے۔ شارق پیسے دیتے ہوئے بولا۔
”ایک ضروری ٹیلی فون کرنا ہے چودھری جی۔ پیسے لے لینا۔“

”ٹیلی فون اندر رکھا ہوا ہے اور میرے پروہنے آگئے ہیں۔ تم سراج کے ہوٹل سے ٹیلی فون کر لو۔“ چودھری نے کہا۔

شارق نے خریدے ہوئے پٹھے رکشے کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیئے اور رکشہ سٹارٹ کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد اس نے باغبانپورہ میں ایک پی سی او کے سامنے رکشہ روکا اور اتر کر اندر داخل ہو گیا۔ اس پی سی او میں کئی ٹیلی فون تھے۔ دو پر لوگ بات کر رہے تھے۔ شارق نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے تیسرے فون کا ریسپور اٹھا لیا اور چودھری کرامت والا نمبر ڈائل کر کے ٹیلی فون سیٹ سرکاتا ہوا کاؤنٹر کے آخری سرے پر چلا گیا۔ لائن ملنے میں

زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم دلاور بول رہے ہو۔“ شارق نے دھیمی آواز میں کہا۔
حاجی سے بات کراؤ۔“

”تم کون بول رہے ہو۔“ دوسری طرف سے چونکتے ہوئے بلجے میں پوچھا گیا۔

”میں حاجی کا پرانا دوست شارق بول رہا ہوں۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”اے صرف اتنا بتا دو کہ میں نے اس کے اس نئے ٹھکانے کا پتا چلا لیا ہے حالانکہ اسے یہاں آئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوا ہو گا۔ اسے بتا دو کہ وہ میری نظروں سے چھپ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں دوبارہ بات کروں گا۔“

شارق نے فون بند کر دیا۔ وہ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے باہر آ گیا۔

رکشہ سٹارٹ کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ حاجی کو اس کے فون کی اطلاع ملی ہوگی تو وہ ناچ کر رہ گیا ہو گا۔

اس کے بعد شارق کہیں نہیں رکا۔ حق نواز روڈ سے ہوتا ہوا گھر واپس آگیا۔ اس وقت سوانو بج رہے تھے۔

”نوکھلکھا گیا؟“ اس نے ٹینے سے سامنا ہوتے ہی پوچھا۔

”وہ تو ساڑھے سات بجے ہی چلا گیا تھا۔“ ٹینے نے جواب دیا۔

”طفیل۔“ تم رکشہ واپس کر آؤ۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر ضرورت پڑی تو دوبارہ لے آئیں گے۔“ شارق بولا۔

”رکشہ تو واپس کر آؤں لیکن وہ پٹھے کس کے کیلئے لائے ہو شارق باؤ۔“ طفیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مل کر تھوڑے تھوڑے کھالیں گے یار۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”پٹھے کھاؤ گے؟“ ٹینے نے اسے گھورا۔

شارق نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا پھر اسے بتانے لگا کہ پٹھے اس نے کیوں خریدے۔

”تم اتنا قریب چلے گئے تھے۔“ ٹینے بولی۔ ”اگر تمہیں پہچان لیا جاتا تو زندہ واپس نہ آتے۔“
”پہچان لیا جاتا تب نا۔“ شارق مسکرایا۔ ”ویسے شارق ترنوالہ نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ مجھ

پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔“

”لیکن پھر بھی احتیاط کا واسن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔“ ثینہ نے کہا۔
”اچھا شارق باؤ۔ میں تو رکشہ واپس کرنے جا رہا ہوں۔“ طفیل کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

شارق اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آگیا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا اور چودھری کرامت والا نمبر ملانے لگا۔ اس مرتبہ بھی لائن ملنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ کل چودھری کرامت نے ریسیو کی تھی۔ ”حاجی عبداللہ کو فون دو۔ میں اس کا دوست شارق بول رہا ہوں۔“ شارق نے کہا۔
چند لمحوں خاموشی رہی پھر حاجی عبداللہ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔
”تم۔۔۔۔۔ تم حرام زادے۔۔۔۔۔“

”چنچو مت پاپی۔“ شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے دیکھ لیا میں موت کے سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ تمہیں اسی طرح سہا سہا کر مار ڈالوں گا۔“
”تم میرے ہاتھ لگ جاؤ تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ حاجی چیخا۔
”مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرو تو تمہارے ہاتھ لگوں گا نا۔“ شارق نے کہا۔ ”تم تو بزدلوں کی طرح چھپتے پھر رہے ہو اور میں سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ جب تم جیو سے چودھری کرامت کی دکان کے سامنے اتر رہے تھے تو میں اس وقت چند گز کے فاصلہ پر تھا۔ تم کہیں بھی چھپ جاؤ میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکو گے۔ ویسے تمہارے لئے میری ایک پیشکش ہے۔“

”بکو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔“ حاجی دھاڑا۔

”اگر تم اپنے آپ کو سرنڈر کر دو تو میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔“ شارق بولا۔
”بند کرو یہ بکواس۔“ حاجی چیخا۔ ”سرنڈر میں نہیں تم کرو گے۔ میں تمہیں کتے کی طرح اپنے پیر چلنے پر مجبور کر دوں گا۔“

”یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کس کے پیر چلتا ہے۔ ویسے میرا وعدہ ہے کہ تمہارے کسی بھی خفیہ ٹھکانے کے بارے میں پولیس کو نہیں بتاؤں گا۔ تم سے جب بھی مقابلہ ہو گا براہ راست ہو گا۔ اور ہاں۔ میں نے کہا تھا کہ آج تمہیں ایک خوشخبری سناؤں گا۔ لیکن اب وہ خوشخبری آج نہیں کل سناؤں گا۔ میرے فون کا انتظار کرنا۔“

جواب میں حاجی نے کچھ کہنا چاہا مگر شارق نے فون بند کر دیا اور ثینہ وغیرہ کو حاجی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔ پھر رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے تم لوگ کھانا کھا چکے ہو۔ مجھے تو بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“
”میں ابھی تمہارے لئے کھانا نکالتی ہوں۔“ رضیہ کہتے ہوئے کچن میں گھس گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شارق بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔
”دوبجے کے قریب نو لکھا پہنچ گیا۔“

”ہو گیا کام شارق باؤ۔“ اس نے آتے ہی کہا۔ ”پولیس نے رات گیارہ بجے ریڈ کیا تھا۔ بڑے بڑے افسران بھی موجود تھے۔ بڑا اسلحہ نکلا ہے بھی وہاں ہے۔ یہ سارا روسی اسلحہ ہے جو افغانستان سے لایا گیا تھا۔ پستولیں، کلاشنکوف، رائفلیں، لاکھوں کی تعداد میں گولیاں، راکٹ اور نجانے کیا کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس گودام میں۔ وہ سب کچھ اب پولیس کی تحویل میں ہے۔ سنا تھا کہ وزیر اور چیف منسٹر بھی اس اسلحہ کے معاملے کے لئے وہاں آنے والے ہیں۔ لیکن میں تو خاموشی سے کھسک لیا۔ وہ لوگ مجھے تلاش کرتے رہے ہوں گے کہ نو لکھا کدھر گیا۔“

”کوئی گزربڑ تو نہیں ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے مقابلہ وغیرہ؟“ شارق نے پوچھا۔
”وہاں چار آدمی تھے۔ انہوں نے مقابلے کی کوشش کی تھی۔ پولیس کی جوابی فائرنگ سے ایک مارا گیا اور باقی تین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بڑے منظم طریقہ سے چھاپہ مارا گیا تھا۔ ویسے ایک بات ہے شارق باؤ۔ اگر پولیس والے ٹھیک سے کام کریں نا تو کوئی بھی شخص جرم کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے کام کرنے کا ہی تو سارا مسئلہ ہے۔“ شارق گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”پولیس کے ٹھیک سے کام کرنے کی روایت ہوتی تو آج میں اور تم بھی جرائم کی دلدل میں نہ پھنسے ہوتے۔“ وہ چند لمحوں خاموش رہا پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے حاجی کو یہ خوشخبری اسی وقت سنا دینی چاہئے۔“

”ہاں۔ لیکن یہ خوشخبری میں سناؤں گی۔“ ثینہ نے کہتے ہوئے فون اپنی طرف سرکا لیا اور شارق سے معلوم کر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔
تیسری تھنٹی پر کل ریسیو کی گئی تھی۔
”ہیلو۔“ ایک خوابیدہ سی آواز سنائی دی۔
”حاجی کو فون دو۔“ ثینہ نے خشک لہجے میں کہا۔

”کون بد تمیز ہو تم۔ حاجی جی سو رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔
”اس سے کہو ثینہ بات کر رہی ہے۔ میرا نام سنتے ہی اس کی نیند اڑ جائے گی۔“ ثینہ نے کہا۔

دوسری خبر شہر کے ایک رئیس فاروق احمد کی بیوی رعنا کے ہیمنہ قتل سے متعلق تھی۔ جسے
آمروریزی کے بعد چاقو کے پے در پے وار کر کے بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا۔
ان تین بڑی خبروں کے علاوہ فرنٹ پیج کی ساری خبریں حاجی عبداللہ سے متعلق تھیں۔
رضیہ چائے بنا کر لے آئی۔ شارق چائے پیتے ہوئے خبریں پڑھتا رہا۔ اس وقت وہ رعنا کے
قتل کی خبر پڑھ رہا تھا۔ رعنا کے قتل کی اطلاع اس کے شوہر فاروق احمد نے پولیس کو دی تھی۔
جسے بعد میں پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔

فاروق احمد نے پولیس کو جو بیان دیا تھا اس کے مطابق حاجی عبداللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ
اس کی کوٹھی پر آگیا اور بتایا کہ وہ چند روز یہاں رہے گا۔ حاجی نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر کہ
کو ان کی موجودگی کے بارے میں بتایا گیا تو ان دونوں میاں بیوی کو قتل کر دیا جائے گا۔
اس دوران حاجی عبداللہ اپنے تین کارندوں کو باندھ کر لایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بند روڈ
والے ہیروئن کے اڈے کی تباہی ان کی غفلت کا نتیجہ تھی۔ وہ پہلے ان تینوں پر تہہ خانے میں تشدد
کرتے رہے پھر انہیں قتل کر کے لاشیں کوٹھی کے عقبی گندے نالے میں پھینک دیں۔

گزشتہ رات آٹھ بجے حاجی اور اس کے ساتھی انہیں زبان بند رکھنے کی دھمکی دے کر چلے
گئے تھے۔ فاروق بھی اپنے ملازم پری چوہ کے ساتھ کسی کام سے چلا گیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد
واپس آیا تو کمرے میں بیڈ پر اس کی بیوی رعنا کی لاش پڑی تھی۔ ایک چاقو دستے تک اس کے
سینے میں پیوست تھا۔ الماری کھلی ہوئی تھی اور سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ قاتل نقد رقم، انعامی
بانڈز اور لاکھوں روپے کے زیورات لے گیا تھا۔

فاروق نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا تھا کہ قاتل نے بڑے اطمینان سے اپنا مشن پورا کیا
تھا۔ اور اپنے خون آلود کپڑے اتار کر الماری میں سے اس کے کپڑے نکال کر پہن گیا تھا۔ اس
نے قاتل کے کپڑے شناخت کر لئے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق حاجی عبداللہ کا ایک باڈی گارڈ
عرفان اس روز بھی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

اخبار حاجی کے حوالے سے خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ ان تمام حالات و واقعات سے پولیس نے
جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ فاروق احمد حاجی عبداللہ کا ایجنٹ تھا اور اس نے بخوشی حاجی عبداللہ کو
اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ کیونکہ اس دوران وہ خود اس کی بیوی اور ملازم پری چوہ آبادی سے باہر
آتے جاتے تھے۔ ایک دو موقع پر تو وہ تینوں ہی اکٹھے گھر سے باہر گئے تھے۔ اگر حاجی عبداللہ نے
انہیں کوئی دھمکی دی ہوتی تو وہ ایسے موقع سے فائدہ اٹھا کر پولیس کو اطلاع دے سکتے تھے۔

لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے حاجی اور اس کے

”ٹینس۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ہولڈ کرو۔“

اور پھر تقریباً دو منٹ بعد حاجی کی آواز سنائی دی۔ مگر ٹینس نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے
بغیر بولنا شروع کر دیا۔

”حیرت کی بات ہے کہ ان حالات میں بھی تم آرام سے سو رہے ہو۔ شارق نے تم سے کہا
تھا کہ وہ کل صبح تمہیں خوشخبری سنائے گا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں صبح تک انتظار میں رکھنے کے
بجائے کیوں نہ ابھی وہ خوشخبری سنا دی جائے۔“

”بکیتی رہو۔ میں سن رہا ہوں۔“ حاجی کی غراہٹ سنائی دی۔

”وہ جو تمہارا اسلحہ کا ڈپو ہے نا نمبر مارکیٹ والا۔“ ٹینس نے کہا۔ ”وہ اب پولیس کی تحویل
میں ہے۔ تمہارا ایک آدمی مارا گیا ہے۔ تین نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے اور
اسلحہ پر پولیس کا قبضہ ہے۔ ہے نا تمہارے لئے خوشی کی بات؟“

”کیا بکیتی ہو تم؟“ حاجی کے دھارنے کی آواز سنائی دی۔

”اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو اپنے کسی آدمی کو فون کر کے تصدیق کر لو۔ بس اس وقت
میں نے تمہیں یہی بتانا تھا۔ اگلی گفتگو تک اللہ حافظ۔“

حاجی دوسری طرف سے کچھ کہہ رہا تھا مگر ٹینس نے فون بند کر دیا اور شارق وغیرہ کی طرف
دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”حاجی اس وقت اپنے بال نوچ رہا ہو گا۔ اسے اب رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ مگر ہم اپنی
نیند کیوں خراب کریں۔ میں تو سونے جا رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ شاہ پری
بھی اس کے ساتھ ہی آگئی تھی وہ دونوں عام طور پر ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔

شارق ہال کمرے میں ہی صوفے پر دراز ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی سو چکا تھا۔
شارق کی آنکھ صبح سات بجے کھل گئی۔ رضیہ کے علاوہ سب لوگ سو رہے تھے اور رضیہ بھی
سامنے والے صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

”آج تو پورا اخبار سنسنی خیز خبروں سے بھرا ہوا ہے۔“ وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”لو۔ تم اخبار دیکھو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

شارق نے اخبار لے لیا۔ بیڈ لائن حاجی کے اسلحہ ڈپو کے بارے میں تھی۔ اس کے علاوہ اور
خبریں چار چار کالی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

ایک خبر گلبرگ میں گندے نالے میں دریافت ہونے والی تین لاشوں کے بارے میں تھی۔
ان میں صرف اللہ دتہ نامی ایک شخص کی شناخت ہوئی تھی۔ وہ حاجی عبداللہ کا ملازم تھا۔

نہنے کے بعد وہ معاملات سنبھال لے گا۔ اسے پولیس سے زیادہ خوف نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ آج جو پولیس آفیسر اس کی گرفتاری کے لئے ہتھکڑیاں لئے پھرتے ہیں کل وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے۔

حاجی کو سب سے زیادہ خوف شارق اور ثینہ سے تھا جو اسے در پے نقصان پہنچا رہے تھے اور وہ ان کا کچھ بھی نہس بگاڑ سکا تھا اور دراصل شارق اور ثینہ ہی کی وجہ سے پولیس بھی اس کے پیچھے لگی تھی۔ ان دونوں کا قصہ تمام ہو جائے تو پولیس سے پیچھا چھڑانا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔

اس وقت فون پر ثینہ کی باتوں نے حاجی کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنی ہی بوئیاں نوچ ڈالے۔ عرفان اور دلاور حاجی کے کمرے کے باہر برآمدے میں سو رہے تھے۔ حاجی کی آواز سن کر وہ بھی اٹھ گئے تھے اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ صورتحال کیا تھی۔

”اوائے عرفان۔۔۔۔۔“ حاجی غراتے ہوئے بولا۔ ”مقصود کا نمبر ملاؤ۔ جلدی کرو۔“

”حاجی جی۔ ہو سکتا ہے ثینہ اور شارق نے آپ کو پریشان کرنے کے لئے فون پر یہ جھوٹی اطلاع دی ہو۔“ عرفان نے کہا۔

”اوائے وہ جھوٹ نہیں بولتے۔“ حاجی چیخا۔ ”جو کچھ کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ ایک تم لوگ ہو نامرد۔۔۔۔۔ آج تک ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ نمبر ملاؤ مقصود کا۔۔۔۔۔“

عرفان نے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور مقصود کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال کافی دیر بعد ریسیو کی گئی تھی۔ مقصود کی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔

”مقصود صاحب۔ میں عرفان بول رہا ہوں۔ حاجی صاحب سے بات کرو۔“ عرفان نے کہا اور پھر ریسیور کی طرف بڑھا دیا۔

”اوائے مقصود۔“ حاجی ماؤتھ پیس میں غرایا۔ ”تم گھر میں پڑے آرام سے سو رہے ہو۔ کچھ معلوم ہے کیا ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے حاجی صاحب۔“ مقصود نے پوچھا۔

”نمبر مارکیٹ والے گودام پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔ جا کر معلوم کرو اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے۔ مجھے فوراً اطلاع دینا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ حاجی نے جواب کا انتظار کئے بغیر فون بند کر دیا اور زخمی شیر کی طرح کمرے میں ٹھلنے لگا۔

چودھری کرامت بھی کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ حاجی

ساتھیوں کو بخوشی اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ بہر حال پولیس نے فاروق احمد اور اس کے ملازم پری چہرہ کو شریک جرم قرار دے کر حراست میں لے لیا تھا۔

○

رات سوا دو بجے کے قریب ثینہ سے ٹیلی فون پر بات ہونے کے بعد حاجی عبداللہ واقعی ناچ اٹھا تھا۔ نمبر مارکیٹ میں اس کا اسلحہ کا بہت بڑا گودام تھا۔ نمبر مارکیٹ کے پچھلی طرف وہ مکان آٹھ کمروں پر مشتمل تھا اور ہر کمرے میں اسلحہ کی پٹیاں بھری ہوئی تھیں۔ پہلے یہ مکان ہیروئن کے اڈے کے طور پر استعمال ہوتا تھا لیکن پھر اسے اسلحہ کے ڈپو میں تبدیل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو یہ ہوتا رہا تھا کہ جب کسی گاہک کو اسلحہ کی ضرورت ہوتی تو اس سے رقم وصول کر کے ڈپو کے نگران کے نام پرچی لکھ دی جاتی اور اسے فون پر بھی اطلاع دے دی جاتی۔ وہ گاہک رات کے اندھیرے میں وہاں جا کر اپنی مطلوبہ چیز حاصل کر لیتا۔ پرچی صرف ان گاہکوں کو دی جاتی جو قابل اعتماد ہوتے۔

تین مہینے پہلے حاجی کو اسلحہ کی ایک بہت بڑی کھیپ بہت کم قیمت پر مل گئی تھی۔ جس میں راکٹ، لائٹ مشین گنیں، ہینڈ گرنیڈ، رائفلیں، پستول اور لاکھوں کی تعداد میں گولیاں شامل تھیں۔ یہ سارا مال حاجی نے اس ڈپو کے لئے رکھوایا تھا اور یہ ڈپو دوسروں کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔

حاجی کے صرف چند ہی ایسے آدمی تھے جنہیں اس ڈپو کے بارے میں معلوم تھا۔ ان میں سے بھی بیشتر کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ ڈپو بند کر دیا گیا ہے۔ اب کوئی ادھر کا رخ نہ کرے۔ یہ نئی کھیپ اس ڈپو میں لانے کے بعد تو سب لوگوں کو سختی سے اس طرف جانے سے منع کر دیا گیا تھا۔

چار محافظ چوبیس گھنٹے اسلحہ کی حفاظت کے لئے وہاں موجود رہتے تھے۔ ان کے علاوہ صرف دو آدمی ایسے تھے جنہیں ڈپو میں اسلحہ کے اس انبار کے بارے میں ایک مقصود تھا اور دوسرا عرفان۔

اسلحہ کی یہ کھیپ تقریباً دو مہینے سے اس گودام میں پڑی تھی۔ حاجی کسی ایسی پارٹی کی تلاش میں تھا جس سے پوری کھیپ کا سودا ہو سکے۔ لیکن ابھی تک اسے ایسی کوئی پارٹی نہیں ملی تھی۔ چھوٹے گاہک تو بہت تھے لیکن حاجی اس کھیپ کو ٹکڑوں میں نہیں بیچنا چاہتا تھا۔

اور پھر شارق سے کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ شارق نے اسے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک خودکشی کر چکا ہوتا۔ لیکن کروڑوں ڈالر کا نقصان ہونے کے باوجود حاجی ابھی تک ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بینکوں میں مختلف ناموں سے اس کا خفیہ سرمایہ موجود تھا۔ بیرون ممالک میں بھی اس کے کروڑوں ڈالر موجود تھے۔ اسے امید تھی کہ شارق سے

مسل سکا اور شارق اسے تباہی کی طرف دھکیلتا رہا۔

آج صبح عرفان اس کے پاس آیا تھا اور اسے پیغام دے گیا تھا کہ حاجی اس کے پاس آنے والا ہے۔ وہ چند روز یہاں رہے گا۔ کرامت انکار تو نہیں کر سکا تھا۔ اس کے کچھ راز اب بھی حاجی کے قبضے میں تھے۔ اگر حاجی اس کی مخالفت پر اتر آتا تو اسے تباہ کر سکتا تھا۔

چودھری کرامت کو پیغام ملنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے بیوی بچوں کو گاؤں بھیج دیا۔ اس نے اپنے ایک ملازم کو بھی گاؤں بھیج دیا تھا۔ وہ ملازم قابل اعتماد نہیں تھا۔ بہت بڑبڑلاتا تھا۔ اس کی موجودگی میں یہ اندیشہ رہتا کہ وہ کسی نہ کسی کو حاجی وغیرہ کے بارے میں بتا دے گا۔ اس لئے کرامت نے اسے گاؤں بھیج دیا تھا۔ صرف ایک لڑکے کو یہاں رکھا تھا جو حاجی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

حاجی اگرچہ بہت خفیہ طریقے سے یہاں آیا تھا لیکن اس کے آدھے گھنٹے بعد شارق نے حاجی کو فون کیا تھا۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ شارق کو یہاں حاجی کی موجودگی کا پتا کیسے چل گیا تھا اور اب رات کے پچھلے پیر شینے نے فون کر کے حاجی کو ایک اور خبر سنائی تھی جس پر حاجی بھڑک اٹھا تھا۔

چودھری کرامت نے حاجی کو اپنے گھر میں پناہ تو دے دی تھی لیکن اب وہ خوفزدہ تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر شارق نے پولیس کو حاجی کے بارے میں بتا دیا تو پولیس یہاں بلہ بولنے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گی۔ حاجی تو ڈوب ہی رہا تھا لیکن اسے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔

”اے تمہاری جان کیوں نکلی جا رہی ہے۔“ حاجی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شارق کی دشمنی مجھ سے ہے۔ وہ مجھے ہی تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ تمہیں وہ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”مگر حاجی صاحب۔ اگر اس نے پولیس کو یہاں آپ کی موجودگی کی اطلاع دے دی تو؟“

چودھری کرامت بولا۔

”ایسا نہیں ہو گا۔“ حاجی نے کہا۔ ”اچھا جاؤ۔ تم چائے بنا کر لاؤ۔ تم نے بچوں کو بھی یہاں سے بھیج دیا ہے۔ سارے کام تمہیں خود ہی کرنے پڑیں گے۔“

”کام کی تو کوئی پرواہ نہیں حاجی صاحب۔“ کرامت بولا۔ ”اچھا میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔“

”کرے سے نکل کر تین کی طرف چلا گیا۔ ساڑھے تین بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ حاجی نے لپک کر ریسور اٹھالیا۔ مقصود کی کال تھی۔

”خبر درست ہے حاجی صاحب۔“ مقصود نے بتایا۔ ”وہ گودام پولیس کے قبضے میں ہے۔“

کا پرانا ساتھی تھا۔ یہ بہت عرصے پہلے کی بات تھی۔ اس وقت حاجی عبد اللہ اتنا اوپر نہیں گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لوگوں کے ساتھ مل کر بیرون کا کاروبار کیا کرتا تھا اور یہ کام بہت چھوٹے پیمانے پر تھا۔ ان دنوں چودھری کرامت بھی اس کے کاروبار میں شریک تھا۔

وہ دراصل پانچ چھ پارٹنر تھے۔ جو باری باری پشاور اور قبائلی علاقوں سے چوری جیسے تھوڑی تھوڑی بیرون لاکر حاجی کے حوالے کر دیتے اور حاجی انہیں ایسے لوگوں کو فروخت کر دیتا جو بڑے گروہوں کے لئے کام کرتے تھے۔

سارا کنٹرول حاجی کے ہاتھ میں تھا۔ بڑے سنگھروں سے بھی اس کے رابطے تھے۔ حاجی ایسے لوگوں سے اپنے تعلقات بڑھاتا گیا جو بعد میں اس کے بہت کام آئے۔ نئے لوگوں سے تعلقات استوار ہونے کے بعد حاجی اپنے پرانے ساتھیوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک ساتھی نے جب آنکھیں دکھانے کی کوشش کی تو حاجی نے اسے گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے خود ہی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے گئے۔

چودھری کرامت واحد آدمی تھا جس پر حاجی کو سب سے زیادہ اعتماد تھا اور سب سے زیادہ فائدہ بھی کرامت ہی نے اٹھایا تھا۔ اس نے بیرون کی کمائی سے بھینے کے قریب ڈیڑھ مربع زرعی زمین خرید لی۔ ایک اور جگہ زمین خرید کر اس نے اینٹوں کا عہدہ لگا دیا۔ یہ چارے لوسن کی چھوٹی سی دکان بہت پرانی تھی۔ اس کو وہ آڑ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ پیسہ ہاتھ آیا تو اس نے اس پاس کے چار پانچ مکان خرید کر انہیں اپنے مکان میں شامل کر لیا۔ اس نے ساری تعمیرات سرے سے کرائی تھی۔ سامنے سڑک کے رخ پر تو دکان ہی رکھی تھی۔ پچھلی طرف بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا اور اس کے پیچھے کئی کمروں پر مشتمل مکان تھا۔

بہت عرصہ پہلے وہ حاجی کے بزنس سے الگ ہو چکا تھا۔ لیکن ان میں تعلقات اب بھی تھے۔ کبھی کبھار ان میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ کرامت یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ عرصہ سے حاجی عتاب کا شکار تھا۔ ایک طرف پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف شارق اور شینے نے اس کا ناٹھ بند کر رکھا تھا۔

کرامت شارق اور شینے کو نہیں جانتا تھا۔ وہ اس کے بہت بعد حاجی کے گروہ میں آئے تھے۔ انہوں نے حاجی کے لئے بہت کام کیا تھا اور حاجی کو نقصان بھی بہت پہنچایا تھا۔

حاجی سے کرامت کی آخری ملاقات دو مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت شارق اور حاجی کے جھگڑوں کی ابتداء ہوئی تھی۔ حاجی نے اس وقت کہا تھا کہ شارق جیسا آدمی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کسی بھی وقت اسے چیونٹی کی طرح مسل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ چیونٹی کو نہیں

رہا تھا اور وہ اب تک شارق اور شینہ کا سراغ تک نہیں لگا سکا تھا۔ شارق اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ کسی جگہ پر بھی وہ چار دن سے زیادہ نہیں ٹک سکا تھا۔ اور اسے حیرت تو اس بات پر تھی کہ شارق کو اس کے بارے میں کیسے پتا چل جاتا تھا۔ یہاں آنے کے صرف آدھے گھنٹے بعد اس نے فون کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ لوگ کرامت کی دکان کے سامنے پیچرو سے اتر رہے تھے تو وہ چند گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ کیا شارق کو معلوم تھا کہ وہ یہاں آنے والا ہے۔ اسے یہ اطلاع کیسے ملی ہو گی۔ کیا کرامت نے بتایا ہو گا؟ نہیں، حاجی نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ شارق اور کرامت ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ کرامت تو شارق کے آنے سے بہت پہلے اس کاروبار سے الگ ہو چکا تھا۔

عرفان اور رب نواز، کرامت کو بتانے کے لئے آئے تھے۔ عرفان بہت پرانا اور قابل اعتماد آدمی تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ البتہ رب نواز پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ گروہ میں سب سے ٹپلی سطح پر کام کر رہا تھا۔ حاجی کو نئے ٹھکانے کی ضرورت پڑی تو اس کے گھر آگیا اس طرح رب نواز کو اس کے قریب آنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بارے میں حاجی نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ حاجی سوچ رہا تھا کہ کس ایسا تو نہیں کہ رب نواز کے بارے میں اس کا اندازہ غلط نکلا ہو اور رب نواز اس کے خلاف جاسوسی کر رہا ہو۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے حاجی نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ رب نواز پر نگاہ رکھے۔

رات گزر گئی۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ حاجی اس وقت بھی کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور دماغ سلگ رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آگیا۔ مشرقی افق پر سرخی یہ بتا رہی تھی کہ کچھ دیر میں سورج طلوع ہونے والا ہے۔ اس نے دآمدے میں چارپائیوں پر سوئے ہوئے عرفان اور رب نواز کی طرف دیکھا۔ اور صحن میں نیم کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا سے اسے کسی قدر سکون ملا تھا۔ باہر دکان کی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کرامت دکان پر تھا۔ اس کا کاروبار صبح سے ہی شروع ہو جاتا تھا۔

حاجی کو نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ کرامت دکان کی طرف والے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ حاجی کو دیکھ کر اس کی طرف آگیا۔

”یہ اخبار پڑھو حاجی جی۔“ کرامت اس کی طرف اخبار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت دکان

سینکڑوں پولیس والوں نے اس علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

”پولیس کو اس گودام کے بارے میں خبر شارق نے دی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس گودام کے بارے میں شارق کو کیسے پتہ چلا۔“ حاجی نے کہا۔

”شارق جس طرح کام کر رہا ہے اس کا اندازہ آپ کو ہو چکا ہے حاجی صاحب۔ لگتا ہے کہ کوئی بھی اڈا اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ بڑے بڑے اڈے تو وہ تباہ کر چکا ہے اب ایک ہی اڈا بچا ہے جہاں ہیروئن اور اسلحہ کی ایک بڑی کھیپ موجود ہے۔ اگر وہ اڈا بھی شارق کی نظروں میں آگیا تو ہم مکمل طور پر تباہ ہو جائیں گے۔“ مقصود نے کہا۔

”اپنے سارے آدمی اس اڈے کی حفاظت پر لگا دو۔“ حاجی نے کہا۔ ”اگر اس اڈے کا راز فاش ہوا تو میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور نمبر مارکیٹ والے اڈے پر پولیس کے ہاتھ کون آیا۔“

”اگو مارا گیا ہے۔ رحمت، بلا اور بکا پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں اور ظاہر ہے پولیس اس سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔“ مقصود نے بتایا۔

”ختم کر دو انہیں۔“ حاجی چیخا۔ ”جیسے بھی ہو انہیں ختم کر دو۔“

”یہ ممکن نہیں ہے حاجی صاحب۔“ مقصود نے جواب دیا۔ ”یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ گودام آپ کا تھا۔ پولیس اب ان سے یہی معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ دوسرے اڈے کہاں ہیں۔ یا آپ کے بارے میں اور آپ کے قریبی ساتھیوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔ آپ کے بارے میں وہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کہاں ہیں۔ میرے بارے میں جانتے ہیں اور میں نے خود بھی اپنا ٹھکانہ بدل لیا ہے۔ میں اس وقت لنڈا بازار والے مکان میں ہوں اور وہیں سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔“

”اور یہاں بھی ہیروئن رکھی ہوئی ہے۔“ حاجی بولا۔

”جی ہاں۔ دس بارہ بوریاں ہیں۔ تھوڑا بہت اسلحہ بھی ہے اور میرے خیال میں یہ اڈا اچال سب سے زیادہ محفوظ ہے۔“ مقصود نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔“ حاجی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

چودھری کرامت چائے بنا کر لے آیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے بھی وہ لوگ اس موضوع پر خیال کرتے رہے کہ شارق ان کے بارے میں معلومات کیسے حاصل کر لیتا ہے۔

تقریباً چار بجے کے قریب عرفان وغیرہ باہر آکر اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ حاجی کمرے کے کبھی بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلیں لگتا اور کبھی اٹھ کر ٹھٹھنے لگتا۔ شارق اس پر پے در پے وار

پر گاؤں کا رش ہے۔ میں تھوڑی دیر میں اندر آؤں گا۔“

کرامت واپس چلا گیا۔ حاجی اخبار دیکھنے لگا۔ سارا اخبار اس حوالے سے خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں گلبرگ میں نالے کے پل سے تین لاشوں کی دریافت اور فاروق احمد کی بیوی رعنا کے قتل کی خبر بھی تھی۔ رعنا کے قتل والی خبر پڑھتے ہوئے حاجی کے ذہن میں گردش کچھ اور تیز ہو گئی اور فاروق احمد نے اس قتل کا الزام عرفان پر لگایا تھا کیونکہ عرفان کے خون آلود کپڑے ذہل سے ملے تھے۔

حاجی کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ کل رات آٹھ بجے جب وہ لوگ فاروق کی کوٹھی سے روانہ ہوئے تھے گلبرگ نہروالے چوک پر عرفان پیچرو سے اتر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ضروری کام ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد کرامت کے ہاں پہنچ جائے گا اور جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے جسم پر وہ لباس بھی نہیں تھا جو وہ پہنے ہوئے تھا۔ لیکن حاجی نے اس وقت اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور اب یہ خبر پڑھنے کے بعد ساری بات حاجی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے پیٹے میں لاوا سا کھولنے لگا تھا۔ اس نے چارپائی پر سوئے ہوئے عرفان کی طرف دیکھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ عرفان کا گلہ گھونٹ دے لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پاسکا تھا۔ حاجی دوسری خبریں پڑھتا رہا۔ اسلمہ کے گودام میں چھاپے والی خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے اس اڈے کے بارے میں پولیس کے ایک افسر اعلیٰ کو اطلاع شارق نے دی تھی جو خود بھی کئی سنگین مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہے اور اس اڈے کی نشاندہی شارق کے ایک قابل اعتماد ساتھی نو لکھانے کی تھی۔ وہ چھاپے کے وقت پولیس کے ساتھ تھا لیکن بعد میں پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔

حاجی یہ خبر بھی پڑھ پڑھ کر تمللا رہا تھا۔ شارق ایک طرف اسے تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہا تھا اور دوسری طرف خود پولیس اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کر رہا تھا۔ اسی اخبار میں ڈی آئی جی کا یہ بیان بھی تھا کہ شارق اگر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے تو اس کے کیڑے پر ہمدردانہ غور ہو سکتا ہے۔

حاجی یہ سب کچھ پڑھتا رہا اور اس کا خون کھولتا رہا۔ سات بجے کے قریب دلاور اٹھ گیا۔ ”آپ کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں حاجی جی۔“ وہ قریب آکر بولا۔ ”سوئے نہیں کیا؟“ ”اوئے میری تو رات ہی جاگتے ہوئے گزری ہے۔“ حاجی نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ ”چائے بنا کر لاؤ۔ میرا تو دماغ پھٹا جا رہا ہے۔“

دلاور فوراً ہی کچن کی طرف چلا گیا اور دس پندرہ منٹ میں چائے بنا کر لے آیا۔ تھوڑی دیر

بعد عرفان اور رب نواز بھی جاگ گئے تھے۔ حاجی خونخوار نظروں سے عرفان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اوئے۔ پڑھ اوئے یہ پڑھ۔“ حاجی اس کی طرف اخبار بڑھاتے ہوئے غرایا۔ ”کل جو تم نے کھلایا ہے اس کی تفصیل پڑھ لے۔ اس کم بخت فاروق نے ہمارے خلاف بیان دیا ہے اور کہا ہے کہ میری گرفتاری کے لئے ہر ممکن تعاون کرے گا۔“ وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا۔ ”میری جوانی زیادہ جوش مار رہی تھی۔ صبر نہیں ہو سکتا تھا تم سے۔ پہلے میرے لئے مصیبتیں کم ہیں جو تو نے یہ نئی حرکت بھی کر ڈالی۔“

”بس غلطی ہو گئی حاجی جی۔“ عرفان نے بے غیرتی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اخبار میں لکھا ہے کہ تم اس کے گھر سے زیور اور نقدی بھی لے گئے تھے۔ کہاں ہے وہ سب کچھ؟“ حاجی نے اسے گھورا۔

”وہ سب کچھ میں نے ایک پوٹلی میں باندھا تھا جی۔ وہاں سے بھاگتے ہوئے وہ پوٹلی راستے ہی میں کہیں گر گئی تھی۔“ عرفان نے جواب دیا۔

حاجی چند لمحے خونخوار نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر رب نواز اور دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اسے اندر لے چلو۔ میں دیکھتا ہوں اس میں کتنی جوانی ہے۔“ عرفان کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ ”مجھے معاف کر دیں حاجی جی۔“ وہ کھسکیا۔ ”پہلی مرتبہ ایسی غلطی ہوئی ہے۔ آئندہ نہیں رواں گا۔“

”میں تمہیں آئندہ ایسی غلطی کرنے کے قابل چھوڑوں گا ہی نہیں۔“ حاجی اٹھتے ہوئے بولا۔ ”لے چلو اسے اندر۔“

دلاور اور رب نواز عرفان کو ہاتھوں سے پکڑ کر کمرے میں لے آئے۔ حاجی نے بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

”یہ جتنے گا ضرور۔ اس کا منہ باندھ دو تاکہ آواز باہر نہ جائے۔“ حاجی نے کہا۔ عرفان نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر حاجی سے ملنے مانگتا رہا۔ دلاور نے چارپائی پر پڑا ہوا ایک کپڑا اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور سوالیہ نگاہوں سے حاجی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ چاقو نکالو اور۔۔۔“ حاجی خاموش ہو کر معنی خیز نگاہوں سے عرفان کی ٹانگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”سمجھ گیا جی۔“ دلاور مسکرا دیا۔ اس نے رب نواز کو اشارہ کیا اور پھر ان دونوں نے مل کر

طرف ایک رکشہ سٹارٹ ہونے کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ رکشہ سٹارٹ ہو کر ہلکی رفتار سے اس طرف آ رہا تھا۔ عرفان نے سڑک کے بیچ میں آ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

رکشہ رک گیا۔ عرفان پچھلی سیٹ پر تقریباً ”گر گیا۔

”کہاں جانا ہے باؤ جی۔“ رکشہ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر پوچھا۔

”تھانے۔۔۔۔ مجھے تھانے لے چلو۔“ عرفان نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ رکشہ ڈرائیور

چونک گیا۔ اس نے کچھ آگے جا کر رکشے کو بائیں طرف ایک گلی میں موڑ دیا۔

گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ رکشہ مختلف گلیوں سے ہوتا سڑک نہر کے قریبی مین روڈ پر نکل

آیا۔ سڑک نہر سے آگے پولیس سٹیشن تھا۔ رکشہ پولیس سٹیشن کے سامنے رکنے کے بجائے سیدھا

آگے بڑھ گیا تو عرفان سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”تھانہ پیچھے رہ گیا ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟“

”تھانے سے زیادہ محفوظ جگہ پر۔“ رکشہ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”کیا مطلب۔ کون ہو تم؟“ عرفان چونک گیا۔

”تمہارا دوست۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ اس وقت رکشہ شالیمار باغ کے گیٹ کے سامنے

سے گزر کر اگلے چوک میں پہنچ چکا تھا۔

ڈرائیور نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس جگہ روشنی تھی۔ عرفان ڈرائیور کی شکل دیکھ کر

چونک گیا۔

”ش۔۔۔۔ شش۔۔۔۔ شارق۔۔۔۔ تم۔۔۔۔“ وہ ہلکا کر رہ گیا۔

”ڈرو نہیں۔۔۔۔۔ شارق نے جواب دیا۔ ”مجھے شبہ تھا کہ حاجی آج اس ٹھکانے سے بھی

بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے میں شام کے بعد سے آس پاس گھومتا ہوا نگرانی کر رہا تھا۔ تم

نے جب تھانے چلنے کو کہا تو میں سمجھ گیا کوئی گڑبڑ ہے۔ معاملہ کیا ہے۔ تم تو حاجی کے بہت وفادار

تھے۔“

”اس نے مجھے۔۔۔۔۔“ عرفان کراہا اور پھر اسے بتانے لگا کہ حاجی نے اس کے ساتھ کیا کیا

ہے۔ ”مم۔۔۔۔۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے میری نسل ختم کی ہے۔ میں اس کے

خاندان کے ایک ایک مرد کو چن چن کر ختم کر دوں گا۔“

”گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“ شارق بولا۔

”اچھا ہوا تم مجھے مل گئے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ عرفان بولا۔

گھاس منڈی والے موڑ پر دو پولیس والے سڑک کے درمیان کھڑے رکشے کو رکنے کا اشارہ

عرفان کو اس طرح زمین پر گرا دیا جیسے بکرے کو ذبح کرنے کے لئے گرایا جاتا ہے۔ عرفان اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بری طرح پھل رہا تھا۔ حاجی نے اس کے سر پر زوردار ٹھوکر مار دی۔ عرفان کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی سی چنگاریاں ناچنے لگیں اور پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور عرفان کو جب ہوش آیا تو یہ دیکھ کر اس کی روح کانپ اٹھی کہ اسے مردانگی سے محروم کیا جا چکا تھا۔ ایک جراح بیٹھا اس کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔

”تمہارا انجام یہی ہونا چاہئے تھا۔“ قریب کرسی پر بیٹھے ہوئے حاجی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں کی غلطیوں کی وجہ سے آج میں تباہی کے دھانے پر کھڑا ہوں۔ اب میں کسی کی کوئی غلطی معاف نہیں کروں گا۔“

دلاور، رب نواز اور چودھری کرامت خوفزدہ سے کھڑے تھے۔ عرفان کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ چودھری کرامت آدھا گھنٹہ پہلے اندر آیا تھا۔ اس کی دکانداری صبح اور شام کے وقت زیادہ ہوتی تھی۔ صبح تانگے ریڑے والے روزگار کی تلاش میں نکلتے تو گھوڑوں کے لئے دن بھر کا چارہ لے لیتے تھے۔

چودھری کرامت جب اندر آیا تو عرفان کا کام ہو چکا تھا۔ حاجی کے کہنے پر وہی کچی آبادی سے ایک جراح کو لے آیا تھا جو عرفان کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ جب وہ مرہم پٹی کر کے فارغ ہوا تو حاجی نے پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اپنی زبان بند رکھنا۔ اگر تم نے کسی سے اس کا ذکر کیا تو تمہارا بھی یہی حال ہو گا اور روزانہ آکر اس کی مرہم پٹی کر جایا کرو۔“

”میری زبان بند رہے گی جناب۔ آپ فکر نہ کریں۔“ جراح نے پانچ سو کا نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور اپنی چیزیں سمیٹ کر چلا گیا۔

اسی رات دو بجے کے قریب جب سب لوگ سو رہے تھے تو عرفان اپنی چارپائی سے اٹھا اور ننگے پیروں دبے قدموں چلتا ہوا کپڑاؤں والے وال کے قریب پہنچ گیا۔ چلنے میں اسے خاصی تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ دانت میچے اس تکلیف کو برداشت کرتا رہا۔

عرفان کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کسی کی آنکھ کھل گئی تو وہ پکڑا جائے گا اور زندہ نہیں بچے گا۔ دیوار پانچ فٹ سے زیادہ اونچی نس تھی۔ عام حالات میں وہ ایک سیکنڈ میں دیوار پر چڑھ سکتا تھا۔ لیکن تکلیف کی وجہ سے اسے دیوار پر چڑھنے اور دوسری طرف اترنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

وہ لڑکھاتا ہوا گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر دائیں

سے دس کانوٹ لے لیا تھا۔

”بڑی مہربانی سنتری بادشاہ۔“ شارق رکشہ سارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”جیرے کا ہوٹل کھلا ہوا ہے۔ کو تو میں وہاں چھوڑ دوں۔“

”ہم خود چلے جائیں گے۔ تم جاؤ۔“ کانٹیل نے کہا۔

شارق رکشے کو حرکت میں لے آیا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

اسے اپنے علاقے میں پہنچنے میں مزید پندرہ منٹ لگ گئے تھے لیکن اپنی گلی کی طرف موڑنے سے پہلے اس نے رکشہ روک لیا۔ گلی سے زبردست فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”تم یہیں میرا انتظار کرو عرفان۔ میں دیکھ کر آتا ہوں معاملہ کیا ہے۔“ شارق بولا۔ ”یہاں سے ہٹنے کی کوشش تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو گی۔ اس لئے میری واپسی تک یہیں بیٹھے رہو۔“

شارق قبرستان سے نکل کر تاریکی میں چھپتا ہوا اپنی گلی کی طرف آگیا اور اسے ایک بار پھر رک جانا پڑا۔

اس کے ہنگامے والی سمت سے بڑی زبردست فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو اینیوں میں ٹھن گئی ہو۔

شارق تاریکی میں دہکا کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا پھر تاریکی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے لباس میں چھپا ہوا پستول ہاتھ میں لے کر اس کا سیٹھی کچھ ہٹا دیا تھا۔

○

کر رہے تھے۔

”ذرا سنبھل کر بیٹھ جاؤ عرفان۔ آگے پولیس ہے۔“ شارق بولا۔

”مجھے تیز بخار ہو رہا ہے۔ ان کو بتانا کہ تم میرے پڑوسی ہو اور مجھے لے کر ہسپتال جا رہے ہو۔“ عرفان نے کہا۔

”فکر مت کرو۔“ شارق بولا۔ ”انہیں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم زخمی ہو۔ باقی معاملہ میں سنبھل لوں گا۔“

رکشہ قریب پہنچ رہا تھا۔ دونوں پولیس والے رانفلین سنبھالے سڑک کے وسط میں کھڑے تھے۔ شارق چاہتا بھی تو بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اس نے قریب پہنچ کر رکشہ روک لیا۔

”کیا بات ہے سنتری بادشاہ؟“ شارق نے اس کانٹیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے قریب آگیا تھا۔ ”آج یہ روک ٹوک کیسی ہو رہی ہے۔“

”تم کون ہو۔ اس وقت کہاں سے آرہے ہو۔“ کانٹیل نے اسے گھورا۔

”لو۔۔۔۔۔ کر لو بات۔۔۔۔۔“ شارق ہنسا۔ ”بڑے بھولے ہو سنتری بادشاہ ایک رکشے والے سے پوچھتے ہو تم کون ہو۔ رکشہ ڈرائیور تو رکشہ ڈرائیور ہی ہوتا ہے۔ اس کا تو کام ہی دن رات سڑکوں پر رکشہ چلانا ہے۔ کبھی یہاں کبھی ماڈل ٹاؤن، کبھی گلبرگ اور کبھی بھائی لوہاری اور کبھی نکسلی۔“

”بہت باتیں کرتے ہو۔ لائسنس ہے تمہارے پاس۔“ کانٹیل نے کہا۔

”لائسنس تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔“ شارق نے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔ ”پر

اس وقت میں کوئی کرائے کی سواری لے کر نہیں جا رہا۔“

”یہ کون ہے کہاں سے بٹھایا ہے اسے۔ اوئے۔ کون ہو تم؟“ کانٹیل نے آخری الفاظ عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

”میں بتاتا ہوں سنتری بادشاہ۔ اس سے کیا پوچھتے ہو۔“ شارق بولا۔ ”یہ میرا ہمسایہ ہے۔ بڑا تیز بخار ہو رہا ہے میں اسے میو ہسپتال لے کر جا رہا ہوں۔ ہمسایوں کا بھی تو کوئی حق ہوتا ہے نا سنتری بادشاہ۔ اس کی حالت دیکھ کر میں جلدی میں گھر سے نکلا تھا اور لائسنس جب میں رکھنا بھول گیا لو یہ رکھ لو۔ دونوں چائے پی لیتا۔“ اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اوئے۔ اس کو تو واقعی تیز بخار ہے۔“ کانٹیل نے عرفان کا ہاتھ چھوتے ہوئے کہا۔ ”اسے جلدی لے جاؤ۔ کہیں ہمارے متھے نہ لگ جائے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے شارق کے ہاتھ

کہ حاجی کہاں چھپا ہوا ہے۔ آج رات وہ اس کی گھرانی کیلئے ہی چودھری کرامت کے آس پاس موجود تھا۔ اس نے دکان سے کچھ دور سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے رکشہ روک رکھا تھا اور پچھلی سیٹ پر نیم دراز اس طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس دوران پولیس کی ایک گاڑی بھی وہاں سے گزری تھی۔ پولیس والوں نے درخت کے نیچے رکشے کو کھڑا دیکھا بھی ہو گا لیکن انہوں نے رک کر پوچھ گچھ کی زحمت نہیں کی تھی اور پھر رات دو بجے کے قریب ایک آدمی کو دکان کے ساتھ والی گلی سے نکلنے دیکھ کر شارق چونکا تھا۔ وہ آدمی اسی طرف آرہا تھا اور جب وہ قریب پہنچا تو شارق نے اسے پہچان لیا۔ وہ حاجی کا باڈی گارڈ عرفان تھا۔ شارق عرفان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت پرانا اور حاجی کا قاتل اعتماد آدمی تھا۔ عرفان نے جب رکشے پر بیٹھے ہوئے پولیس سٹیشن چلنے کو کہا تو شارق چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور پھر شارق اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے عرفان کو اپنے بارے میں بھی بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ یہ جلی کے بھاگوں چمینکا ٹوٹنے والی بات تھی۔ شارق کو یقین تھا کہ عرفان سے حاجی کے بہت سے راز معلوم کرے گا لیکن اس طرف آتے ہی فلزنگ کی آوازوں نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ پولیس نے اس کے مکان پر ریڈ کر دیا تھا لیکن اب اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کا مکان محفوظ تھا اور فلزنگ کسی اور جگہ ہو رہی تھی۔

شارق گھوڑے شاہ کے مزار پر واپس آگیا۔ رکشہ مزار کے پچھلی طرف قبرستان میں کھڑا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا کہ عرفان رکشے میں موجود نہ تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر کراہنے کی آواز سن کر چونک گیا۔

”عرفان۔۔۔ کہاں ہو تم؟“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

”میں۔۔۔ میں یہاں ہوں شارق باؤ۔۔۔“ ایک طرف سے عرفان کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔

شارق قبروں میں چلتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ عرفان گوندی کے درختوں کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ ”کیا ہوا۔ تم یہاں کیوں آ گئے۔“ شارق بولا۔

”میں نے اس طرف کسی کے آنے کی آواز سنی تھی۔ اس لئے رکشے سے اتر کر ادھر آ گیا تھا۔“ عرفان نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”بڑی تکلیف ہو رہی ہے شارق باؤ۔“

”اس وقت تو تمہاری تکلیف کا میں کوئی علاج نہیں کر سکتا۔“ شارق نے کہا۔ ”پولیس وہاں سے جائے تو تمہاری تکلیف کا بھی کوئی علاج ہو سکتا ہے۔“

فلزنگ کی آوازیں گلی کے آخری موڑ کے دائیں طرف سے آرہی تھیں۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کا مکان بائیں طرف تھا۔ پہلے تو یہی سمجھا تھا کہ پولیس نے نوکھا کا پچھا کر کے ان کا ٹھکانہ معلوم کر لیا ہو گا اور موقع پا کر ان سب کو گرفتار کرنے کیلئے مکان پر ریڈ کر دیا تھا لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ ویسے اسے ایس پی سہیل سے کسی ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر حاجی کے خلاف اطلاعات فراہم کرنے کیلئے ایس پی سہیل کا انتخاب کیا تھا۔ سہیل ایک فرض شناس اور دیانتدار آفیسر تھا۔ اگر وہ بددیانت اور بدعہد ہوتا تو اس رات جب رنجیت سنگھ کی سلوہی کے قریب ان کی ملاقات ہوئی تھی وہ انہیں آسانی سے گرفتار کر سکتا تھا۔ اس رات شارق بھی تھا، ثمنہ بھی اور نوکھا بھی اور اتفاق سے پولیس کی موبائل آگئی تھی جس میں نصف درجن مسلح پولیس والے موجود تھے۔ یہ تینوں بھی اگرچہ مسلح تھے لیکن پولیس کی آؤ بینک رائفلوں کے سامنے ان کے پستول بے معنی ہو کر رہ جاتے۔ یہ لوگ مزاحمت کرتے تو ان تینوں کو بھون دیا جاتا اور ایس پی سہیل کو بہت بڑا کریڈٹ ملتا اور یقینی طور پر اسے اگلے رینک پر ترقی بھی مل جاتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اگلے روز نوکھا کی نشاندہی پر جب نمبر مارکیٹ والے اسلحہ ڈپو پر چھاپے مارا گیا تو ڈی آئی جی کے ساتھ پولیس کانفرنس میں ایس پی سہیل نے برملا یہ اعلان کیا تھا کہ اسلحہ کے اس ڈپو اور اس سے پہلے ہیروئن اور اسلحہ کے تمام اڈوں کی نشاندہی شارق اور ثمنہ نے کی تھی۔

شارق اور ثمنہ اگرچہ سنگین ترین جرائم میں ملوث تھے لیکن عام لوگوں کی ہمدردیاں شارق اور ثمنہ کے ساتھ تھیں۔ لوگ شارق کی ہسٹری بھی اخبارات میں پڑھ چکے تھے اور ان کے خیال میں شارق کو مجرم بنانے میں بھی پولیس ہی کا ہاتھ تھا۔ اگر جیل سے رہا ہونے کے بعد پولیس زیادتیاں نہ کرتی تو وہ ایک سیدھا سادا اور شریف شہری ہوتا لیکن پولیس نے اسے جرائم کے راستے پر دھکیل دیا اور شارق انتقامی کارروائیاں کرتے ہوئے جرائم کی دلدل میں دھنستا چلا گیا اور اب ایس پی کے بیان کے بعد تو شارق کو عام لوگوں کی مزید ہمدردیاں حاصل ہو گئی تھیں۔

شارق حاجی کے مزید خفیہ اڈوں کی تلاش میں تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح پتہ چل ہی جاتا تھا

گھر چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ شارق نے رکشہ بند کر دیا تھا۔ اس نے نیچے اتر کر مکان کی بیل بجادی۔ چند سیکنڈ بعد ہی اندر سے ٹینے کی آواز سنائی دی۔
”کون ہے؟“

”ظہور ہوں۔ دروازہ کھولو بھئی۔“ شارق نے جواب دیا۔

”ٹینے نے شارق کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ شارق کے ساتھ پولیس والے کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ وہ معاملہ سمجھ گئی تھی۔

”یہ کون ہے بی بی۔ اسے پہچانتی ہو؟“ پولیس والے نے ٹینے سے پوچھا۔

”پہچانتی نہ تو رات کو اس وقت دروازہ کیوں کھولتی۔ یہ میرا بندہ ہے۔“ ٹینے نے جواب دیا۔

”یہ غنیمت تھا کہ پولیس والے نے اس سے عرفان کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا۔

”اب میں رکشے کو اندر لے جاؤں سنتری بادشاہ۔“ شارق بولا۔

”ہاں۔ جلدی کرو۔ کہیں پھر گڑبڑ نہ شروع ہو جائے۔“ کانٹیل نے کہا۔

”قصہ کیا ہے۔ کوئی چھاپہ مارا تھا؟“ شارق نے رکشہ شارٹ کرتے ہوئے کہا۔

کل ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے بینک لوٹا تھا۔ ان کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ یہاں ایک مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ انہی کو پکڑنے کیلئے چھاپہ مارا تھا۔ ایک کم بخت مارا گیا اور باقی بھاگ گئے۔ لیکن جائیں گے کہاں؟“

”فضل حسین کیا بات ہے۔ کون ہیں یہ لوگ۔“

آواز سن کر شارق نے اس طرف دیکھا۔ ایک اور پولیس کانٹیل رائفل پکڑے اس طرف آ رہا تھا۔

”کوئی نہیں یار۔ رکشے والا ہے۔ یہیں رہتا ہے۔“ اس کانٹیل نے جواب دیا اور اپنے ساتھی کی طرف چل پڑا۔

ٹینے نے گیٹ کھول دیا تھا۔ شارق رکشے کو اندر لے گیا اور ٹینے نے گیٹ بند کر دیا تھا۔ شارق نے رکشے سے اترتے ہوئے ٹینے کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ ٹینے کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”یہ کون ہے؟“ ٹینے نے عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اپنا دوست ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”پہلے اندر تو چلو پھر تفصیل بتا دوں گا۔“

”وہ عرفان کو سہارا دے کر اندر لے آیا اور یہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی کہ اس کے تمام ساتھی کلاشنکوف رائفلس لئے ہوئے تھے۔

”پولیس کہاں ہے کیا تمہارے اڈے پر چھاپہ مارا گیا ہے؟“ عرفان نے پوچھا۔

”اگر میرے اڈے پر چھاپہ مارا ہوتا تو میں اطمینان سے یہاں نہ بیٹھا رہتا۔“ شارق نے جواب دیا۔ وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم خاموش ہو گیا اور اٹھ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

فائرنگ کی آوازوں میں شدت آگئی تھی اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی ایک کار بڑی تیزی سے اس کے مکان والی گلی سے نکلی اور اسی طرف آنے کیلئے سڑک پر مڑ گئی۔

شارق جھک کر دوڑتا ہوا ایک قبر کی آڑ میں لیٹ گیا۔ وہ کار بڑی تیز رفتاری سے مزار کے سامنے سے گزر گئی۔ اس کا رخ تیزاب احاطے کی طرف تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ سے آٹو ہینک رائفل سے پیچھے کی طرف فائرنگ کی جا رہی تھی چند سیکنڈ بعد ایک پولیس موبائل بھی گلی سے نکل کر تیز رفتاری سے اسی طرف چلی گئی۔ موبائل سے بھی فائرنگ کی جا رہی تھی۔

فائرنگ کی آوازیں تیزاب احاطے کی طرف بہت دور نکل گئی تھیں۔ شارق اٹھ کر عرفان کے پاس آ گیا۔

”آؤ اب چلیں۔“ وہ عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”چل سکتے ہو یا تمہیں گود میں اٹھا کر رکشے میں بٹھا دوں۔“

”نہیں۔ میں چل لوں گا۔“ عرفان نے جواب دیا اور وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا رکشے میں بیٹھ گیا۔

شارق رکشہ شارٹ کر کے اسے سڑک پر لے آیا اور تقریباً ”سو گز آگے جا کر اسے گلی میں موڑ دیا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ اس وقت تین بجنے والے تھے۔ فائرنگ کی آوازوں سے لوگ جاگ تو گئے ہوں گے لیکن ایسے حالات میں کوئی باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

شارق نے رکشہ جیسے ہی اپنی گلی کی طرف موڑا ایک پولیس کانٹیل اچانک ہی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ شارق نے رکشہ روک لیا۔

”کیا بات ہے سنتری بادشاہ۔“ شارق اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بڑے پولیس مقابلے ہو رہے ہیں۔ قصہ کیا ہے؟“

”کون ہو تم اور اس وقت کہاں سے آرہے ہو اور یہ کون ہے؟“ پولیس والے نے اسے گھورا۔

”میرا نام ظہور ہے۔ رکشہ چلاتا ہوں۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔“ شارق نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”وہ سامنے والے گھر میں رہتے ہیں۔ کوئی شک شبہ ہو تو میرے ساتھ چل کر پوچھ لو۔“

”کیا خیال ہے۔ حاجی کو بتا نہ دیا جائے کہ عرفان ہمارے پاس ہے۔“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے یہ خوشخبری اسے تم ہی سنا دو۔“ شارق نے کہا۔

ثینہ نے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور شارق سے پوچھ کر چودھری کرامت کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ جاگ رہے تھے اور اتفاق سے کال حاجی ہی نے ریسیو کی تھی۔

”اوئے۔۔۔ دیکھ اوئے عرفان۔“ وہ ہیلو کے جواب میں غریبا۔ وہ غالباً اس وقت زیادہ بدحواس ہو رہا تھا کہ یہ بھی نہیں جان سکا کہ ہیلو کی آواز کسی مرد کی تھی یا عورت کی۔“ مجھے معلوم ہے تیرے ساتھ کچھ زیادتی ہوئی ہے لیکن تجھے کوئی ایسی حرکت کرنے سے پہلے خود سوچنا چاہئے تھا کہ ہم کس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ اوئے۔ میں نے تو تجھے بیٹوں کی طرح اپنے ساتھ رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں تو واپس آ جا ورنہ جانتا ہے تجھے مجھ سے کہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

”تم خود پناہ کی تلاش میں بھاگے پھر رہے ہو، کسی اور کو کیا پناہ دو گے۔“ ثینہ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”میں ثینہ بول رہی ہوں پاجی۔“ ثینہ نے جواب دیا۔ ”تمہاری اطلاع کیلئے عرض ہے کہ تمہارا عرفان ہمارے پاس ہے اور ہم تمہارے ہی آدمی کو تمہارے خلاف استعمال کریں گے۔“

”بکواس کر رہی ہو تم۔“ حاجی چیخا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔“ ثینہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”شکر کرو چودھری کرامت کے گھر سے نکلتے ہی عرفان شارق کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ تو تھانے جا رہا تھا مگر شارق اسے سمجھا بجا کر اپنے ساتھ لے آیا۔ اگر وہ تھانے چلا جاتا تو پولیس اب تک تمہارا تپا نچا کر چکی ہوتی۔“

”عرفان ایسا نہیں کر سکتا۔“ حاجی بولا۔ ”سزا کے باوجود وہ میرا وفادار ہے۔ وہ نہ تو پولیس کے پاس جائے گا اور نہ ہی شارق کے پاس۔ تم جھوٹ کہتی ہو۔“

”تم نے اسے جو سزا دی ہے اس پر تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو میں عرفان سے تمہاری بات کروا دیتی ہوں۔“ ثینہ نے کہا اور نوکھکا کو اشارہ کیا۔ نوکھکا عرفان کو گود میں اٹھا کر لے آیا۔ ثینہ نے ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”حاجی ہے بات کر لو۔“

نوکھکا اوپر کسی جگہ پوزیشن لئے بیٹھا تھا۔ وہ بھی نیچے آگیا۔ اس نے عرفان کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ثینہ بھی اندر آنے کے بعد عرفان کا چہرہ دیکھ کر اسے پہچان چکی تھی۔

”یہ تمہارے ہاتھ کہاں سے لگ گیا؟“ نوکھکا نے عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”حاجی نے کسی بات پر خفا ہو کر اسے سزا دی تھی اور یہ دو بجے کے قریب چوری چھپے وہاں سے نکل کر تھانے جانا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ لگ گیا اور میں اسے یہاں لے آیا۔“ شارق نے کہا۔

”مگر اسے تکلیف کیا ہے؟“ نوکھکا نے پھر پوچھا۔

”حاجی نے۔۔۔“ شارق کستے کستے رک گیا اور پھر نوکھکا کے کان میں بتانے لگا کہ کیا معاملہ ہے۔

”بڑا لعنتی ہے یہ حاجی۔“ نوکھکا بڑبڑایا اور عرفان کو ایک کمرے میں لے آیا۔

نرس رضیہ کو بتایا گیا کہ قصہ کیا تھا۔ اتفاق سے پولی فیکس مرہم گھر میں موجود تھی اس نے ٹیوب طفیل کو تھما دی کہ یہ زخم پر لگا دی جائے صبح کسی میڈیکل سٹور سے کوئی دوا منگالی جائے گی۔

”اس طرف آتے ہوئے فائرنگ کی آوازیں سن کر میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں تم لوگ تو گھیر میں نہیں آ گئے۔“ شارق نے کہا۔ ”لیکن یہ جان کر اطمینان ہوا کہ فائرنگ کسی اور طرف ہو رہی تھی۔“

”ہم بھی پہلے ہی سمجھے تھے کہ پولیس نے ہماری تلاش میں کسی غلط مکان پر چھاپہ مار دیا ہے۔“ نوکھکا نے کہا۔ ”ہم پولیس کا مقابلہ کرنے کیلئے پوری طرح تیار ہو گئے تھے۔ لیکن معاملہ کچھ اور نکلا۔“

”کل ڈاکوؤں کے کسی گروہ نے بیک لوٹا تھا اور وہ لوگ یہاں کسی مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ انہی کو گرفتار کرنے کیلئے چھاپہ مارا گیا تھا۔ ایک ڈاکو مارا گیا ہے اور باقی بھاگ گئے۔ پولیس ان کے تعاقب میں گئی ہے۔“

اگر انہیں پتا چل جائے کہ بڑے ڈاکو تو یہاں چھپے ہوئے ہیں تو وہ ان ڈاکوؤں کو بھول جائیں۔“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم عرفان کو یہاں لے آئے ہو۔ کوئی گزبڑ تو نہیں ہوگی؟“

”گزبڑ کیسی؟“ شارق بولا۔ ”یہ ہمارے لئے بڑے کام کا آدمی ثابت ہو گا۔ حاجی کے تمام راز اسے معلوم ہیں اور جب حاجی کو پتا چلے گا کہ عرفان ہمارے پاس ہے تو اس کی میا مرجائے گی۔“

”اگر اس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا زیادہ ہی ضروری سمجھتے ہو تو میں چلا جاتا ہوں شارق باؤ۔“ قریب کھڑے ہوئے طفیل نے کہا۔

”ٹھیک ہے بھائی۔ تم چلے جاؤ۔“ نوکھانے کہا۔

اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد طفیل رکشہ لے کر چلا گیا۔

صبح ناشتے کے بعد رضیہ نے طفیل ہی کو بھیج کر میڈیکل نشور سے کچھ دوائیں منگوائی تھیں۔ اس نے دوائیں نوکھانے کو دیتے ہوئے سمجھا دیا کہ زخم پر کس طرح لگائی جائیں گی۔ عرفان کو بخار بھی ہو گیا تھا۔ اس کے لئے بھی دوا منگوائی گئی تھی۔

اس کے ایک گھنٹے بعد شارق اور ثمنینہ وغیرہ عرفان والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور عرفان انہیں بتا رہا تھا کہ وہ حاجی کے ساتھ کس طرح لگا تھا۔

عرفان کی عمر اس وقت تیس بتیس سال تھی۔ وہ شاہدہ سے کچھ آگے شیخوپورہ روڈ پر واقع کوٹ عبدالرحمان کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ فرہان علی کوٹ عبدالرحمان کے ایک زمیندار کا ملازم تھا۔ بہت بڑی زمینداری تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمینداری ختم ہو گئی۔ فصلوں کی جگہ زمینوں پر بڑی بڑی فیکٹریاں وجود میں آنے لگیں۔ زمینداری سمٹ کر رہ گئی۔

عرفان اس وقت چوبیس چھبیس سال کا بھرپور جوان تھا۔ اس نے قبے کے ہائی سکول سے بیڑک کیا تھا۔ باپ کا خیال تھا کہ وہ اسے بھی زمینوں پر مٹی گری پر لگا دے گا لیکن زمیندار بڑک کے آس پاس کی زمینیں فروخت کر رہا تھا۔

عرفان شہر چلا گیا۔ اسے ایک واقف کار کے ذریعے حاجی کے سینما میں نوکری مل گئی۔ اسے پلے گیٹ کیپر لگایا گیا پھر اس کا کام اور دیانتداری کو دیکھتے ہوئے اسے بنگلہ کلرک لگا دیا گیا۔ عرفان بہت خوش تھا۔ اس نے تقریباً دو سال بنگلہ کلرک کی حیثیت سے کام لیا۔ حاجی اس پر مہربان تھا اور جب عرفان کے والد کا انتقال ہوا تو حاجی نے اسے نہ صرف دس ہزار روپے دیئے تھے بلکہ ہندو دن کی چھٹی بھی دے دی تھی کہ وہ اپنے باپ کی آخری رسومت ادا کرنے کے بعد اطمینان سے واپس آئے۔

اور جب عرفان واپس آیا تو حاجی نے اسے سینما کا سپروائزر بنا دیا تھا۔ اس طرح نہ صرف اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا بلکہ کچھ آسائش بھی مل گئیں اور پھر ایک روز حاجی کی ان مہینوں کا راز بھی کھل گیا۔ اس روز عرفان کو پہلی مرتبہ پتا چلا کہ حاجی ہیروئن کا بڑا بڑا کرتا ہے۔ تین آدمی اسے دس بجے سینما میں حاجی سے ملنے آئے تھے۔ حاجی نے ان کی بڑی خاطر مدد کی تھی اور لوگ جاتے ہوئے حاجی کو کپڑے کا ایک تھیلا دے گئے تھے جس میں بڑی مالیت کے نوٹوں کے

”حاجی صاحب۔“ عرفان ریسپور لے کر بولا۔ ”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہاری کتنی خدمت کی۔ تمہاری خاطر کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور تم نے مجھے یہ انعام دیا کہ میری آنے والی نسلوں کا راستہ بند کر دیا۔ میں تم سے اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ یہ تو اتفاق ہے کہ مجھے شارق مل گیا تھا۔ میں اپنی خوشی سے اس کے ساتھ آیا ہوں اور اب میں تمہیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ تم۔۔۔“

ثمنینہ نے اس سے ریسپور لے لیا اور ماؤتھ پیس میں بولی۔

”اب تمہاری تسلی ہو گئی پاجی۔ لیکن اطمینان رکھو۔ ابھی ہم پولیس کو تمہارے بارے میں اطلاع نہیں دیں گے اور نہ ہی عرفان کو تمہارے خلاف استعمال کریں گے۔ یہ دونوں کام ہم مناسب وقت آنے پر کریں گے۔ اس وقت تک میں تمہیں دوڑا دوڑا کرتا تھا کہ دوں گی کہ تم میں قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہیں رہے گی۔ یہ شکار کھیلنے کی ہماری پالیسی ہے۔ ابھا گجر کو بھی ہم نے اسی طرح تھکا تھکا کر مارا تھا لیکن تمہیں میں موقع دینا چاہتی ہوں۔ میں اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں جب تم خود ہمارے قدموں میں آکر گرو گے اور کتوں کی طرح ہمارے پیچ چاؤ گے۔“

جواب میں حاجی کچھ کہہ رہا تھا لیکن ثمنینہ نے فون بند کر دیا اور نوکھانے کو اشارہ کیا۔ وہ عرفان کو اٹھا کر اس کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ اس کے بعد بھی یہ لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب جمابھائی آنے لگیں تو اپنے اپنے کمروں میں جا کر لیٹ گئے۔ ثمنینہ حسب معمول اوپر والے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔

صبح دس بجے کے قریب شارق رکشہ لے کر پھر جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن نوکھانے اور ثمنینہ نے اسے منع کر دیا۔

”بعض اوقات حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی دھوکا دے جاتی ہے۔“ ثمنینہ نے کہا۔ ”رات کے اندھیرے میں اگر کوئی تمہیں نہیں پہچان سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارے چہرے کے نقوش بدل گئے ہیں اور کوئی تمہیں دن کے وقت بھی نہیں پہچان سکے گا۔ اب ہمیں حاجی کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔ عرفان ہمارے پاس ہے۔ وہ اس کے تمام ٹھکانوں سے واقف ہے۔ اگر وہ چودھری کرامت کے مکان سے کسی اور جگہ گیا تو ہمیں پتا چل جائے گا۔“

”ایسے لوگوں نے بیسیوں ٹھکانے بنا رکھے ہوتے ہیں۔ عرفان کو خواب تو نہیں آئے گا کہ وہ کون سے ٹھکانے پر گیا ہے۔“ شارق نے کہا۔

”ثمنینہ ٹھیک کہہ رہی ہے شارق باؤ۔“ نوکھانے بولا۔ ”فوری طور پر نہ سہی دو چار دن بعد تو پتا چل ہی جائے گا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔“

بندل بھرے ہوئے تھے۔ عرفان کے خیال میں یہ رقم کئی لاکھ روپے تھی۔
حاجی نے وہ تھیلا عرفان کے حوالے کرتے ہوئے اسے ہدایت کی تھی وہ سمن آباد والی کا
چلا جائے اور وہیں رک کر اس کا انتظار کرے۔

وہ کئی لاکھ کی رقم تھی۔ عرفان چاہتا تو وہ تھیلا لے کر غائب ہو جاتا لیکن وہ ایک دینار
آدی تھا اور اسی دیانتداری کی وجہ سے وہ سینما کے گیٹ کپر سے ترقی کر کے سپروائزر بنا تھا۔
کے بعد اس کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ جب کوئی نئی فلم لگتی تو ٹکٹیں اپنے آدمیوں کے ذر
بلیک کی جاتیں اور بلیک کی اس رقم میں گیٹ کپروں سے لے کر مینجر تک سب کا حصہ ہوتا
عرفان نے کبھی اس بلیک منی سے اپنا حصہ وصول نہیں کیا تھا۔ حاجی بھی اس پر گہری نگاہ رکھ
ہوئے تھا۔ اور یہ عرفان کی دیانتداری ہی تھی کہ حاجی نے کئی لاکھ روپے کی رقم اس کے حوالے
کر دی تھی۔

عرفان نے حاجی کے پاس رہتے ہوئے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی تھی اور وہ حاجی کے کاموں
سلسلے میں اکثر گاڑی لے جایا کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ حاجی ہی کی ایک گاڑی لے کر گیا تھا۔
سمن آباد والی کوٹھی میں اسے تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ حاجی کے ساتھ ایک
آدی بھی تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد حاجی نے ایک تھیلا عرفان کے حوالے کرتے ہوئے کہا
اسے ایک ہوٹل میں ان تین آدمیوں کے حوالے کر دیا جائے جو سینما میں رقم سے بھرا ہوا
دے گئے تھے۔

”یہ اپنے پاس رکھ لو۔“ حاجی نے اسے دس روپے کے نوٹ کا آدھا حصہ دیتے ہوئے
تھا۔ ”اس نوٹ کا دوسرا آدھا حصہ ان آدمیوں کے پاس ہے۔ تھیلا ان کے حوالے کرتے ہو۔
ان سے نوٹ کا وہ آدھا حصہ وصول کر لو گے اور نوٹ کا نمبر ضرور چیک کر لینا اور اس بار
خیال رکھنا کہ کسی اور کو اس لین دین کا پتا نہ چلے۔“

”اس تھیلے میں ہے کیا حاجی صاحب اسے دینے کیلئے اتنی رازداری کی کیا ضرورت ہے۔
عرفان نے کہا۔

”اس میں براؤن شوگر ہے۔“ حاجی نے کہا۔ ”اور تم وہی کرو گے جو تمہیں کہا گیا ہے۔“
عرفان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس روز اس نے پہلی مرتبہ براؤن شوگر کا نام سنا
رات ایک بجے وہ تھیلا ان لوگوں کو دے آیا تھا اور رسید کے طور پر دس روپے کے نوٹ کا
حصہ وصول کر لیا تھا۔

اس کے ایک ہفتے بعد عرفان کو پھر اس قسم کی خدمت انجام دینی پڑی تھی۔ پچھلی مرتبہ

رج اس مرتبہ حاجی نے اسے دو ہزار روپے دیئے تھے۔ عرفان خوش تو تھا لیکن اسے حیرت اس
ت پر تھی کہ تنخواہ کے علاوہ حاجی اسے لمبی لمبی رقمیں انعام میں کیوں دے رہا ہے اور یہ بات
”نیا“ دو مہینے بعد اس کی سمجھ میں آسکی تھی۔

براؤن شوگر دراصل ہیروئن تھی۔ اسے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ حاجی ہیروئن کا سنگلر ہے۔ اس کا
صوبہ سرحد کی طرف سے آتا تھا اور وہ نہ صرف پورے پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں مال
بائی کرتا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے گروہوں سے اس کے تعلقات تھے۔ بعض لوگ خود یہاں
اتے اور مال لے جاتے اور بعض جگہوں پر حاجی خود مال بھیجتا تھا۔

عرفان کو جب اس سارے دھندے کا پتا چلا تو اس نے نوکری چھوڑ دی۔ وہ ایک سیدھا سادا
جوان تھا۔ باپ نے رزق حلال سے اس کی پرورش کی تھی وہ تو نوکری کرنے شہر آیا تھا۔ نوکری
اسے مل گئی تھی مالک بھی اس پر مہربان تھا لیکن وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ مالک کی مہربانیوں کی
جہ کیا تھی اور جب پتا چلا تو اس نے نوکری چھوڑ دی۔

وہ گاؤں آگیا۔ ماں کو اس نے نہیں بتایا تھا کہ اس نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اس نے تو ماں
کو یہ بتایا تھا کہ وہ چھٹی لے کر آیا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ چند روز گاؤں میں رہے گا۔ پھر شہر جا
کر کسی اور نوکری کا بندوبست کر لے گا۔

تیسرے دن حاجی گاؤں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ مقصود بھی تھا۔ مقصود حاجی کا خاص آدی تھا۔
وہ دونوں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک الگ بیٹھے عرفان کو سمجھاتے رہے۔

”نہیں حاجی صاحب۔“ عرفان نے کہا۔ ”یہ غیر قانونی کام ہے۔ اگر میں پکڑا گیا تو بہت بے
وفائی ہوگی۔ گاؤں والوں کو پتا چلے گا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ میرے باپ نے اس
گاؤں میں بڑی عزت سے زندگی گزاری ہے۔ میں باپ کی عزت پر بٹ نہیں لگانا چاہتا۔“

اس میں شبہ نہیں کہ یہ غیر قانونی کام ہے۔“ حاجی نے کہا۔ ”لیکن تمہاری طرف کوئی آنکھ
اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیا تم نے پولیس کے بڑے بڑے افسروں اور اسمبلیوں کے ممبروں کو میرے
پاس آتے نہیں دیکھا۔ یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا کرتا ہوں۔ انہیں گھر بیٹھے ہر مہینے
لاکھوں روپے مل جاتے ہیں۔ یہ میرے کام میں مداخلت کیوں کرنے لگے۔“

”لیکن حاجی صاحب یہ ملک سے غداری ہے۔“ عرفان نے کہا۔
”ملک سے غداری۔“ حاجی مسکرایا۔ ”تم مجھے یہ بتاؤ کہ ملک کا وفادار کون ہے؟ معمولی آفیسر
سے لے کر اعلیٰ ترین عہدیدار ہر شخص نے اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھا ہے۔ کسی بڑے آفیسر کو
ہینک بھی آتی ہے تو وہ علاج کیلئے امریکہ اور انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ پیسہ تو عوام کا خرچ ہوتا ہے۔

حاجی کے ساتھ عرفان بھی عتاب کا شکار تھا۔ حاجی کیلئے اس نے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ عرفان نے آج تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس پر حاجی کو اعتراض کرنے کا موقع ملا ہو۔ عرفان اپنے دوسرے ساتھیوں کو دیکھتا تھا وہ خوب عیاشی کرتے تھے۔ ان کی راتیں ٹراب و شباب کی محفلوں میں گزرتی تھیں مگر عرفان کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی ماں نے گاؤں میں اس کی شادی طے کر رکھی تھی۔ اور عرفان اس موقع کی تلاش میں تھا کہ مکان میں رہ رہے ہو اور شاید یہ بھی تمہاری ملکیت نہیں ہے لیکن میرے ساتھ رہو گے تو مل

کیا یہ لوگ اپنے ذاتی خرچ پر بیرون ملک جاسکتے ہیں؟ نہیں میرے دوست یہ سب عیاشیاں تو کے پیسے پر ہو رہی ہیں۔ کسی کو آج تک یہ احساس نہیں ہو سکا کہ پیسہ قوم کی لمانت ہے۔ ہم نے تو سرکاری خزانے سے کبھی ایک پیسہ نہیں لیا۔ اپنا بزنس کرتے ہیں۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو چوری تو نہیں کر رہے۔ کسی کے گھر میں ڈاکہ تو نہیں ڈال رہے۔ یہ میرا بزنس ہے جس میں تمہیں بھی حصہ ملتا ہے اور پھر یہ تو سوچو کہ اس میں کمائی کتنی ہے۔ ابھی تو تم گاؤں کے اس کے مکان میں رہ رہے ہو اور شاید یہ بھی تمہاری ملکیت نہیں ہے لیکن میرے ساتھ رہو گے تو مل ڈیڑھ سال کے اندر اندر تم شہر کے کئی بڑے علاقوں میں کوٹھیاں بنا سکتے ہو اور میری اس بات یقین کر لو کہ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

عرفان کو عورتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن نبجانے کیا بات تھی کہ رعنا کو دیکھ کر وہ بچے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ رعنا اگرچہ شادی شدہ تھی لیکن بلا کی حسین تھی جو عرفان جیسے شخص کے دل پر قیامت ڈھا گئی تھی۔

فارق کی کوٹھی میں رہتے ہوئے اس نے ایک دو مرتبہ رعنا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر رعنا اپنے آپ کو بچا گئی تھی اور پھر اس رات جب حاجی اس کوٹھی سے نکلا تھا تو عرفان ہانہ لکے گاڑی سے اتر گیا تھا اور پھر کوٹھی میں داخل ہو کر اسے موقع مل گیا۔ رعنا کوٹھی میں اکیلی بیٹھی تھی اور وہ ایک سوٹ کیس میں کپڑے اور زیورات وغیرہ پیک کر رہی تھی۔ عرفان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ بھی بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے۔

رعنا نے مزاحمت کی تھی لیکن عرفان جیسے شخص کے سامنے چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ آخر میں اس نے چیختے ہوئے عرفان پر چاقو سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور عرفان نے اسی بات سے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا اور کمرے سے نکلے ہوئے اس نے تمام زیورات اور نقدی خزانہ بھیجا تھا اور بعد میں اس کی ماں اور بہن کو ذلیل کر کے کوٹھی سے نکال دیا تھا۔ اگر مرد افغانستان بھیجا تھا اور بعد میں اس کی ماں اور بہن کو ذلیل کر کے کوٹھی سے نکال دیا تھا۔ اگر مرد

حاجی کو دوسرے دن اخبارات کے ذریعے اس واقعہ کا پتا چلا تھا اور وہ اس قدر بھڑک گیا تھا کہ اس نے عرفان کو اس کی مردانگی ہی سے محروم کر دیا۔

عرفان کو اس بات کا بہت دکھ ہوا تھا۔ ایک معمولی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا۔ اس نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ وہ حاجی سے انتقام لے گا اور پھر اس رات وہ چودھری کرامت کے مکان کی بالائی کمرہ پر بھاگ نکلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تھانے جاکر پولیس کو اطلاع دے گا اور پولیس اسے گرفتار کر لے گی لیکن اتفاق سے اسے شارق مل گیا اور وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ اور اب عرفان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ شارق کے ساتھ مل کر حاجی سے اپنا انتقام لے گا۔ عرفان بات کرتے کرتے رو پڑا تھا۔

”اوتے عرفان باؤ۔“ نوکھانے کہا۔ ”مرد ہو کے روتے ہو تم فکر کیوں کرتے ہو۔ ہم حاجی

حاجی اور مقصود نے عرفان کو قائل کر ہی لیا کہ یہ کاروبار غیر قانونی ضرور ہے مگر اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ آمدنی لامحدود ہے۔ اس ملاقات کے اختتام پر عرفان ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا تھا۔

عرفان کو مزید سہولتیں مل گئی تھیں۔ حاجی نے اسے اپنا باڈی گارڈ بنا لیا تھا۔ اس کے چند مہینوں بعد شارق اور ثینہ حاجی کے گروہ میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے حاجی کیلئے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔

حاجی نے ان پر نوازشات کی بارش کر دی تھی۔ مگر ان کا ساتھ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ ان میں اختلافات شروع ہو گئے اور معاملہ قتل و غارت تک پہنچ گیا۔

عرفان کے خیال میں غلطی حاجی کی تھی۔ اس نے ایک سازش کے تحت شارق اور ثینہ کو افغانستان بھیجا تھا اور بعد میں اس کی ماں اور بہن کو ذلیل کر کے کوٹھی سے نکال دیا تھا۔ اگر مرد اور رضیہ کو اس طرح ذلیل نہ کیا جاتا تو شاید شارق سازش والی بات کو پی جاتا۔ لیکن وہ اپنی ماں اور بہن کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا تھا اور اس طرح انتقامی کارروائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک جاری تھا۔ حاجی اب تک شارق کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا البتہ شارق نے حاجی کو نقصان پہنچایا تھا کہ وہ تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔

عرفان نے حاجی کیلئے اپنا سب کچھ برباد کر لیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پولیس کے بڑے افسران اور اسمبلیوں کے ممبر اور بعض وزیر تک حاجی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہے تھے لیکن اب صورتحال بدل گئی تھی۔ ایک طرف شارق نے اسے دربر کر رکھا تھا۔ عوامی رائے عامہ بھی حاجی کے خلاف تھی۔ حاجی شارق اور پولیس سے بچنے کیلئے بھاگ رہا تھا لیکن اسے کبہ پناہ نہیں مل رہی تھی۔

رتار ہا تھا۔ حاجی وہیں تھا۔ اس نے کوئی نیا ٹھکانہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اید شارق کی اس بات پر یقین تھا کہ وہ اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع نہیں دے گا۔ ویسے حاجی کے پاس اب زیادہ آدمی نہیں رہ گئے تھے۔ اوپر کے سارے لوگ اپنی جانیں بانے کیلئے روپوش ہو گئے تھے اور جو نچلے درجے کے تھے وہ بھی ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ مختلف ڈول پر گھوم پھر کر ہیروئن بیچنے والے کارندوں نے بھی اپنی سرگرمیاں محدود کر دی تھیں۔ بڑے آدمیوں کے روپوش ہو جانے کے بعد ہی رب نواز جیسے چھوٹے آدمیوں کو حاجی کے قریب آنے کا موقع ملا تھا۔

ثمینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نچلے درجے کے لوگ انہیں نہیں پہچانتے تھے۔ شارق سے بات ہو جانے کے بعد اس نے شاہ پری کو تیار ہونے کو کہا اور خود بھی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد باہر نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر شارق بھی دنگ رہ گیا تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ بھی اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس وقت اس کے بال ہلکے کھنسی رنگ کے تھے۔ آنکھوں پر ناریک شیشوں والا چشمہ اور ہلکے سے میک اپ سے اس کا چہرہ خاصا بدل گیا تھا۔ خوبصورت پرنٹ والے شلوار سوٹ میں وہ خاصی حسین لگ رہی تھی۔ شاہ پری بھی اس سے کچھ کم نہیں تھی۔ ویسے حقیقت یہ تھی کہ شاہ پری اس سے کچھ زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

طفیل بھی تیار ہو گیا تھا۔ وہ سو فیصد رکشے والا لگ رہا تھا اور ظاہر ہے وہ ان لوگوں سے ملاقات سے پہلے بھی رکشہ ہی چلایا کرتا تھا۔ اس کا ہر انداز اور لب و لہجہ سو فیصد رکشہ ڈرائیور جیسا ہی تھا۔

شاہ پری اور ثمینہ سیٹ پر بیٹھ گئیں اور طفیل رکشہ شارٹ کر کے گیٹ کے باہر لے آیا۔ نوکھا گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا۔ طفیل تیزاب احاطے سے ہوتا ہوا جی ٹی روڈ پر آ گیا۔ ”کہاں جانا ہے بی بی لوگ۔“ کچھ اتنا پتا تو بتاؤ۔“ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انارکلی۔“ ثمینہ نے جواب دیا۔

”تو پھر دو مورے پل کی طرف سے ہی چلتے ہیں۔ گڑھی شاہو کی طرف سے تو راستہ بہت لمبا پڑے گا۔“ طفیل نے کہا۔

”لبے راستے ہی سے چلو۔“ ثمینہ بولی۔ ”یہ شاہ پری پجاری جب سے یہاں آئی ہے قید ہو کر رہ گئی ہے۔ آج ذرا سیر ہو جائے۔“

”تو چلو پھر۔ رب راکھا۔“ طفیل نے رکشہ بائیں طرف موڑ دیا۔

گڑھی شاہو کے پل سے ہوتے ہوئے طفیل رکشے کو سیدھا نکال لے گیا اور شملہ کے اوپر سے ہوتے ہوئے منگمری روڈ پر موڑ لیا۔ یہ سڑک آگے جا کر لکشی چوک کے قریب میکلوڈ روڈ

سے تمہارا انتقام اس طرح لیں گے کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد کر کے عبرت حاصل کریں گی۔“

”میری تو اس نے نسل ہی ختم کر دی۔“ عرفان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میرے بزرگ میرے خاندان کا کوئی نام لیا بھی نہیں ہو گا۔“

”ہم بھی حاجی کا قبضہ ختم کر دیں گے تو فکر نہ کر۔“ نوکھانے کہا۔ ”اب چھوٹو ان باتوں کو۔۔۔ چلو اٹھ کر بیٹھو تاش کی بازی ہو جائے۔ ذرا تمہارا دھیان بڑے گا۔“

ثمینہ فوراً ہی تاش کی گڈی لے آئی۔ اس نے شارق کو اپنا پارٹنر منتخب کیا اور نوکھا عرفان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”ان کا خیال رکھنا عرفان باؤ۔“ یہ دونوں بڑے شارپ ہیں۔ اپنے مطلب کا پتا ایسے نکالے ہیں کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔“

”کیوں ہم پر الزام لگا رہے ہو نوکھا بھائی۔“ ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پرسوں تو میر نے تمہیں پتا نکالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔“

”وہ پرسوں کی بات تھی۔ میں آج کی بات کر رہا ہوں۔ چلو تم بچے بانٹو۔“ نوکھانے کہا۔ اب ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا کہ تاش یا لوڈ کھیل کر وقت گزارنے

رہیں۔ بڑی بوریت ہو گئی تھی۔ رضیہ شاہ پری اور ثمینہ تو کچھ زیادہ بور ہو رہی تھیں۔ وہ باہر نکلتے چاہتی تھیں لیکن اس خوف سے نہیں نکل رہی تھیں کہ انہیں پہچان نہ لیا جائے۔

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد ثمینہ نے شارق کو بتا دیا تھا کہ آج وہ شاہ پری کو ساتھ لے کر شاپنگ کیلئے جائے گی۔

”تم جانتی ہو کہ حاجی کے آدمی شکاری کتوں کی طرح ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے دیکھ لیا تو سارا بتا دیا کام بگڑ جائے گا۔“ شارق نے کہا۔

”شاہ پری کو تو اب تک کسی نے دیکھا نہیں۔“ ثمینہ نے جواب دیا۔ ”مجھے بھی حاجی کے صرف چند قریبی آدمیوں نے دیکھا ہوا ہے۔ ہر شخص مجھے نہیں جانتا۔ اور جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ اپنی جانیں بچاتے پھرتے ہیں۔ اگر حاجی نے کچھ آدمی ہماری تلاش پر لگا رکھے ہیں تو وہ بہت چالاک

درجے کے ہیں۔ وہ ہمیں کہاں پہچانتے ہیں۔“

”نہیں جانتا اور جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ بہت نچلے درجے کے ہیں۔ وہ ہمیں کہاں پہچانتے ہیں۔“ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کروں گا۔ اگر جانا چاہتی ہو تو طفیل کو ساتھ لے جاؤ۔“ شارق نے کہا۔

”ہاں تمہاری یہ بات میں مان لیتی ہوں۔“ ثمینہ نے جواب دیا۔

”طفیل اس روز گھر پر ہی تھا۔ وہ تین چار روز تک چودھری کرامت والے مکان کی نگرانی

سے مل جاتی تھی۔

ثمنہ شاہ پری کو مختلف جگہوں اور عمارتوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ شاہ پری کو واقعی پہلے دفعہ اس طرح باہر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ہر چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور ثمنہ کی باتیں بھی بڑے غور سے سن رہی تھی۔

رکشہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا لوہاری گیٹ کی طرف آگیا۔ یہ شہر کا سب سے گنجان آباد علاقہ تھا۔ یہاں ہر قسم کا ٹریفک جاری تھا۔ ٹانگوں کی بھرمار تھی۔ طفیل نے رکشہ ایک دکان کے سامنے روک لیا۔ وہ دکان بند تھی اور اس کے سامنے تھڑے پر پرانی کتابوں والے نے دکان کھلی رکھی تھی۔

”بھائی میرے ذرا میرے رکشے کا خیال رکھنا۔“ طفیل نے کتب فروش کے ہاتھ میں دس کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔

”کسی اور کو تو میں رکشے کے قریب نہیں آنے دوں گا لیکن اگر کسی سنتری نے پوچھا تو کیا جواب دوں گا۔“ کتب فروش نے دس کا نوٹ جب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”سنتری کچھ نہیں کہتا۔ بس ہم ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ ان بیبیوں کو تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے۔“ طفیل نے جواب دیا۔

وہ تینوں وہاں سے چلتے ہوئے انارکلی میں آگئے۔ اس وقت پانچ بجنے والے تھے۔ انارکلی میں اس قدر رش تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ بیشتر لوگ ثمنہ اور شاہ پری کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور بعض منجلیوں نے تو قریب سے گزرتے ہوئے کندھا مارنے کی کوشش کی تھی۔

ثمنہ اور شاہ پری آگے آگے چل رہی تھیں اور طفیل ان کے نوکر کی طرح پیچھے پیچھے۔ انہوں نے کئی دکانوں سے شاپنگ کی تھی اور تمام شاپنگ بیگز طفیل نے اٹھا رکھے تھے۔ مارکیٹ میں شاپنگ کرتے ہوئے انہوں نے آلو چھو لے کی چاٹ بھی کھائی تھی۔

شاہ پری کو اس طرح گھومنا پھرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی ساری زندگی افغانستان کے ان علاقوں میں گزری تھی جنہیں چھوٹے چھوٹے دیہات ہی کہا جاسکتا تھا۔ وہ ماں باپ کے ساتھ کئی مرتبہ کلکتہ بھی گئی تھی لیکن اس بڑے اور ماڈرن شہر میں رہتے ہوئے بھی اسے کبھی گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے خاندان کے لوگ پرانی قدروں کے پابند تھے۔ عورتوں اور خصوصاً جوان لڑکیوں کا گھومنا پھرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک گھر سے دوسرے گھر جانا ہوتا تو شل کاک برقعہ اس طرح پہنا جاتا کہ کوئی غیر مردانہ کے جسم کو کیا لباس کا کوئی حصہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور یہاں شاہ پری کیلئے تو یہ دنیا ہی الگ تھی۔ وہ اس طرح آزادی سے گھومنے پھرنے سے بہت

محفوظ ہو رہی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی دکانیں رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا اٹھیں۔ جب وہ واپسی کیلئے مڑے تو طفیل تو سالن سے لدھا ہوا تھا۔ ثمنہ اور شاہ پری نے بھی کئی کئی شاپنگ بیگز اٹھا رکھے تھے۔ کئی روز بعد موقع ملا تھا اور انہوں نے خوب جی بھر کے شاپنگ کی تھی۔

وہ لوگ انارکلی سے نکل کر جیسے ہی دوسری سڑک پر مڑے طفیل ٹھٹک کر رک گیا۔ کتب فروش اپنی دکان بڑھا کر جا چکا تھا اور رکشہ کے قریب دو پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی اور دوسرے کے کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی۔

”کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔“ طفیل نے ثمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”میرے پاس رکشے کے کاغذات تو ہیں نہیں یہ لوگ اڑی کریں گے۔“

وہ لوگ رکشے کے قریب آ گئے۔ انہیں رکتے دیکھ کر ایک کانسیبل آگے آگیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی رکشے پر مارتے ہوئے بولا۔

”یہ تمہارا رکشہ ہے۔“

”جی سنتری بادشاہ۔“ طفیل نے شاپنگ بیگز بچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا غلطی ہو گئی سرکار۔“

”ہمارے ساتھ تھانے چلو نا۔ تمہیں بتاتے ہیں کیا غلطی ہو گئی۔“ کانسیبل نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے کانسیبل اس سے کیا غلطی ہوئی ہے جو اسے تھانے لے جانا چاہتے ہو۔“ ثمنہ نے کانسیبل کو گھورا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپنگ بیگ بھی سیٹ پر رکھ دیئے تھے۔

”آپ دوسرا رکشہ کر لیں بی بی۔ یہ رکشہ اب مشکوک ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی واردات میں استعمال ہوا ہو۔“ کانسیبل نے کہا۔ ”ہم دو گھنٹوں سے اس رکشے کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

”کیا۔۔۔ ثمنہ اچھل پڑی۔“ کیا کوئی گاڑی اس طرح کھڑی رہے تو مشکوک ہو جاتی ہے۔“ وہ طفیل کی طرف مڑ گئی۔ ”ڈرائیور تم رکشہ شارٹ کرو میں دیکھتی ہوں یہ کیسے روکتے ہیں۔“ اس نے شاہ پری کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں شاپنگ بیگز سنبھال کر سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ طفیل بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ کر رکشہ شارٹ کرنے لگا۔

”آپ لوگ ضد نہ کریں بی بی۔ کوئی دوسرا رکشہ دیکھ لیں۔ اسے ہم تھانے لے جائیں گے۔“ رائفل والے کانسیبل نے کہا۔

کے نیچے شلوار میں اڑھا ہوا پستول نکال کر میز پر رکھ دیا۔ شاہ پری نے بھی اس کی تھلید کی تھی۔
 ”اچھا رضیہ ڈیر!“ وہ رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب جلدی سے کھانا نکال لو۔ بڑے
 زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“
 اور پھر اس کے تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔“



اور پھر شارق وغیرہ کے لئے یہ اطلاع بڑی تشویشناک ثابت ہوئی تھی کہ حاجی چودھری
 کرامت کے مکان سے غائب ہو گیا تھا۔ یہ خبر طفیل نے دی تھی جو اس روز معلومات کرنے کیلئے
 اس طرف نکل گیا تھا۔
 ”وہ کہاں گیا ہو گا؟“ شارق بڑبڑایا۔

”اس کے بہت سے ٹھکانے مجھے معلوم ہیں شارق باؤ۔“ عرفان نے کہا۔ ”اب میں بالکل
 ٹھیک ہو گیا ہوں۔ بھاگ دوڑ سکتا ہوں کیوں نہ ہم باری باری اس کے تمام ٹھکانوں پر بھر بول
 دیں۔“

”اس طرح نہ صرف وقت ضائع ہو گا بلکہ وہ ہوشیار بھی ہو جائے گا۔“ شارق نے کہا۔
 ”پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ وہ گیا کہاں ہے اور میرا خیال ہے چودھری کرامت سے معلوم کیا
 جاسکتا ہے۔“

”چودھری کرامت کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ وہ کہاں گیا ہے لیکن کوشش کی جاسکتی ہے۔“
 عرفان نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے چلو یہ کام بھی ابھی ہو جانا چاہئے۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔
 طفیل اور عرفان بھی جانے کو تیار ہو گئے۔ عرفان کو شارق نے اس لئے ساتھ لیا تھا کہ شاید
 چودھری کرامت اس کے سامنے زبان کھول دے۔ عرفان اور طفیل پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور
 شارق ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

جب وہ اپنی گاڑی پر گھر سے نکلے تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ انہیں شادی پور روڈ
 تک پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ چودھری کرامت کی دکان کے سامنے ایک ٹریکٹر ٹرائل کھڑی تھی
 جس سے چارے کے گٹھے اتارے جا رہے تھے۔ کرامت کا ملازم لڑکا بھی قریب ہی کھڑا تھا۔

شارق نے چند گز کے فاصلے پر کار روک لی اور عرفان کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کرنے لگا۔
 عرفان کار سے اتر گیا اور ٹھٹھا دکان کے سامنے پہنچ گیا۔ کرامت کے ملازم لڑکے نے اسے کار
 سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کار اندھیرے میں تھی لیکن عرفان جب قریب پہنچا تو لڑکے نے اسے

اس وقت تین چار آدمی قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ٹینہ رکشے سے اتر آئی اور کانشیلوں
 پر چپخنے لگی۔

”کیا جرم کیا ہے اس رکشے والے نے۔ تم اسے تھانے کیوں لے جانا چاہتے ہو۔ تم لوگ
 وردی پن کر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ اس طرح شریف شہریوں کو کیوں پریشان کرتے ہو کیا
 چاہئے تمہیں۔“

ٹینہ کے اس طرح چپخنے سے ایک دو آدمی بھی اس کی حمایت میں بولنے لگے۔ کچھ اور لوگ
 جمع ہو گئے تھے۔ ٹینہ نے پولیس والوں کے خلاف یہ نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو کامیاب ہو گیا
 تھا۔ لوگ پولیس کو برا بھلا کہتے ہوئے ان کی حمایت کرنے لگے تھے۔

”ڈرائیور رکشہ چلاؤ۔ میں دیکھتی ہوں یہ کیسے روکتے ہیں۔“ ٹینہ غصے میں چپخنی ہوئی دوبارہ
 رکشے میں بیٹھ گئی۔

طفیل نے رکشہ سٹارٹ کر دیا اور اس مرتبہ واقعی دونوں کانشیلوں میں سے کسی نے اسے
 روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ ایک پولیس والا بال بین سے اپنی ہتھیلی پر رکشے کا نمبر نوٹ
 کر رہا تھا۔

”اس نے نمبر نوٹ کر لیا ہے۔“ شاہ پری نے کہا۔
 ”کچھ نہیں ہو گا بی بی شاہ پری۔“ طفیل نے جواب دیا۔

”رکشے پر نمبر اردو ہندسوں میں لکھا ہوا ہے۔ میں نے ایک کے ہندسے کو دو اور دو کے
 ہندسے کو تین بنا دیا ہوا ہے۔ وہ اس نمبر کے ہندسے کو ڈھونڈتے رہ جائیں گے جو اس نے
 نوٹ کیا ہے۔ گھر پہنچتے ہی میں رنگ سے نمبر درست کر دوں گا۔“

”ہم نے چیخ دھاڑ کر معاملہ ختم کر دیا۔ اگر وہ واقعی تمہیں تھانے لے جاتا تو؟“ ٹینہ نے کہا۔
 ”کچھ بھی نہ ہوتا ٹینہ بی بی۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”ہم رکشہ ڈرائیوروں کے پاس پولیس
 والوں سے پیچھا چھڑانے کے بیسیوں طریقے ہوتے ہیں۔“

طفیل نے اگلے موڑ سے یوٹرن لیتے ہوئے رکشہ شاہ عالی کی طرف موڑ لیا تھا۔ سڑک پر
 ٹریفک کا اژدہا تھا۔ اس لئے رکشے کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ دہلی دروازے کے قریب ٹینہ
 نے رکشہ رکوا لیا۔ اس نے طفیل کو بھیج کر ایک دکان سے پچکن نیکے وغیرہ خریدے تھے۔ جب وہ
 گھر پہنچے تو دس بج رہے تھے۔ شارق وغیرہ پریشان ہو رہے تھے۔

”ارے بھائی شاپنگ میں دیر ہو گئی تھی۔“ ٹینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر کوئی
 گڑبڑ ہو جاتی تو ہم اس سے نمٹ لیتے۔ ہم تو اپنا پورا بندوبست کر کے گئے تھے۔“ اس نے فیض

پچان لیا۔

اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے تاثرات ابھر آئے۔

”اوئے بلے۔“ عرفان اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیسے ہو یار۔ ڈر کیوں رہے ہو میں تو تمہارا دوست ہوں۔“

”میں کیوں ڈرنے لگا عرفان باؤ۔ تمہارے فتنے میں نے تو نہیں کئے تھے۔“ بلے نے جواب دیا۔

”اچھا۔ یہ بتاؤ اندر کون ہے۔ وہ لوگ ہیں یا چلے گئے۔“ عرفان بولا۔

”وہ لوگ تو چلے گئے۔ کرامت چاچا اندر ہے۔ بتاؤں اسے۔“ بلا بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ عرفان نے کہا اور بلے کے ساتھ دکان میں سے ہوتا ہوا پچھلے صحن میں آگیا۔

سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بتی جل رہی تھی اور چودھری کرامت چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹا حقے کے کش لگا رہا تھا۔

”اوئے بلے۔۔۔۔۔ کون ہے باہر۔۔۔۔۔ مال اتر گیا۔“ چودھری کرامت نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر پوچھا۔

”مال اتر رہا ہے چاچا۔ تمہارا ایک پردہنا آیا ہے۔ اسے لے کر آیا ہوں۔“ بلے نے جواب دیا۔

عرفان نے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا کہ چودھری کرامت اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور باہر دیکھ رہا تھا۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ اس لئے وہ عرفان کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا اور جب عرفان اندر داخل ہوا تو چودھری کرامت اچھل پڑا۔

”بیٹھ جاؤ چودھری۔“ عرفان نے کہا۔ ”میں دوست بن کر آیا ہوں۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تو تم سے ذرا گپ شب کرنے آیا ہوں۔“

”اس دن تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا عرفان باؤ۔“ کرامت نے کہا۔

”میں کب کہتا ہوں تم قصور دار ہو“ عرفان بولا۔ ”آرام سے بیٹھ جاؤ اور حوصلہ رکھو میں تمہارا دوست ہوں یار۔ ہماری دوستی تو بہت پرانی ہے۔ کیا میں تم سے ملنے کیلئے نہیں آ سکتا۔“

چودھری کرامت کئی منٹ بعد اپنی کیفیت پر قابو پا سکا تھا۔ اسی دوران باہر سے ٹرائی والے کی

آواز سنائی دی۔ وہ بلے کو بلا رہا تھا۔

”جاؤ دیکھو وہ کیا کہہ رہا ہے۔“ کرامت نے بلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہوٹل والے کو دو چائے کیلئے کہہ آؤ۔“

”چار چائے کا کہنا اور کار میں جو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں انہیں اندر بھیج دو۔“ عرفان نے بلے سے کہا۔

کار میں دو آدمیوں کا سن کر کرامت کا چہرہ ایک بار پھر دھواں ہو گیا۔ وہ خوفزدہ سی نظروں سے عرفان کی طرف دیکھنے لگا۔

”شاید تم ان آدمیوں کا سن کر ڈر گئے ہو۔“ عرفان بولا۔ ”وہ بھی تمہارے دوست ہیں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

بلا باہر جا چکا تھا۔ اس دوران ٹریکٹر شارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد ٹریکٹر ٹرائی وہاں سے چلی گئی اور اس کے فوراً ہی بعد شارق اور طفیل اندر داخل ہوئے۔ شارق کو دیکھ کر چودھری کرامت تھر تھر کانپنے لگا۔

”شارق باؤ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

”میں نے شارق کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“ عرفان نے کرامت کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس رات اگر میں شارق کے ہاتھ لگنے کے بجائے تھانے چلا جاتا تو حاجی کے ساتھ تم بھی مارے جاتے۔ مجھے یا شارق کو تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم تم سے چند باتیں پوچھنے کیلئے آئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گے۔“

”عرفان باؤ۔ تم جانتے ہو میرا بہت عرصہ سے حاجی سے لین دین ختم ہو چکا ہے۔ میرا تو اس سے ملنا جتنا بھی نہیں تھا۔ اس کا یہاں آنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا، لیکن میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں اسے منع کر دیتا تو تم جانتے ہو وہ مجھے کس طرح نقصان پہنچا سکتا تھا۔“

”تم نے حاجی سے دوستی کا حق ادا کیا ہے اور میں اس کے لئے تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔“ شارق نے کہا۔ ”میں حاجی کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ انکار کی صورت میں وہ تمہیں یقیناً بڑا نقصان پہنچاتا۔ بہر حال، لعنت بھیجو ان پچھلی باتوں پر ہم تو تم سے یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ حاجی کہاں گیا؟“

چودھری کرامت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بلے کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ بلے نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھیں۔ جس میں چائے کے چار گلاس تھے۔ اس نے ایک ایک گلاس سب کو دے دیا اور دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

”چل تو باہر چل کر بیٹھ میں ابھی آتا ہوں۔“ کرامت نے بلے سے کہا اور اس کے جانے کے بعد شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔ البتہ جانے سے پہلے اس نے ٹیلی فون پر مقصود سے بات کی تھی اور وہی آکر انہیں لے بھی گیا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ضرور بتا دیتا۔“

”دیکھو کرامت۔“ شارق اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تم حاجی کے پارنٹر رہے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ حاجی نے تم سے دھوکہ کیا تھا اور تمہیں دودھ میں مکھی کی طرح نکال دیا تھا۔ دھوکہ اور فراڈ اس کی فطرت میں شامل ہے مابھاجگر کے ساتھ بھی اس نے یہی کیا تھا۔ اور پھر میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی تم جانتے ہو۔ اس کا دین ایمان پیسہ ہے۔ وہ کسی کا دوست نہیں۔ عرفان کی ایک معمولی سی غلطی پر اتنی بڑی سزا۔۔۔ اس سے تمہیں یہ بھی پتا چل گیا ہو گا کہ وہ کس قدر ظالم اور سنگدل ہے۔ کل کو وہ تمہارے ساتھ بھی یہی سب کچھ کر سکتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس کے ساتھ اگرچہ میں بھی گناہوں کی اس دلدل میں پھنسا ہوا ہوں لیکن میں نے طے کر لیا ہے کہ اسے مکمل طور پر تباہ کر کے چھوڑوں گا۔ حاجی اپنی بربادی میں دوسروں کو بھی لپیٹ رہا ہے اور تم بھی اس لپیٹ میں آ سکتے ہو۔ اگر تم بہت سے دوسرے بے گناہوں کو اور اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو تو ہمیں بتا دو کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اس مرتبہ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔“

”میں سچ کہتا ہوں شارق باؤ مجھے بالکل پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔“ چودھری کرامت نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”ہم اس کا ٹھکانہ تو ایک دو دن میں معلوم کر لیں گے لیکن اگر مجھے یہ پتا چلا کہ تم اس کے ٹھکانے سے واقف تھے تو یقین کر لو کہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکے گی۔“

”مجھے بالکل نہیں معلوم شارق باؤ۔ میں اپنے بچوں کی قسم کھاتا ہوں۔“ کرامت بولا۔ ”اگر مجھے پتا چل گیا تو میں فوراً تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”میں دن میں ایک دو مرتبہ ٹیلی فون پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

گفت و شنید کے دوران وہ چائے بھی پیتے رہے۔ باتیں دوستانہ ماحول میں ہو رہی تھیں۔ شارق نے چودھری کرامت کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اگر وہ حاجی کے بارے میں اسے معلومات فراہم کرتا رہے تو وہ اسے تحفظ فراہم کرے گا۔

جب وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو بارہ بجتے والے تھے۔ چودھری کرامت بھی ان کے ساتھ باہر آیا تھا۔

یہ سڑک اس وقت بالکل سنانا پڑی تھی۔ شارق نے پہلے سوچا کہ لکھوڈیر اور محمود بوٹی سے ہوتا ہوا اس سڑک پر سیدھا راوی کے پل کی طرف نکل جائے لیکن اس طرح بہت لمبا پکڑ پڑ جاتا۔ اس نے کار داروغہ والا کی طرف موڑ لی۔ چودھری کرامت اس وقت بھی دکن کے سامنے کھڑا تھا۔ کار سامنے سے گزری تو اس نے ہاتھ ہلایا اور اندر چلا گیا۔

شارق نے کار داروغہ والا سے باغبانپورہ کی طرف موڑ دی۔ پاکستان بازار کے قریب پہنچے تو کچھ آگے سڑک کے بیچ میں پولیس کی ایک جیب دیکھ کر شارق چونک گیا۔ جیب کے پاس چار پولیس والے کھڑے تھے۔

”مجھے کچھ سٹریڈ نظر آرہی ہے۔“ شارق بولا۔ ”پچھلی سیٹ کے نیچے سے رائفلیں نکالو۔ جلدی کرو۔“

عرفان اور طفیس سیٹ سے اٹھ گئے اور سیٹ اٹھا کر اس کے نیچے رکھی ہوئی رائفلیں نکال لیں۔

ایک پولیس والا کار کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کانڈ بھی تھا۔ شارق نے کار کی رفتار کم کر دی۔

”میں ان لوگوں کے قریب پہنچتے ہی رفتار بڑھا دوں گا اور تم لوگ ہوائی فائرنگ شروع کر دینا۔ گوئی کسی پولیس والے کو نہیں لگنی چاہئے۔“

پولیس والوں کی تعداد چار ہی تھی۔ ایک جیب کے پاس کھڑا تھا۔ ایک سڑک کے درمیان میں کھڑا کار کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا اور دو ذرا ہٹ کر پوزیشن لئے کھڑے تھے۔

شارق نے کار کی رفتار کم کر دی۔ سامنے کھڑا ہوا پولیس والا ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانڈ کو دیکھا پھر کار کی طرف دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ تیجج اٹھا۔ ”یہی ہے وہ کار۔“

شارق نے ایک دم رفتار بڑھا دی۔ کار ایک زبردست جھٹکے سے اچھل کر آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی طفیل اور عرفان نے اپنی رائفلیں کھڑکیوں سے نکال کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔

پولیس والے بدحواس ہو کر ایک دم ادھر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ عرفان نے کھڑکی کے باہر جھک کر جیب پر فائرنگ کی۔ جیب کا ایک ٹکڑا دھماکے سے پھٹ گیا۔ اب اگرچہ پولیس والوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی لیکن کار فائرنگ کی پہنچ سے بہت دور نکل چکی تھی۔

شارق دبے قدموں چلتا ہوا کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گیا اور آڑ میں کھڑے ہو کر اندر کی آواز سننے لگا۔ چودھری کرامت کی آواز اگرچہ زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن اس کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ شارق کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”جو کام تم نہیں کر سکے وہ میں نے کر دیا ہے۔ شارق اور عرفان اب تک یا تو مارے جاتے ہیں یا پولیس کے گھیرے میں ہیں اور وہ بچ کر نہیں جاسکیں گے۔ تم فکر ہی مت کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں اور دوستی نبھانا جانتا ہوں۔ شارق ابھی بچہ ہے۔“

شارق آڑ سے نکل کر دروازے کے سامنے آگیا۔ چودھری کرامت کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اگر شارق کو پتا چل بھی گیا کہ پولیس کو میں نے اس کے بارے میں اطلاع دی تھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اب تم کوئی فکر مت۔“ بات کرتے کرتے وہ مڑا تو شارق کو دیکھ کر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی اور ریسور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

شارق اسے ہسپتال کی زد میں لیتا ہوا کمرے میں آگیا اور ایک ہاتھ سے ریسور اٹھا کر کلن سے لگاتے ہوئے ماؤتھ پیس میں بولا۔

”شارق کو گھیرنا مارنا اتنا آسان نہیں پاتی جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اس بد بخت کرامت کو تو میں ابھی اس کے انجام کو پہنچا دوں گا اور اب تم بھی اپنے انجام کیلئے تیار ہو جاؤ۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے کسی ٹھکانے کے بارے میں پولیس کو نہیں بتاؤں گا لیکن اب نہ صرف پولیس تمہارے پیچھے لگے گی بلکہ میں بھی تمہارا پیچھا کروں گا۔ جتنا بھاگ سکتے ہو بھاگ لو۔“ اس نے ریسور رکھ دیا اور کرامت کی طرف بڑھا۔ ”تم تو بچوں کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ تمہیں حاجی کے ٹھکانے کا پتا نہیں۔ تم نے یہ قسم شاید اس لئے کھائی تھی کہ تمہاری بیوی کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے تمہارے نہیں ہیں۔ چلو کوئی بات نہیں تمہاری اس بات کو تو میں معاف کر سکتا ہوں لیکن تم نے پولیس کو میرے بارے میں اطلاع دے کر اتنی بڑی غلطی کی ہے جسے میں معاف نہیں کر سکتا۔ تم سمجھتے تھے کہ پولیس مجھے آسانی سے پکڑ لے گی یا گولیوں سے بھون ڈالے گی۔ تم مجھے نہیں جانتے لیکن اب تمہیں پتا چل جائے گا۔“

”مجھے معاف کر دو شارق باؤ۔“ چودھری کرامت گڑ گڑاتا ہوا اس کے قدموں پر گر گیا۔ شارق نے اسے پیر کی ٹھوک سے زور گرا دیا۔ اس دوران عرفان بھی آگیا۔ اس نے بے کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ بھی خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے بے

کچھ آگے جا کر شارق نے کار دائیں طرف ایک تنگ سی سڑک پر موڑ لی۔ یہاں سڑک کے رخ پر چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں تھیں اور ان کے پیچھے گنجان آبادی تھی۔

”شارق باؤ گاڑی اس طرف کیوں موڑ لی۔ سیدھا نکال لے جاتے۔“ طفیل نے کہا۔

”تم نے دیکھا نہیں تھا کہ پولیس والے کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر ہماری گاڑی کا نمبر لکھا ہوا تھا اور جب ہم قریب پہنچے تھے تو اس نے چیخ کر کہا تھا، یہی ہے وہ کار اس کا مطلب سمجھتے ہو۔“ شارق نے کار ایک اور گلی میں موڑتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ طفیل نے پوچھا۔

”ہمارے بارے میں مخبری کی گئی تھی اور کار کا نمبر بتا کر اطلاع دی گئی تھی کہ ہم اس طرف سے گزرنے والے ہیں۔ پولیس کی اس پارٹی سے تو ہم بچ نکلے لیکن آگے باغباپورہ تھانہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نہر کے پاس سڑک بلاک ہو گی۔“ شارق بولا۔

”پولیس کو یہ اطلاع کس نے دی ہو گی۔“ طفیل بولا۔

”چودھری کرامت کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔“ شارق بولا۔

”باہر آ کر اس نے کار کا نمبر دیکھ لیا تھا اور ہمارے وہاں سے رخصت ہوتے ہی اس نے پولیس کو فون پر اطلاع دے دی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم بے خبری میں مارے جائیں گے لیکن اب اسے کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

”چودھری تو واقعی حزامزادہ نکلا۔ اسے سزا ملنی چاہئے۔“ عرفان نے کہا۔

کئی گلیوں میں گھومنے کے بعد شارق نے کار ایک جگہ روک لی۔ جی ٹی روڈ کی طرف پولیس کے سائرن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید مزید نفری آگئی تھی اور انہیں گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

گلیاں سنسان تھیں۔ وہ دوڑتے ہوئے گلیوں میں مڑتے رہے اور بالآخر اس گلی میں پہنچ گئے جس کے اختتام پر چودھری کرامت کا مکان اور مین روڈ کی طرف دکان تھی۔

مکان کی دیوار کے پاس رک گئے۔ شارق نے طفیل کو اشارہ کیا۔ اس نے گلی کے اگلے موڑ پر جھانک کر دیکھا۔ دکان بند تھی اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا اشارہ پا کر شارق، عرفان کا سہارا لے کر بڑی آہستگی سے دیوار چڑھ گیا اور پھر اس نے عرفان کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ دیوار کے دوسری طرف اترنے میں انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چودھری کرامت ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ شارق نے عرفان کو اشارہ کیا۔ وہ دکان والے دروازے کی طرف چلا گیا۔

میں عجیب خرخراہٹ تھی۔ ”ملک سلطان کی کوٹھی ٹالے کے بالکل سامنے ہے۔ تم تو ملک سلطان کو جانتے ہو۔“ اس نے خاموش ہو کر عرفان کی طرف دیکھا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ عرفان نے کہا اور اس کا منہ دوبارہ باندھ دیا۔

چارپائی پر پڑا ہوا بلا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور جب عرفان نے کرامت پر چاقو سے وار کیا تو بلے نے بھر جھری لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بیے ہوش ہو گیا تھا۔

عرفان پر جنون طاری تھا۔ وہ کرامت پر چاقو سے پے درپے وار کرتا رہا۔ بالآخر شارق نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ کرامت کا جسم زخموں نے چور تھا اور خون کی دھاریں ہمہ ری تھیں۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔

عرفان کچھ دیر کھڑا ہنپتا رہا پھر وہ بتدریج اپنے حواس میں آتا چلا گیا۔ اس نے چاقو پھینک دیا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

”یہ کپڑے لے جاؤ۔“ شارق نے کھوئی پر لٹکے ہوئے چودھری کرامت کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”منہ ہاتھ دھو لو اور کپڑے بدل لو۔ ہمیں اب یہاں زیادہ نہیں رکنا چاہئے۔ پولیس کے سائنگ کی آوازیں قرب و جوار میں سنائی دے رہی ہیں۔“

عرفان نے ایک بار پھر اپنے خون آلود ہاتھوں اور کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اس نے بستر کی چادر سے اپنے ہاتھ صاف کئے اور کھوئی پر لٹکے ہوئے کپڑے اتار کر باہر چلا گیا۔

شارق چودھری کرامت کی لاش کو دیکھتے ہوئے عرفان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنا سنگدل اور سفاک انسان ہے۔ یہ اس نے فاروق کی بیوی رعنا کو بھی اسی طرح قتل کیا ہو گا۔

پولیس سائنگ کی آوازیں اب چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ شارق کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس پورے علاقہ کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کی گاڑی پولیس کی نظروں میں آگئی ہو گی اب پولیس کی زیادہ توجہ اسی علاقے پر ہو گی۔ شارق کا خیال درست نکلا۔ پولیس کی ایک گاڑی سائنگ بجاتی ہوئی اس گلی میں سے بھی گزری تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد طفیل اندر آ گیا۔ وہ دکان کے باہر پٹھوں کے گٹھوں میں چھپا ہوا تھا۔

شارق باؤ۔۔۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی کرامت کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پولیس اس علاقے کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ ہمارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“

”گھبراؤ نہیں پولیس گھروں کی تلاشی نہیں لے گی۔ ہم اس مکان کے اندر بالکل محفوظ ہیں۔ بشرطیکہ۔۔۔“

”آگے بول شارق باؤ۔“ طفیل بولا۔

”بشرطیکہ حاجی پولیس کو یہاں ہماری موجودگی کی اطلاع نہ دے دے۔“ شارق نے کہا۔

”اس جیسے کینے آدی سے کچھ بعید نہیں۔“ طفیل بولا۔

کو چارپائی پر پھینک دیا۔

”خاموشی سے پڑے رہو۔“ وہ غرایا۔ ”اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو گولی سے اڑا دوں گا۔“

”یہ باہر بیٹھا کیا کر رہا تھا؟“ شارق نے پوچھا۔

”ٹرائی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔“ عرفان نے بتایا۔ ”تین بجے ایک اور ٹرائی بیٹھے لے کر یہاں آنے والی ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر چودھری کرامت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں غیرت نہیں آئی پولیس کو ٹیلی فون کرتے ہوئے۔ کیا تم سمجھتے تھے کہ ہم مار دیئے جائیں گے اور تمہیں حاجی سے انعام ملے گا۔“

”مجھ سے غلطی ہو گئی عرفان باؤ۔“ کرامت اب اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔

”اس لڑکے کا اور اس کا منہ باندھ دو۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ ایسی غلطیوں کی سزا کیا ہوتی ہے۔“ شارق نے کہا۔

عرفان نے بستر کی چادر پھاڑ کر پہلے بلے کا منہ اور ہاتھ پیر باندھے اور پھر چودھری کرامت کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر پٹی باندھ دی اور پھر دونوں اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کرنے لگے۔ کرامت زمین پر لوٹ پوٹ رہا تھا۔ اگر اس کا منہ بند نہ ہوتا تو اس کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی ہوتیں۔

عرفان نے جیب سے چاقو نکال لیا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی ناک کٹ ڈالی۔ خون کا فوارہ ہمہ نکلا۔ وہ بری طرح زمین پر لوٹنے لگا۔

”میں تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ الگ کر دوں گا۔“ عرفان غرایا۔ ”تم جانتے ہو میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔“

”ایک منٹ عرفان۔“ شارق بولا۔ ”پہلے اس سے معلوم کر لو کہ حاجی اس وقت کہاں ہے۔ منہ کھول اس کا۔“

”اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو ٹکڑے کر دوں گا تمہارے۔“ عرفان کہتے ہوئے اس کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھولنے لگا پھر منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا بھی نکال لیا۔

ناک کٹ جانے سے اس کی میت ہی بدل گئی تھی۔ سارا چہرہ خون آلود تھا۔ گردن پر بھی خون بہہ رہا تھا اور فرش پر بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔

”بناؤ۔۔۔ حاجی کہاں ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ سمن آباد میں ہے۔“ کرامت نے جواب دیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز

”نہیں صاحب بہادر۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”راستے میں پولیس والوں کے علاوہ ہمیں کوئی مشکوک آدمی نہیں ملا۔ یا پھر ہم تینوں بھائی ہیں۔ ایک میں ہوں اور دو اوپر سوئے ہوئے ہیں۔“

”اوئے چل نکل یہاں سے جلدی کر۔“ ہیڈ کانسیبل نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

طفیل نے ٹریکٹر جی ٹی روڈ پر موڑ دیا۔ اس وقت جلو کی طرف سے بھی ایک ٹرالی آرہی تھی لیکن اسے نہیں روکا گیا تھا۔

پولیس کی گاڑیاں اب بھی چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ ایک نمر کے پل پر تو پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ سڑک پر عام ٹریفک تو تھا نہیں۔ گاؤں دیہاتوں کی طرف سے آنے والی ٹریکٹر ٹرالیاں اور رہڑے وغیرہ ہی تھے۔ جن پر پٹھے، مینزیاں اور دودھ کے برتن لدے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہیں روکتے۔ سرسری سے ایک دو سوال کرتے اور پھر جانے دیتے۔

پل پر ان کی ٹریکٹر ٹرالی کو بھی روکا گیا۔ ایک سب انسپکٹر بڑے اکھڑے لہجے میں طفیل سے سوالات کرنے لگا۔

”یہ ہمارا روز کا کام ہے جی۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”ہر رات اسی وقت کبھی مینزیاں اور کبھی پٹھے لے کر منڈی جاتے ہیں۔ ہمارا اس وقت ٹکنا کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔“

”تمہارے ساتھ اور کون ہے اور یہ اوپر کون لیٹا ہوا ہے۔“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”میرے بھائی ہیں صاحب جی۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”منڈی پہنچنے تک تھوڑی سی نیند پوری کر لیں گے۔ آپ چاہیں تو اوپر چڑھ کر ان کو بھی دیکھ لیں۔“

”اچھا۔ چلو جاؤ۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔

”بات کیا ہے صاحب جی۔ کس کی تلاش ہے آپ لوگوں کو۔ پورے علاقے میں پولیس پھیلی ہوئی ہے۔“ طفیل نے پوچھا۔

”شارق اور اس کے ساتھی اس علاقے میں موجود ہیں۔ پولیس پارٹی کو دھوکہ دے کر نکل تو گئے ہیں مگر ہیں اسی علاقے میں۔ ان کی گاڑی پکڑی گئی ہے۔ وہ لوگ بچ کر نہیں جاسکتے۔ پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے ہم نے۔“

”یہ شارق کون ہے صاحب بہادر؟“ طفیل نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے اسے بہت خطرناک مجرم ہے۔“ اب تم جاؤ یہاں سے۔“ سب انسپکٹر نے جواب دیا اور پیچھے کھڑی ہوئی دوسری ٹرالی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جس پر گئے لدے ہوئے تھے۔

طفیل نے ٹریکٹر کو سمیٹر میں ڈال دیا اور اس طرح وہ پولیس کے ہجوم میں سے بڑے آرام سے نکل آئے۔

عرفان بھی دوسرے کمرے سے آگیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کرامت کے کپڑے پہن لئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک ٹریکٹر کی آواز سن کر وہ تینوں چونک گئے۔ شارق نے گھڑی دیکھی۔ اڑھائی بجے تھے۔ ٹریکٹر دکان کے سامنے سڑک پر رک گیا۔ طفیل نے شارق اور عرفان کی طرف دیکھا اور فوراً ”باہر نکل گیا۔“

وہ پٹھوں سے لدی ہوئی ٹرالی تھی اور دو آدمی تھے۔ ایک ٹریکٹر پر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا پٹھوں کے گٹھوں کے اوپر۔ گٹھوں پر بیٹھے ہوئے آدمی نے ایک گٹھا نیچے لڑھکا دیا تھا۔

”او بھائی پٹھے اتارنے سے پہلے چودھری سے بات کر لو۔ ایک ٹرالی تو اس نے پہلے ہی اتروالی ہے۔“ طفیل نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں بھی تو اس نے کل سے کہا ہوا تھا۔“ اوپر والا آدمی نیچے اترتے ہوئے بولا۔ ”اگر اسے یہ ٹرالی نہیں چاہے تو ہم باغبانپورہ چلے جاتے ہیں۔“

”اندر آکر چودھری سے بات تو کر لو۔“ طفیل نے کہا۔

وہ دونوں ٹرالی سے اتر آئے۔ دکان کے پچھلے دروازے سے نکل کر صحن میں پہنچے، طفیل نے بڑی پھرتی سے دیوار کے ساتھ کھڑی کی ہوئی رائل اٹھالی اور بھیڑیے کی طرح غرایا۔

”دونوں خاموشی سے دائیں طرف والے کمرے کی طرف چلو۔ اگر کوئی حرکت کی یا آواز نکالی تو گولیوں سے بھون دوں گا۔“

وہ دونوں اچھل پڑے لیکن ظاہر ہے ان کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔ طفیل انہیں دائیں طرف والے کمرے میں لے آیا۔ جہاں شارق اور عرفان موجود تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو باندھ کر زمین پر ڈال دیا اور منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے۔

وہ تینوں دکان کے راستے باہر آ گئے۔ ٹھیک اسی وقت پولیس کی ایک جیب سڑک پر سے گزری تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے گٹھوں کی آڑ میں ہو گئے۔

جیب دور جا چکی تھی۔ تینوں باہر آ گئے۔ طفیل ٹریکٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور وہ دونوں ٹرالی پر چڑھ کر لیٹ گئے۔ اپنی رائفیں انہوں نے پٹھوں کے نیچے چھپا دی تھیں۔ طفیل نے ٹریکٹر شارٹ کیا اور اسے داروغہ والا کی طرف موڑ دیا۔

داروغہ والا موڑ پر ایک پولیس پارٹی نے انہیں روک لیا۔

”کیا بات ہے صاحب بہادر۔ آج بڑی پولیس پھر رہی ہے۔“ طفیل نے ہیڈ کانسیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ادھر تم نے مشکوک آدمیوں کو تو نہیں دیکھا۔“ ہیڈ کانسیبل نے پوچھا۔

”وہ کوٹھی تو عرصہ سے خالی پڑی ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہو سکتی ہے۔“ شارق بولا۔
 ”انہی دنوں تم نے قصور کے علاقے میں حاجی کا سونا پکڑا تھا۔“ عرفان نے کہا۔ ”اس سے
 دگنی گنتی مقدار میں سونا اس کوٹھی میں موجود تھا۔“
 ”وہ تو اس نے وہاں سے نکال لیا ہو گا؟“ شارق نے کہا۔
 ”نہیں۔ وہ سونا اب بھی اسی کوٹھی کے تہ خانے میں موجود ہے۔“ عرفان نے مسکراتے
 ہوئے جواب دیا۔

”اس بات کو تو عرصہ بیت گیا۔ حاجی نے وہ سونا وہاں سے نکال لیا ہو گا۔“ شارق نے کہا۔
 ”نہیں شارق باؤ۔ وہ سونا اب بھی وہاں موجود ہے۔“ عرفان نے جواب دیا۔ ”اگر وہ سونا وہاں
 سے نکالا گیا ہوتا تو مجھے علم ہوتا۔ وہ سونا اب بھی وہاں موجود ہے۔“
 ”تو پھر کسی دن ہو جائے حملہ اس کوٹھی پر۔“ ثینہ نے کہا۔

”کسی اور دن کیوں۔ آج ہی کیوں نہیں۔“ عرفان نے کہا۔ ”وہاں صرف ایک آدمی ہے۔
 کوٹھی کا چوکیدار۔ اسے قابو کرنا مشکل نہیں ہو گا۔ حاجی تو ویسے بھی سمن آباد میں سلطان والی
 کوٹھی میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔“
 ”تو پھر ٹھیک ہے تیاری پکڑو۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

اس وقت رات کے آٹھ ہی بجے تھے۔ شارق، طفیل اور عرفان کے ساتھ ثینہ بھی جانے کو
 تیار ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ چاروں اپنے مکان سے نکل رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی گاڑی وغیرہ نہیں
 تھی۔ اس رات چھپتی ہوئی گاڑی انہوں نے ایک سڑک پر چھوڑ دی تھی اور یہ اس کے چوتھے
 دن کی بات تھی۔

تیزاب احاطے کے چوک پر انہیں ٹیکسی مل گئی اور وہ لوگ داروغہ والا کی طرف روانہ ہو
 گئے۔

حاجی کی کوٹھی سے چند گز دور انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ وہ چاروں پیدل چلتے ہوئے کوٹھی
 کے سامنے پہنچ گئے۔ شارق وغیرہ تو کوٹھی کے سامنے درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے اور ثینہ
 نے آگے بڑھ کر کال بیل بجا دی۔ دروازہ تیسری مرتبہ بیل بجانے کے بعد ہی کھلا تھا۔ وہ گھٹے
 ہوئے جسم کا تومند آدمی تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ ثینہ نے اس کی قبض
 کے نیچے پستول کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

”کس سے ملنا ہے بی بی۔“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ثینہ کی طرف دیکھا۔

”یہ اکبر صاحب کی کوٹھی ہے نا۔ مجھے اندر آنے کے لئے راستہ تو دو۔“ ثینہ نے مسکراتے

پولیس کی سرگرمیاں سک نمر کے ساتھ باغبانپورہ تھانے تک ہی محدود تھیں۔ شالامار باغ سے
 آگے کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ مغل پورہ والے موڑ سے ذرا آگے سڑک
 کے ساتھ کھلی جگہ پر سبزی منڈی لگنا شروع ہو گئی تھی۔

گھاس منڈی کے قریب پہنچ کر طفیل نے ٹریکٹر سڑک کے کنارے پر روک لیا۔ ٹرائی پر گٹھوں
 کے اوپر بیٹھے ہوئے شارق اور عرفان بھی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے پٹھوں کے نیچے چھپائی
 ہوئی رائفلیں بھی نکال لیں۔

طفیل ٹریکٹر سے نیچے اتر آیا تھا۔ چند ہی منٹ بعد پاکستان بازار کی طرف سے ایک کار آتی
 ہوئی دکھائی دی تھی۔ اس میں صرف ایک ہی آدمی تھا۔ کار جیسے ہی سڑک پر پہنچی طفیل نے سڑک
 کے بیچ میں آکر ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور جھک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے
 آدمی سے بات کرنے لگا۔ اس دوران شارق اور عرفان بھی ٹرائی سے اتر آئے۔

”اچن چلتا چھوڑ دو اور کار سے اتر آؤ۔“ شارق نے ڈرائیور کو پستول دکھاتے ہوئے کہا۔
 ڈرائیور کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے طفیل اور عرفان کے پاس رائفلیں دیکھ لی تھیں۔ وہ
 خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

”وہ اس طرف قبرس دیکھ رہے ہو۔“ شارق نے ایک طرف اشارہ کیا۔ سڑک سے کافی ہٹ
 کر ایک قبرستان تھا جس کے سامنے کچھ حصے پر چند دکانیں بنی ہوئی تھیں جو اس وقت بند تھیں۔
 ”خاموشی سے اس قبرستان کی طرف چلے جاؤ۔ اگر شور مچانے کی کوشش کی تو لاتعداد گولیاں
 تمہارے جسم میں پیوست ہو جائیں گی۔“

وہ شخص لڑکھاتا ہوا قبرستان کی طرف چل پڑا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی وقت گر پڑے
 گا۔ شارق گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور پھر طفیل اور عرفان کے بیٹھتے ہی اس نے کار کو میسر
 میں ڈال کر یوٹرن لیا اور اسے تیزی سے جی ٹی روڈ پر دوڑایا۔

کار کا مالک سڑک پر آکر شور مچانے لگا مگر کار بہت دور نکل چکی تھی۔



”شارق باؤ۔“ عرفان کہہ رہا تھا۔ ”تمیں یاد ہے میری اور تمہاری پہلی ملاقات حاجی کی داروغہ
 والا کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔“

”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ ماجھا گجر مجھے وہاں لے کر گیا تھا۔“
 ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ عرفان بولا۔ ”اور جب تم نے حاجی کے خلاف اس کوٹھی پر ہلہ
 بولا تھا تو حاجی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ تم اس کوٹھی کے بارے میں کچھ اور بھی جانتے ہو؟“

چلو اور ایک بات ذہن میں رکھنا کوئی اور چالاکی تمہاری زندگی کا خاتمہ بھی کر سکتی ہے۔“
 ”شیر محمد چند لمحے خونخوار نظروں سے باری باری انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور برآمدے والا دروازہ کھول دیا۔

سب سے پہلے عرفان اندر داخل ہوا۔ اس نے دیوار ٹٹول کر بتی جلا دی اور شارق وغیرہ شیر محمد کو دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔

سڑک پر ٹریفک جاری تھا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ وہ دیکھ نہ لائے جائیں شارق نے دروازہ بند کر دیا اور سوالیہ نظروں سے عرفان کی طرف دیکھنے لگا۔

”اسے باندھ کر یہاں قائلین پر ڈال دیتے ہیں۔ ہم اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیں گے۔“
 عرفان نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

شارق ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ بڑا ہال کمرہ تھا جو پوری طرح آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قائلین اور صوفے بچھے ہوئے تھے۔ شیشے کی ٹاپ والی تین کلفی ٹیبلز تھیں۔ ایک دیوار پر خانہ کعبہ کی تصویر کا بہت بڑا خوبصورت فریم آویزاں تھا۔ مینٹل پیس پر بھی ڈیکوریشن کی کچھ چیزیں آراستہ تھیں۔ ہر چیز صاف ستھری تھی جس کا مطلب تھا کہ شیر محمد اپنے فرائض سے غافل نہیں تھا۔
 طفیل برآمدے میں جا کر چارپائی کی پائنٹی کی رسی نکال لایا اور شیر محمد کو باندھ کر قائلین پر ڈال دیا گیا۔

”ہمیں پچھلے کمرے کی طرف جانا ہو گا۔“ عرفان نے کہا۔
 ”تم دونوں ہمیں روکو۔“ شارق نے ثمنہ اور طفیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اول تو یہاں کی اور کے آنے کی امید نہیں لیکن اگر کوئی ابھی گیا تو اڑا دینا اسے۔“

طفیل نے جیب سے پستول نکال لیا اور شیر محمد کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ شارق اور عرفان اندرونی دروازے میں داخل ہو گئے تو ثمنہ ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

عرفان اور شارق دو تین کمروں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں رک گئے۔
 ”اس الماری کے پیچھے یہ خانے کا راستہ ہے۔“ عرفان نے شیشے کے دروازے والی ایک الماری کی طرف اشارہ کیا۔ الماری کو تالا لگا ہوا تھا اور اس میں کچھ کتابیں بھی ہوئی تھیں۔ تمام مذہبی کتابیں تھیں جنہیں دیکھ کر یہی کہا جاسکتا تھا کہ حاجی بہت دیندار اور نیک آدمی ہے۔

عرفان نے تالا توڑ دیا اور الماری کھول کر سب سے سے نیچے والے خانے سے کتابیں نکال کر آئینہ بڑی ہوئی کرسی پر رکھنے لگا۔ پھر خالی ہونے والی جگہ پر ہاتھ ڈال کر اندر لگے ہوئے ایک کنڈے کو کھینچ لیا۔ پوری الماری گھوم گئی۔

ہوئے کما اور بڑی آہستگی سے اس آدمی کو ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

”بی بی۔۔۔ آپ غلط جگہ پر آ گئی ہیں۔ یہ کوٹھی اکبر صاحب کی نہیں ہے۔“ چوکیدار نے ثمنہ کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر وہ دو قدم مزید آگے آ گئی۔

”اوہ۔۔۔ اب مجھے یاد آ گیا“ ثمنہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ کوٹھی حاجی عبداللہ کی ہے۔ ہاں ہاں بالکل وہی ہے۔“

”آپ آپ ٹھیک سمجھیں۔ مگر آپ۔۔۔“ چوکیدار کہتے کہتے خاموش ہو کر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پہلے طفیل اندر داخل ہوا پھر شارق اور آخر میں عرفان کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف سا ابھر آیا۔ ”ت۔۔۔ تم۔۔۔ تم لوگ کون ہو بھئی۔ اس طرح اندر کیوں گھس آئے ہو؟“

”واہ شیر محمد واہ۔“ عرفان مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔“
 ”ت۔۔۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ چوکیدار شیر محمد نے کہا۔ ”حاجی صاحب نے تمہارے بارے میں سب کو اطلاع دے دی ہے۔ تم نے تین دن پہلے ان کا ایک بندہ بھی مارا تھا۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے اور اگر حاجی کو پتا چل گیا کہ تم یہاں آئے ہو تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اسے پتا کیسے چلے گا۔“ عرفان نے کہتے ہوئے جیب سے پستول نکال لیا۔
 شیر محمد کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ مرکز برآمدے کی طرف دیکھنے لگا جہاں بان کی چارپائی پر اس کی دو ٹالی بندوق رکھی ہوئی تھی۔

”اب خاموشی سے اندر چلو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ عرفان غرایا۔
 ”نم غلط کر رہے ہو عرفان باؤ۔“ اگر حاجی کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“
 شیر محمد نے کہا۔

”اندر چلو۔“ عرفان نے اس کے کولہوں پر لات رسید کر دی۔
 ”ج۔۔۔ چلتا ہوں۔“ شیر محمد لڑکھڑا کر آگے بڑھ گیا۔

عرفان اس سے دو قدم پیچھے تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر شیر محمد نے اچانک ہی گھوم کر عرفان کے پیٹ پر ٹھوکر مار دی اور چارپائی پر پڑی ہوئی بندوق کی طرف لپکا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچتا شارق ہوا میں اڑتا ہوا چارپائی پر گرا اور بندوق پر قبضہ کر لیا۔

”تم واقعی بہادر ہو۔“ وہ شیر محمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ جانتے ہوئے کہ ہم چار ہیں تم نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ میں تمہاری بہادری کی داد دیتا ہوں لیکن اب خاموشی سے اندر

الاماری کے پچھلی طرف ایک کشارہ خلا تھا۔ عرفان نے اندر داخل ہو کر دیوار پر لگا ہوا سوچا آن کر دیا اور شارق کو اشارہ کیا۔

خلا میں روشنی ہو گئی تھی۔ شارق اندر داخل ہو گیا۔ تقریباً چار فٹ چوڑی سیڑھیاں تھیں۔ وہ دونوں سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آگئے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بھی ایک دروازہ تھا جس پر موٹا سا تالا لگا ہوا تھا۔ عرفان نے پستول کی تال تالے پر رکھ کر ٹراننگر دبا دیا۔ تالا ٹوٹ کر ٹک گیا۔ اسے یقین تھا کہ فائر کی آواز اس کو بھی سے باہر نہیں گئی ہوگی۔

دروازے کے دوسری طرف کشارہ ہال تھا جس کے اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولتے گئے۔ تین کمرے خالی تھے۔ ایک کمرے میں لکڑی کی پندرہ بیس پیٹیاں تھیں۔ شارق نے ایک دو پیٹیاں کھول کو دیکھیں ان سب میں روسی ساخت کے پستول بھرے ہوئے تھے اور آخری کمرے میں لکڑی کی چار پیٹیاں تھیں۔ انہیں کھولتے ہوئے شارق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انت مام بیٹیوں میں سونے کے بسکٹ بھرے ہوئے تھے اور شارق کے اندازے کے مطابق اس سونے کا مجموعی وزن چار ٹن سے کم نہیں تھا۔

”حیرت ہے۔“ وہ عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اتنا اسلحہ اور سونا یہاں موجود ہے لیکن اس کو بھی کو بالکل غیر محفوظ چھوڑ دیا گیا۔“

”اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔“ عرفان بولا۔ ”یہ سونا اور اسلحہ اس وقت یہاں لایا گیا تھا جب تم نے قصور میں اس کا سونا لوٹا تھا اور اس واقعہ کو چار مہینے ہو چکے ہیں۔ پھر یہ کو بھی پولیس کی نظروں میں آگئی۔ حاجی کی تلاش میں پولیس تین مرتبہ اس کو بھی پر چھاپہ مار چکی ہے۔ حاجی نے اگرچہ اس کے بعد ایک مرتبہ بھی اوھر کا رخ نہیں کیا لیکن اسے یہ اطمینان ہو گا کہ سونا محفوظ ہے۔ وہ جس قسم کے حالات سے دوچار رہا ہے ان کے پیش نظر اسے یہ اسلحہ اور سونا کہیں اور منتقل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اسے لے کر کہاں جاتا۔ ہر جگہ تو چھاپے پڑے رہے ہیں۔ اس لئے ہر جگہ غیر محفوظ سمجھ کر اس نے یہ مال یہیں رہنے دیا۔ صرف ایک چوکیدار کا رکھا جانا بھی ایک نفسیاتی حربہ ہو سکتا ہے کہ وہ صرف کو بھی کے سالن کی دیکھ بھال کیلئے ہے۔ ویسے اس نے خانے کا راستہ حاجی اور مقصود کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بھی ایک روم محض اتفاق سے پتا چل گیا تھا اور میں نے حاجی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“

”یہ کو بھی تو اب بھی پولیس کی نگاہ میں ہوگی۔“ شارق بولا۔ ”اگر پولیس کو بھٹک بھی مل گئی کہ یہاں کوئی موجود ہے تو وہ ریڈ کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔“

”اسی لئے تو برآمدے والا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور کوئی فالتو جی بھی نہیں جلائی گئی تھی۔“

کسی کی توجہ مبذول نہ ہو سکے۔ ویسے بھی اب کیا پروگرام ہے۔“ عرفان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹیلی فون کہاں ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”اوپر۔“ عرفان نے جواب دیا۔

وہ دونوں اوپر اس کمرے میں آگئے جہاں ٹیلی فون موجود تھا۔ ان کی آوازیں سن کر ٹینرہ بھی اس کمرے میں آگئی تھی۔ شارق نے فون کا ریسیور اٹھا کر ایس پی سہیل کے گھر کا نمبر ملایا۔ کل اس کی بیٹی نے ریسیور کی تھی۔

”پاپا کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں۔ کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ آپ ایک گھنٹے بعد فون کیجئے گا۔“ اس نے کہا۔

”ان سے کہو کہ شارق کا فون ہے۔ کھانا کھا کر مجھے اس نمبر پر رنگ کر لیں۔ میں یہاں چند منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گا۔“ شارق نے سیٹ پر لکھا ہوا نمبر نوٹ کر ریسیور رکھ دیا۔

صرف دو منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ شارق نے مسکراتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق کل ایس پی سہیل کی تھی۔

”مجھے شارق سے بات کرنی ہے۔ ابھی اس نے مجھے فون کیا تھا۔“

”شارق ہی بول رہا ہوں جناب۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”آپ کو کھانے کے دوران زحمت دی۔ لیکن کیا کروں میرے پاس وقت کم ہے اور اطلاع بہت اہم۔ اب فرمائیے کیا حکم ہے۔“

”میں تمہاری بات سن رہا ہوں۔ تفصیل سے بتاؤ۔“ سہیل نے کہا۔

”یہاں اسلحہ کی چند پیٹیاں اور تقریباً چار ٹن سونے کے بسکٹ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ کہاں فوراً بتاؤ میں آرہا ہوں۔“ سہیل بولا۔

”داروغہ والا میں حاجی کی ایک پرانی کو بھی ہے۔“ شارق بتانے لگا۔ ”اس کو بھی کے یہ خانے کے دو کمروں میں اسلحہ اور سونے کی پیٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میں یہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا چھوڑ جاؤں گا۔ ایک کمرے میں آپ کو حاجی کا ایک آدمی بھی بندھا ہوا ملے گا۔ تو آپ کتنی دیر میں آرہے ہیں۔“

”ایک گھنٹہ تو لگے گا۔“ سہیل نے جواب دیا۔

”میں ٹھیک ایک گھنٹے تک انتظار کروں گا اور آپ سے پہلے یہاں کسی اور کو نہیں پہنچنا چاہئے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟“ شارق بولا۔

”سمجھ رہا ہوں۔“

سہیل کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شارق نے فون بند کر دیا۔

”ایس پی سہیل ایک گھنٹے بعد یہاں آ رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ ہم اس کے آنے سے چند منٹ پہلے یہاں سے نکل جائیں گے۔“ شارق نے ٹیمین اور عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور اس ایک گھنٹے کے دوران کیا کیا جائے۔“ عرفان بولا۔

”چائے پی جا سکتی ہے۔“ ٹیمین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں گھومتی ہوئی کچن کی طرف نکل گئی تھی۔ وہاں ہر چیز موجود ہے۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ جلدی سے چائے بنا کر لے آؤ۔ ہم نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔“ شارق نے کہا۔

ٹیمین کچن کی طرف چلی گئی اور وہ لوگ ہال کمرے میں آ گئے۔ شیر محمد قالین پر پڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اسی رسی سے پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ طفیل اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا پستول سے کھیل رہا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ٹیمین چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کے دوران گفتگو بھی جاری رہی۔ عرفان نے شارق سے سوال کیا تھا کہ اس نے ایس پی سہیل کو اطلاع کیوں دی۔

”اس لئے کہ وہ ایک دیانتدار اور فرض شناس آفیسر ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”حاجی کے اڈوں کے بارے میں اس سے پہلے بھی اسی کو اطلاع دیتا رہا ہوں۔ اب یہاں سونے کے بسکٹوں کی چار پٹیاں ہیں اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ان پیٹیوں میں سے ایک بھی بسکٹ غائب نہیں ہو گا۔“

”پولیس کا ہر آدمی اگر ایسا ہی ذمہ دار اور فرض شناس اور دیانتدار ہوتا تو ہم اس طرح تباہی کے دہانے پر نہ کھڑے ہوتے۔“

وہ لوگ اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد وہ لوگ اٹھ کر برآمدے میں آکھڑے ہوئے پھر کوٹھی سے باہر آ گئے۔ پولیس اب کسی بھی وقت پہنچ سکتی تھی۔

”اگرچہ ساڑھے دس بج رہے تھے لیکن سڑک پر اب بھی ٹریفک رواں دواں تھا۔ زیادہ آمدورفت بسوں، ٹرکوں اور ٹریکٹر ٹریلیوں کی تھی۔ وہ چاروں کوٹھی سے تقریباً پچاس گز آگے جا کر سڑک پار کر کے اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے کسی بس وغیرہ کا انتظار کر رہے ہوں۔“

انہیں آدھا گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑا اور پھر سفید رنگ کی ایک کار اور پولیس کی چار پانچ

گاڑیاں کوٹھی کے سامنے رکیں۔ مسلح پولیس والے گاڑیوں سے اتر کر کوٹھی کے سامنے پھیل گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچھ پولیس والے رانٹیں مارتے اندر گھس گئے تھے۔ سفید کار سے اترنے والا شخص سادہ لباس میں تھا۔ وہ بھی کار سے اتر کر دوڑتا ہوا کوٹھی میں گھس گیا۔ شارق وغیرہ سڑک کے دوسری طرف کھڑے دیکھتے رہے۔ اس نے دور ہی سے سفید کار سے اترنے والے سادہ لباس والے شخص کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایس پی سہیل تھا۔

شارق مطمئن ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس نے جلو کی طرف سے آنے والی ایک ویگن کو اشارہ کیا۔ ویگن تقریباً خالی تھی۔ وہ چاروں اس میں بیٹھ گئے۔ کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے شارق نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایس پی سہیل ایک باوردی اسپیکر کے ساتھ کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

○

اخبار میں یہ خبر پڑھ کر حاجی تاج اٹھا تھا۔

وہ ان دنوں سمن آباد میں اپنے ایک پرانے کارکن سلطان کی کوٹھی میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ سلطان دراصل جرمنی میں اس کا نمائندہ تھا۔ وہ کئی سال سے جرمنی میں رہائش پذیر تھا۔ جرمنی کے علاوہ مشرقی یورپ کے اور بھی کئی ممالک سے اس کے رابطے تھے۔ کاروبار کی آڑ میں جرمنی میں جو بھی مال پہنچتا وہ سلطان کے ذریعے ہی ترسیل ہوتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ سے مال کی ترسیل میں گڑبڑ ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے جرمنی کے ایک اخبار میں بھی یہ خبر پڑھی تھی کہ پاکستان میں ہیروئن کے بین الاقوامی سمگلر حاجی عبداللہ کی گرفتاری کیلئے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اسے تھوڑی بہت گڑبڑ کا پتا تو چلا تھا لیکن تفصیلی حالات معلوم نہیں تھے۔

جرمنی میں اسے مختلف پارٹیوں سے معاملات میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ پاکستان سے مال نہیں پہنچ رہا تھا اور پارٹیاں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ حاجی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور بالآخر صورتحال معلوم کرنے کیلئے خود آگیا تھا۔

لاہور پہنچ کر بھی اس نے حاجی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فوری طور پر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں آنے کے دوسرے ہی دن اسے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ حاجی جیسا بااثر آدمی پولیس سے چھپتا پھر رہا تھا۔ لاہور پہنچ کر ہی سلطان کو شارق اور ٹیمین کے بارے میں بھی پتا چلا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں اس نے سنا ضرور تھا لیکن ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

تک اسے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔

”حاجی صاحب۔“ سلطان نے کہا۔ ”یہاں کے حالات دیکھ کر اور مقصود کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ کے خلاف ان کارروائیوں میں شارق اور شینہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ لوگ کون ہیں۔ کیا دشمنی ہے آپ سے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ آپ کا رائٹ ہینڈ ہے۔“

”غلطی میری ہی تھی۔“ حاجی نے کہا۔ ”میں نے اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا لیکن وہ بہت کم طرف نکلا۔ وہ دراصل سانپ ہے جسے میں نے آستین میں پالا تھا۔ اب وہ مجھے بار بار ڈس رہا ہے۔“

”لیکن وہ آپ کے خلاف کیوں ہوا؟ اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔“ سلطان نے پوچھا۔ ”میں نے تو سنا ہے اس نے آپ کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ آج تک کی تاریخ میں ہیروئن کی سب سے بڑی کھپ اس نے سمندر کے راستے ملک سے باہر پہنچائی تھی۔“

”ہاں یہ درست ہے۔“ حاجی نے کہا۔ ”مجھے یہ اعتراف ہے کہ واقعی بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے لیکن مجھے برباد کرنے میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ وہ اب تک مجھے اربوں ڈالر کا نقصان پہنچا چکا ہے۔ مجھے بالکل برباد کر دیا ہے اس نے۔ میرے منہ پر کالک مل دی ہے۔ پوری دنیا میں رسوائی ہو رہی ہے۔ پوری دنیا میں میری ساکھ تباہ کر دی ہے۔“

”اس کی کوئی وجہ تو ہو گی؟“ سلطان نے کہا۔

”وجہ!“ حاجی نے اسے گھورا۔ ”اسے مال لینے کیلئے افغانستان بھیجا تھا۔ وہاں اس کی نیت میں نور آگیا۔ افغان ایجنٹوں کو قتل کر کے اس نے مال پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے آدمی بروقت پہنچ گئے اور یہ جان بچا کر بھاگ آیا۔ یہاں آکر اس نے مجھے ایک نئی کہانی سنا دی۔ لیکن افغان ایجنٹ بھی یہاں پہنچ گئے اور مجھے اصل کہانی کا پتا چل گیا۔ میں نے شارق سے باز پرس کرنا چاہی تو وہ دھمکیاں دیتا ہوا بھاگ گیا۔ میرا خیال تھا وہ واپس آئے گا اور ڈانٹ ڈپٹ کر معاملہ ختم کر دے گا۔ لیکن اس نے میرے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دو آدمی اس کے ہاتھ میں مارے گئے ہیں۔“

سلطان کو حاجی کی اس کہانی پر یقین نہیں آیا تھا۔ شارق اس کا کارندہ ہی تو تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے کوئی بے ایمانی کی ہو۔ لیکن معمولی سی بات پر اتنا برا ہنگامہ۔ اس قسم کے برنس میں ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں اور ایسے معاملات افہام و تفہیم سے طے بھی ہو جاتے ہیں اور پھر شارق کو حاجی کی طاقت کا اندازہ ہو گا۔ اس سے نکرانے کیلئے ہمت کی ضرورت تھی اور شارق نے یہ ہمت کی تھی تو یقیناً کوئی اہم بات ہو گی۔ کسی چھوٹی سی بات کیلئے وہ اپنے آپ کو خطرے میں

صورتحال سے اندازہ ہوتا تھا کہ حاجی کی تباہی کے ذمہ دار شینہ اور شارق ہی ہیں۔

کئی روز بعد سلطان مقصود سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور مقصود سے ہی اسے اصل صورتحال کا علم ہوا تھا۔ مقصود سے بات ہونے کے دوسرے ہی دن نمبر مارکیٹ والے اسلحہ کے گودام پر چھاپے پڑا تھا اور پھر اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے پتا چلا تھا کہ حاجی کی تباہی کے ذمہ دار شارق اور شینہ ہی تھے۔ وہی حاجی کے اڈوں کی مخبری کر رہے تھے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ شارق بھی پولیس کو اتنا ہی مطلوب ہے جتنا حاجی۔ لیکن سلطان کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک عام آدمی حاجی سے تو شدید نفرت کرتا تھا لیکن شارق کو نہ صرف عوام کی ہمدردیاں حاصل تھیں بلکہ پولیس کا اعلیٰ سطح کا ایک حلقہ بھی اس کی حمایت میں تھا۔

اور پھر مقصود ہی سے سلطان کو یہ پتا چلا کہ حاجی ان دنوں چودھری کرامت کے ہاں پناہ گزین ہے۔ وہ کرامت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مقصود نے اس کا فون نمبر یا پتا وغیرہ بتایا تھا۔ وہ حاجی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن مقصود نے کہا تھا کہ حاجی کو اس کا نمبر دے دیا گیا ہے وہ مناسب وقت پر خود ہی اس سے رابطہ کر لے گا۔

اور پھر اس رات گیارہ بجے کے قریب اسے حاجی کا فون ملا تھا۔ فون پر زیادہ تفصیل سے بات نہیں ہوئی تھی۔ حاجی نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ اس کے گھر آ رہا ہے اور پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حاجی دو آدمیوں کے ساتھ اس کی کونٹری پر پہنچ گیا۔ ان میں ایک رب نواز تھا اور دوسرا دلاور۔ سلطان کی کونٹری میں کنال کے رقبے پر مشتمل تھی۔ ایک حصے پر رہائشی عمارت تھی اور باقی حصے پر بہت بڑا لان بنا ہوا تھا۔ کونٹری کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف آم اور جامن کے درخت بھی تھے۔ سلطان اگرچہ طویل عرصہ سے ملک سے باہر تھا لیکن اس کا ملازم بہت مناسب طریقے سے کونٹری کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا۔

کونٹری کے سامنے بیس فٹ چوڑی پختہ سڑک تھی۔ اس سے آگے چندہ بیس فٹ چوڑا پختہ تالا تھا۔ اس تالے کے وسط میں تین چار فٹ چوڑی تالی تھی جس میں پانی بہتا رہتا تھا۔ باقی حصہ خشک رہتا تھا۔ البتہ برسات کے دنوں میں یہ تالہ پانی سے بھر جاتا تھا۔ پچھلے دنوں کی بارش سے اس تالے میں اب بھی تھوڑا بہت پانی تھا۔ تالے کے دوسری طرف بھی ایسی ہی سڑک اور اس کے ساتھ کونٹری تھیں۔

سلطان کی کونٹری کے پچھلی طرف کشادہ گلی تھی اور اس طرف بھی گیٹ تھا۔ ان کونٹریوں میں رہنے والوں کی زیادہ آمدورفت اسی گلی سے ہوتی تھی۔ لیکن حاجی کی گاڑی تالے والی طرف سے آئی تھی۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جس طرح ان کی آمد ہوئی تھی اس سے سلطان کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ حاجی اب یہیں رہے گا۔ کم از کم اس وقت تک جب

نہیں ڈال سکتا تھا۔

حاجی کی بات پر یقین نہ کرنے کے باوجود سلطان نے اس سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔
”لیکن حاجی صاحب۔۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”عرفان تو آپ کا بہت ہی قابل اعتماد آدمی تھا اسے کیا ہوا؟“

”تم شارق کو نہیں جانتے۔“ حاجی نے کہا۔ ”اس کے ساتھ جو لڑکی ہے نا ثینہ وہ ناگن ہے ناگن۔ اس نے عرفان کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا ہے اور عرفان محض اس خوبصورت ناگن کی وجہ سے مجھے چھوڑ کر ان کے ساتھ چلا ہے۔“

سلطان نے مزید کوئی جرح نہیں کی۔ ویسے اسے شبہ ہو گیا تھا کہیں نہ کہیں گزبُو ضرور ہے۔ یقیناً حاجی سے کوئی ایسی غلطی ہوئی ہوگی جس کا خمیازہ وہ اب بھگت رہا تھا ہے۔ اس نے معاملے کی تحقیقات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ بھی طے کر لیا کہ اس معاملے میں اگر حاجی قصور وار ثابت ہوا تو وہ اسے چھوڑ کر خاموشی سے جرمی واپس چلا جائے گا۔

حاجی کو یہاں آئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور پھر تیسرے روز اخبار میں چودھری کرامت کے قتل کی خبر پڑھ کر وہ اچھل پڑا تھا۔ اس کے جسم کے مسام پینہ اگلنے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حاجی اس قدر زیادہ خوفزدہ ہوا تھا۔ گزشتہ رات چودھری کرامت نے اسے فون پر بتایا تھا کہ شارق اور عرفان آئے تھے اور اس سے حاجی کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن اس نے نہ صرف انہیں ٹال دیا بلکہ پولیس کو بھی شارق کے بارے میں فون پر گمنام اطلاع دے دی تھی اور اب وہ بچ نہیں سکے گا۔ وہ فون پر بات کر ہی رہا تھا کہ شارق کی آواز سنائی دی تھی۔ شارق نے دھمکی دی تھی۔ حاجی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ شارق دوبارہ وہاں پہنچ گیا تھا۔

اس کے بعد حاجی نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ پولیس کو فون کر کے کرامت کے مکان میں شارق کی موجودگی سے آگاہ کر دے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ وہ جانتا تھا کہ شارق بہت چالاک آدمی ہے اور پولیس کے پیچھے سے پہلے ہی وہاں سے نکل جائے گا اور اب اخبار میں چودھری کرامت کے قتل کی خبر پڑھ کر وہ کانپ اٹھا تھا۔ شارق نے اسے بھی دھمکی دی تھی کہ اب وہ براہ راست اس کے سامنے آئے گا۔

جب سے شارق سے تنازعہ شروع ہوا تھا شارق ہی کا پلہ بھاری رہا تھا۔ شارق اسے تباہی کے دہانے پر پہنچا چکا تھا لیکن حاجی ابھی تک اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔ بگاڑتا تو کیا وہ تو اس کا سراغ بھی نہیں لگا سکا تھا۔ اس کے برعکس خود حاجی کو ہر دوسرے تیسرے دن اپنا ٹھکانہ بدلنا پڑتا تھا اور حاجی کیلئے حیرت کی بات یہ تھی کہ شارق فوراً ہی اس کے نئے ٹھکانے کا پتا چلا لیتا تھا۔ وہ

جس طرح نہایت خفیہ طور پر چودھری کرامت کے مکان سے نکلا تھا اسے یقین تھا کہ اب شارق اس کا سراغ نہیں لگا سکے گا لیکن شارق دوبارہ عین اس وقت کرامت کے مکان پر پہنچ گیا تھا جب کرامت فون پر اس سے بات کر رہا تھا اور شارق نے کرامت سے فون کا ریسور پھین کر اس سے بات کی تھی۔

تین چار دن گزر گئے تھے۔ شارق نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شارق نے چودھری کرامت سے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ کرامت نے اپنی جان تو دے دی مگر اس کا ٹھکانہ نہیں بتایا ہو گا۔

اس روز حاجی رات بھر بے چین رہا تھا۔ اسے ایک لمحہ کو بھی نیند نہیں آ سکی تھی۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا۔ کبھی وہ بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگتا اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ صبح پانچ بجے کے قریب وہ کمرے سے نکل کر باہر آ گیا اور ننگے پیر لان میں گھاس پر ٹہلنے لگا۔ دلاور اس وقت برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی گود میں کلاشکوف رائفل رکھی ہوئی تھی۔ دلاور اور رب نواز رات کو باری باری جاگ کر پہرہ دیتے تھے۔ اس وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حاجی کو گھاس پر ٹہلتے ہوئے کچھ سکون ساملا۔ وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ دلاور نے آئیڈ گارڈن چیز اس کے پاس لا کر رکھ دی۔

”کرسی پر بیٹھ جائیں حاجی جی۔ گھاس پر اوس پڑی ہوئی ہے۔ کپڑے گیلے ہو جائیں گے۔“
”اوسے رہنے دو اوسے۔“ حاجی بولا۔ ”اب تو ہر چیز پر اوس پڑ گئی ہے۔“ دلاور دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ حاجی کچھ دیر تک تو گھاس پر ہی بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کرسی کی پشت سے نیک لگا کر اونٹھنے لگا۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب دھب کی ہلکی سی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اخبار والا گلی سے گزرتے ہوئے اخبار پھینک گیا تھا اور دلاور اپنی جگہ سے اٹھ کر اخبار اٹھانے جا رہا تھا۔ حاجی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔
”حاجی جی۔۔ حاجی جی۔۔ یہ دیکھیں کیا ہو گیا۔؟“

دلاور کی آواز سن کر حاجی نے گزبُو کر آنکھیں کھول دیں۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اب۔“ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دلاور اس کے قریب کھڑا تھا اور اس نے اخبار اپنے سامنے پھیلا رکھا تھا۔

”غضب ہو گیا حاجی جی۔“ دلاور بولا۔ پولیس نے داروغہ والا، والی کو بھی پر چھاپہ مارا ہے اور

اور پھر کلنی دیر بعد شارق نے کسی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کے بعد ٹینہ نے کچن میں جا کر چائے بنائی تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ وہاں رہے تھے پھر کوٹھی کے دروازے کھلے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے آدھے یا پونے گھنٹے بعد پولیس آئی تھی۔ یہ خانے کا خفیہ راستہ بھی پولیس کو کھلا ہوا ہی ملا تھا۔ ایک سلاہ لباس والا پولیس آفیسر اپنے ساتھیوں سے بار بار شارق اور ٹینہ کا ذکر کر رہا تھا۔

”تو یہ حرکت عرفان کی ہے۔“ حاجی غرایا۔ ”جب وہ بھاگا تو مجھے اسی وقت ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ اوئے۔ تم مقصود کو فون کرو۔ اس سے کہو۔ فوراً یہاں آئے۔“

حاجی کے چیخنے دھاڑنے کی آواز سن کر سلطان بھی اپنے کمرے سے نکل کر آگیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر حاجی نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

”معلوم ہوتا ہے شارق آپ کے سارے راز جانتا ہے۔“ سلطان نے خبر پڑھنے کے بعد کہا۔ ”جب آپ کا جھگڑا ہوا تھا تو ان چیزوں کا بندوبست آپ کو اسی وقت کر لینا چاہئے تھا۔“

”میں کس کس بات کا خیال رکھتا۔“ حاجی بولا۔ ”میرے اپنے ہی بندے بزدل نکلے۔ آج تک ان کا پتا نہیں پتا سکے اور وہ شارق۔ وہ تو چھلاوہ ہے چھلاوہ۔ پلک جھپکنے کی دیر میں ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ میں نے وہ سونا چار مہینے پہلے اس سے خانے میں رکھوایا تھا۔ میرا خیال تھا وہ وہاں محفوظ رہے گا۔ مگر وہ تو ہر جگہ پہنچ رہا ہے۔ وہ سونا میری آخری امید تھی۔ اب میں واقعی بالکل بلا ہو چکا ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا۔“

”ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے حاجی صاحب۔“ سلطان نے کہا۔ ”اور آپ تو ابھی زندہ ہیں۔ یہاں آپ کے پاس کچھ نہیں بچا تو کیا ہوا باہر تو اب بھی آپ کی وہی قدر و قیمت ہے۔ آپ کے ایک اشارے پر آپ کے قدموں پر دولت کے انبار لگ سکتے ہیں۔ آپ کچھ عرصہ لیٹے باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔“

”باہر کیسے چلا جاؤں۔“ حاجی نے کہا۔ ”تمام راستوں کی نگرانی ہو رہی ہے۔ میں تو اس شہر سے نکل سکتا ملک سے کیسے نکلوں گا اور پھر یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ لوگ میرے قدموں پر دولت کے انبار لگا دیں گے۔ اب اس بات کو بھول جاؤ کہ باہر کے ملکوں میں میری کوئی قدر و قیمت ہے۔ اب کوئی مجھے اپنے قریب بیٹھنے بھی نہیں دے گا۔ یہ بڑا گندا کاروبار ہے۔ سلطان لوگوں کو میری نہیں بلکہ اس کی ضرورت تھی جس سے وہ دولت کماتے تھے۔ اب میں انہیں ہیروئن سپلائی نہیں کر سکتا اس لئے کسی کو اب میری ضرورت نہیں ہو گی۔ ہیروئن ملک کی کیا بات کرتے ہو۔“

یہ خانے کا سارا مال پولیس کے قبضے میں آگیا ہے۔“

”کیا بکتے ہو۔“ حاجی اچھل پڑا۔ اس نے دلاور کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا۔ پہلے ہی صفحہ پر چار کالی سرخی تھی۔

”شارق کی نشاندہی پر حاجی عبداللہ کی کوٹھی پر چھاپ۔“

”کروڑوں روپے کا اسلحہ اور چار من سونا برآمد۔“

”حاجی اس خبر کو پڑھتا چلا گیا۔ اس کے دماغ سے نیند کا خمار نکل گیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے کھڑے ہوئے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے دھاڑا۔

”صبح سویرے یہی منحوس خبر سنائی تھی تم نے مجھے۔“

”یہ خبر تو اخبار میں چھپی ہے حاجی جی۔ اس میں میرا کیا قصور۔“ دلاور نے جواب دیا۔

حاجی اسے گھورتا ہوا اندر آگیا اور ہال کمرے میں ایک صوفے پر گر سا گیا۔ دلاور بھی اس کے ساتھ ہی اندر آیا تھا۔ حاجی مسلسل چیخ رہا تھا۔

”اس اخبار نے لکھا ہے کہ ایس پی سیل کو شارق نے اسی کوٹھی سے فون پر اطلاع دی تھی۔ میں جانتا چاہتا ہوں شیر محمد کہاں مر گیا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے شارق کوٹھی میں داخل کیسے ہوا تھا۔“

”حاجی جی اخبار میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب پولیس کوٹھی میں داخل ہوئی تو تمام دروازے کھلے ہوئے تھے اور کوٹھی کا چوکیدار شیر محمد قالین پر بندھا پڑا تھا۔ اس چھوٹی سی خبر میں شیر محمد کا بیان بھی چھپا ہے۔ آپ نے وہ نہیں پڑھا۔“ دلاور نے کہا۔

”اوئے میں نے تو صرف یہی ایک خبر پڑھی ہے جس نے میرے دل پر قیامت ڈھادی ہے۔ میرا آخری اثاثہ وہی تھا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس کبھی اس سے خانے تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اس سے خانے کے بارے میں تو شارق کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس نے پولیس کو کیسے بتا دیا۔“

”وہی تو آپ کو بتا رہا ہوں۔“ دلاور بولا۔ ”یہ شیر محمد کا بیان تو پڑھیں۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک جوان اور خوبصورت عورت نے کال تیل بجائی تھی۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو وہ عورت اندر گھس آئی اور اس سے کسی اکبر نائی شخص کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اسی دوران تین آدمی اندر گھس آئے جنہوں نے اسے کمرے میں لا کر رسیوں سے باندھ دیا۔ ان تین آدمیوں میں ایک عرفان تھا۔ دوسرا شارق اور تیسرا اس کیلئے اجنبی اور وہ خوبصورت عورت ٹینہ تھی۔ ٹینہ اور اجنبی آدمی اس کے پاس کھڑے رہے اور شارق اور عرفان کسی اور کمرے میں چلے گئے تھے

میں پر آکر دیکھ لو۔ جنہیں میں نے کروڑوں کا فائدہ پہنچایا ہے وہ اب مجھے ایک ٹکا بھی نہیں دیں گے۔ لوگ نوٹوں کے تھیلے بھر بھر کر میرے پاس آتے تھے اور اب۔۔۔ اب کوئی مجھ سے ملنے کو تیار نہیں ہے۔

”اس میں شبہ نہیں کہ صورت حال بہت سنگین ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شارق کا کیا بندوبست کیا جائے۔“

”اس کا بندوبست تو اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے جب اس کا کوئی سراغ ملے۔“ حاجی نے کہا۔ ”میں نے مقصود کو بلایا ہے وہ آجائے تو کچھ سوچتے ہیں۔“

اس دوران سلطان کا ملازم چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے ایک ایک کپ سب کے سامنے رکھ دیا۔

”پانی پلاؤ مجھے۔“ حاجی نے کہا۔

ملازم ایک گلاس پانی لے آیا۔ حاجی کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس حلق میں اندیل لیا اور پھر کپ اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔

رب نواز برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک پیر وگلی والی طرف گیٹ کے سامنے آکر رکی تو اس نے پہلے حاجی کو بتایا پھر جا کر گیٹ کھول دیا۔ وہ مقصود تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا حاجی اس پر چڑھ دوڑا۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے مقصود۔“ وہ اخبار اس کے سامنے لہراتے ہوئے چیخا۔ ”اس نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا ہے اور تم ان کا سراغ تک نہیں لگا سکے۔ اب یہ کہاں تک جائے گا۔ اسے تلاش کرو۔ اپنے سارے آدمی لگا دو۔“

”اپنے پاس آدمی ہیں ہی کہاں حاجی صاحب۔“ مقصود نے جواب دیا۔ ”اب کوئی بھی ہمارے قریب پھٹکنے کو تیار نہیں ہے۔ جو لوگ کتوں کی طرح ہمارے پیچھے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے آج ہمارے سائے سے بھی بچتے ہیں۔ اور ویسے بھی آج کل سارے دھندے ٹھپ ہو رہے ہیں۔ پولیس کے ڈر سے چھوٹے چھوٹے پرچون فروش بھی روپوش ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جسے شارق وغیرہ کی تلاش میں لگایا جاسکے۔“

”تو پھر وہ ہمیں تلاش کر لے گا۔“ حاجی غرایا۔ ”اس روز اس نے دھمکی دی تھی کہ اب خود سامنے آئے گا۔ یہ تو دعائیں دو کرامت کو اس نے مر کر بھی یہاں کا پتا نہیں بتایا۔ ورنہ اب تک وہ یہاں پہنچ چکا ہوتا۔“

”ایک بات سمجھ میں آتی ہے حاجی صاحب۔“ مقصود نے کہا۔ ”شارق کی ماں اور بہن

تلاش کیا جائے۔ وہ ہمارے قبضے میں آجائیں تو شارق خود بخود ہمارے قدموں پر جھک جائے گا۔“

”ماں اور بہن کو۔“ حاجی غرایا۔ ”مردوں کو تو آج تک تلاش نہیں کر سکے۔ برقعہ پوش عورتوں کو کیسے تلاش کر لو گے۔“

”انہیں تلاش کر لینا زیادہ آسان ہے حاجی صاحب۔“ مقصود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ تو پتا چل گیا ہے کہ شارق نے چند روز پہلے اپنی ماں اور بہن کو گوجرانوالہ بھیج دیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ طفیل نامی رکشہ ڈرائیور بھی ان لوگوں کے ساتھ مل گیا تھا اور اب بھی انہی کے ساتھ ہے۔ وہ گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ شارق نے اپنی ماں اور بہن کو اسی کے گھر بھیجا ہو گا۔ کیوں نہ وہاں چپک کیا جائے۔“

”تو پھر معلوم کرو انتظار کس بات کا ہے۔“ حاجی نے کہا۔

”کل میں خود گوجرانوالہ جاؤں گا اور مجھے امید ہے کہ کل شام سے پہلے آپ کو اچھی خبر سننے کو ملے گی۔“ مقصود نے کہا۔

”مجھے کل رات تک اس کا پتا چاہئے۔“ حاجی نے کہا۔ ”اس کی بہن کو پکڑ کر لاؤ یا ماں کو پھر دیکھتا ہوں وہ کیسے مجھ سے بچ کر نکلتا ہے۔“

”فکر مت کریں حاجی صاحب اب وہ بچ کر نہیں جائے گا۔“ مقصود نے کہا۔

کچھ دیر بعد مقصود چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ملازم نے ناشتہ تیار کر دیا۔ حاجی نے بڑی شکل سے چند نوالے حلق سے اتارے اور اپنے کمرے میں آگیا۔

”دوسرے کمرے میں ٹھٹھا رہا۔ اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ داروغہ والا کی کوٹھی پر پولیس کے چھاپے نے اس کی ساری امیدیں ختم کر دی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اسلحہ کی چند بیٹیاں اور چار من سونا۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ سونا لے کر وہ انڈیا کی طرف نکل جائے گا لیکن اس دوران شارق نے اسے ایک لمحہ کو بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ اور بالآخر یہ رہا بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کوٹھی کے نیچے تہ خانے کے راستے کا صرف اسے مقصود اور انان کو علم تھا۔ شارق کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کوٹھی کے نیچے کوئی تہ خانہ بھی ہے۔ اسے انان ہی لے کر وہاں پہنچا تھا اور اب حاجی سوچ رہا تھا کہ اس نے عرفان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اسے اتنی سخت سزا نہیں دی جانی چاہئے تھی اور اب وہ اپنا انتقام لے رہا تھا اور یہ حاجی کی بد قسمتی تھی کہ عرفان شارق کے ہاتھ لگ گیا تھا۔“

حاجی رات بھر جاگا تھا۔ آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں میں مٹی بھر مریجیں جھونک دی ہوں۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد اس

کی آنکھ بند ہو گئیں۔

دوپہر کو دلاور دو مرتبہ اس کے کمرے میں آیا تھا اور حاجی کو سوتا دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ اس نے حاجی کو جگانے کی ہمت نہیں کی تھی۔

چار بجے کے قریب حاجی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد بھی وہ تقریباً ایک گھنٹے تک بستر پر رہا۔ اس وقت وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ دلاور کمرے میں آیا تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”حاجی صاحب۔ آپ اٹھ کر منہ ہاتھ دھولیں۔ میں کھانا گرم کرواتا ہوں۔ دوپہر کو میں نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔“

”کھانا اس وقت کیا کھانا ہے۔ چائے بنا دو۔ بس یہی کافی ہے۔“ حاجی نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

چائے حاجی نے لان میں بیٹھ کر پی تھی۔ سلطان بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور اور رب نواز چند گز دور گھاس پر بیٹھے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔

نوبے کے قریب مقصود بھی آگیا اور اسی وقت ملازم نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ دو لوگ اٹھ کر اندر آ گئے۔

حاجی نے پہلا نوالہ اٹھایا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سلطان کے ملازم نے آگے بڑھ کر ریسپور اٹھالیا۔ چند سیکنڈ بات کی پھر میز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”حاجی صاحب کے لئے فون ہے کوئی ٹینے بی بی ہے۔“

حاجی کے ہاتھ سے نوالا چھوٹ گیا اور وہ وحشت زدہ سی نظروں سے فون کی طرف دیکھنے لگا۔

○

”میرا خیال ہے اب حاجی کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھایا لیتا چاہئے۔“ یہ بات ٹینے نے کہی تھی۔ وہ سب لوگ اس وقت ہال کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور وقت شام چھ بجے تھا۔

”آج صبح اخبار میں اپنی کوٹھی پر چھاپے کی خبر پڑھ کر وہ پاگل ہو گیا ہو گا۔ یہ اس کے بائوٹ میں آخری کیل تھی اور اب میرا خیال ہے کہ اس کا جنازہ اٹھایا دینا چاہئے۔“

”ٹینے بی بی ٹھیک کہتی ہے شارق باؤ۔“ طفیل نے کہا۔ ”آج اس کا قصہ ختم کر ہی دینا چاہئے۔“

”اور اس کے بعد کیا ہو گا؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”اگر حاجی سے مقابلہ میں بچ گیا تو اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا اور قسم اللہ کی

آپ لوگوں کے بارے میں زبان نہیں کھولوں گا۔“ طفیل نے جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ۔ ہم تھوڑی ہی دیر بعد روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن گاڑی کہاں سے آئے گی۔“ شارق بولا۔

”گاڑی کی فکر مت کرو۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں لے کر آتا ہوں۔“ طفیل کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

طفیل کے جاتے ہی انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ طے یہ پایا تھا کہ صرف مرد جائیں گے اور عورتیں گھر پر ہی رہیں گی۔ لیکن ٹینے ان کے ساتھ جانے پر ضد کرنے لگی۔

”لے چلو شارق باؤ۔ اسے بھی آخری معرکے میں حاجی کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لینے دو۔“ نوکھانے کہا۔

اور پھر ٹینے بھی تیار ہو گئی۔ اس نے جینز اور کالی ٹی شرٹ پہن لی۔ نوکھانے کلاٹکوف رائفلیں نکال لیں۔ تمام رائفلوں کے میگزین چیک کئے گئے اور ہر رائفل کے ساتھ ساتھ ایک ایک فاضل میگزین بھی رکھ دیا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد طفیل ایک کار چوری کر کے لے آیا۔

”کہاں سے لائے کار؟“ شارق نے پوچھا۔

”کوٹ خواجہ سعید کی ایک گلی میں کھڑی تھی چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ موقع ملے ہی میں اسے لے آیا۔ اور اتفاق سے ٹینکی بھی بھری ہوئی ہے۔“ طفیل نے جواب دیا۔

دس منٹ بعد وہ اس گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ ٹینے شارق کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ نوکھا عرفان اور طفیل پیچلی سیٹ پر تھے۔

ٹھیک نوبے کے وہ اس علاقے میں پہنچ گئے۔ پہلے انہوں نے کوٹھی کے آگے اور پیچھے کا ایک چکر لگایا پھر وہاں سے تقریباً سو گز دور ایک مکان کے سامنے گاڑی روک لی۔ اس مکان کے ایک پلر پر گتے پر ”ٹیلی فون کی سولت موجود ہے“ لکھا ہوا تھا۔ ٹینے کار سے اتر کر مکان پر آگئی۔ اس نے دکاندار سے ٹیلی فون مانگا اور سیٹ لے کر کاؤنٹر کے آخری سرے پر چلی گئی اور سلطان کے بنگلے کا نمبر ملانے لگی۔ کال فوراً ہی ریسپو کر لی گئی۔ وہ سلطان کا ملازم تھا۔

”حاجی سے بات کراؤ۔ اس سے کہو میں ٹینے بات کر رہی ہوں۔“ ٹینے نے کہا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر حاجی کی آواز سنائی دی۔

”تم۔۔۔ تم کتنا۔۔۔ گشتی۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔“

”تمہیں بولنے کیلئے الفاظ نہیں مل رہے۔ پہلے سوچ لو تمہیں کیا کہنا ہے۔“ ٹینے اس کی بات

نیچے گرا۔

”میں کوٹھی کے اندر جا رہا ہوں۔“ نوکھا نے طفیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں رہو اور کوئی چھت پر سے فائرنگ کرے تو تم بھی فائر کھول دینا۔“

”رک جاؤ نوکھا اندر جانا خطرناک ہو گا۔“ طفیل چیخا۔ مگر نوکھا کار کی آڑ سے نکل کر حاجی والی کوٹھی کی طرف دوڑا۔ اس نے حیرت انگیز طور پر پانچ فٹ اونچی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف چلا گیا لگا دی۔ وہ دھب کی آواز سے نیچے گرا اور برآمدے کی طرف دوڑا۔

اسی لمحے برآمدے والے دروازے کی سڑ سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ حاجی تھا۔ جو کلاشنکوف سے فائرنگ کر رہا تھا۔ نوکھا نے آم کے ایک درخت کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور تنے کی آڑ لے کر فائرنگ کرنے لگا۔ دروازے کی طرف سے فائرنگ رکی تو نوکھا درخت کی آڑ سے نکل کر برآمدے کی طرف دوڑا۔

حاجی اس وقت راتقل کا میگزین بدل رہا تھا۔ اس نے نوکھا کو آتے دیکھا تو فائر کھول دیا۔ نوکھا رک گیا۔ اس کے جسم کو اس طرح جھٹکے لگ رہے تھے جیسے اس نے بجلی کے نیچے تار کو چھو لیا ہو۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلتی ہو گیا لیکن وہ گرا نہیں وہ سنبھل گیا۔ اس نے راتقل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور دو قدم آگے بڑھ گیا۔

حاجی کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ نوکھا کا جسم گولیوں سے چھلتی تھا۔ خون کی کئی دھاریں بہہ رہی تھیں لیکن وہ راتقل سے آگے آ رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی راتقل بیدار کی حاجی نے ایک بار پھر ٹرائیگر دیا دیا۔ اس مرتبہ بھی کئی گولیاں نوکھا کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پھر لڑکھڑایا۔ اس مرتبہ وہ نہیں سنبھل سکا۔ لیکن اس مرتبہ اس کی انگلی نے بھی ٹرائیگر دیا دیا۔ اس کی راتقل سے نکلنے والی گولیاں دیوار میں پیوست ہونے لگیں۔ پھر وہ دھڑام سے گرا اور اس کی راتقل بھی خاموش ہو گئی۔

طفیل نے نوکھا کی بھینک چیتوں کی آواز سن لی تھی۔ وہ کار کی آڑ سے نکل کر دوڑتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا۔ اندر کھڑے ہی اس نے نوکھا کو خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر فائرنگ کرنے لگا۔

نوکھا کی چیتوں کی آواز شارق نے بھی سنی تھی۔ وہ چیخا ہوا ساتھ والی کوٹھی کی طرف دوڑا اور دیوار پر چڑھ کر حاجی والی کوٹھی میں کود گیا اور درختوں کی آڑ سے کمروں کی کھڑکیوں کی طرف فائرنگ کرنے لگا۔

ثمینہ اور عرفان کو بھی کوٹھی تک آنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ بھی اندھا دھند فائرنگ کر رہے

کاٹتے ہوئے بولی۔ ”تم سمجھتے تھے یہاں محفوظ ہو۔ ہم نے تمہیں جان بوجھ کر مہلت دے رکھی تھی۔ وہ مہلت ختم ہو رہی ہے۔ اب تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ اس دوران اگر تم اپنے ساتھیوں سمیت ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے بلکہ بڑے احترام سے پولیس کے حوالے کر دیں گے لیکن ٹھیک پندرہ منٹ بعد تمہاری کوٹھی پر حملہ شروع ہو جائے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھو۔ تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔“ ثمینہ نے جواب کا انتظار کئے بغیر فون بند کر دیا، جینز کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر ٹیلی فون سیٹ کے قریب رکھا اور واپس آکر کار میں بیٹھ گئی۔

کار نے پہلے گلی کا چکر لگایا۔ نوکھا اور طفیل کار سے اتر کر بڑی تیزی سے سامنے والی کوٹھی کے آگے کھڑی ہوئی ایک کار کے پیچھے چھپ گئے۔ ان دونوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور چادروں کے اندر راتقلیں چھپی ہوئی تھیں۔

کار اوپر سے گھوم کر نالے والی طرف آگئی۔ شارق نے پہلے ثمینہ کو اتارا پھر عرفان کو اور چند گز آگے جا کر کار روک لی اور نیچے اتر کر کار کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ثمینہ اور عرفان نالے میں اتر گئے تھے۔ اس طرح انہیں نالے کی منڈیر کی آڑ مل گئی تھی۔

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ سڑک پر اور گلی میں بھی لوگوں کی آمدورفت تھی۔ اندیشہ تھا کہ گلی میں آنے جانے والا کوئی آدمی فائرنگ کی زد میں نہ آ جائے۔ لیکن نوکھا کو اطمینان تھا کہ فائرنگ شروع ہوتے ہی لوگ گھروں میں دبک جائیں گے۔

حاجی کو دی ہوئی مہلت کے پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی ثمینہ نے نالے میں پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے کوٹھی کی طرف اچھال دیا۔

پتھر غالباً برآمدے کی چھت پر گرا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد اندر سے فائرنگ شروع ہو گئی جس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ بھی مقابلے کیلئے تیار بیٹھے تھے۔ شارق، ثمینہ اور عرفان نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔

فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گلی ایک دم سناں ہو گئی۔ لوگوں نے اپنے گھروں کی بتیاں بجھا دیں۔ ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی کار کے پیچھے چھپے ہوئے نوکھا نے بھی فائر کھول دیا۔

رب نواز اس طرف والے برآمدے کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی چلائی ہوئی گولیوں نے کار کو چھلتی کر دیا۔ کار کے دوسری طرف سے طفیل نے فائر کھول دیا۔ رب نواز اس کی گولیوں کی زد میں آ گیا اور وہ چیخا ہوا برآمدے کی چھت سے

تھے۔ اور پھر شارق نتائج کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھ آیا۔ اس نے بھی نوکھا کی لاش دیکھ لی مگر اور اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

طفیل۔ تم اس طرف سے فائرنگ جاری رکھو میں اندر جا رہا ہوں۔“ شارق چیخا ہوا برآمدے کی طرف دوڑا۔

اس نے پیر کی ٹھوک سے دروازہ کھولا تو حاجی ایک طرف سے دوڑتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر فائر کیا مگر اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ شارق موت کے فرشتے کی طرح ام کے سامنے کھڑا تھا۔ شارق نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فائر کھول دیا۔ حاجی کے جسم میں کئی سورا ہو گئے۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بڑی خوفناک تھیں۔

دوسری طرف ثینہ اور عرفان کو بھی اندر آنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ بھی اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اور پھر ثینہ چیخ کر گری۔ اس کی ٹانگ میں گھٹنے سے کچھ اوپر لگی تھی۔

طفیل بھی اندر آگیا۔ شارق پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو چن چن کر ختم رہا تھا۔ طفیل اور عرفان بھی اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔

اور پھر ان کی فائرنگ کا جواب دینے والا کوئی نہیں رہا۔ کونسی میں مختلف جگہوں پر حاجی اور اس کے ساتھیوں کی چھ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ساتویں لاش نوکھا کی تھی جو برآمدے میں پڑی تھی۔ ثینہ زخمی تھی اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ گولی ران کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

”عرفان گاڑی لے کر آؤ جلدی کرو۔“ شارق چیخا۔

”اس طرف مقصود کی پیکیرو کھڑی ہے۔“ طفیل چیخا۔ ”اسی طرف سے نکلو۔“ اس نے باہر آکر نوکھا کی لاش کندھے پر لادی۔ شارق نے زخمی ثینہ کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ عرفان دوڑتا ہوا باہر آگیا۔ پیکیرو کا دروازہ لاک نہیں کیا گیا تھا اور چابی بھی انکیشن میں موجود تھی۔

نوکھا کی لاش پچھلی سیٹ پر ڈال دی گئی۔ ایک سیٹ پر شارق ثینہ کو لے کر بیٹھ گیا اور عرفان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحہ پیکیرو ایک زور دار جھٹکے سے آگے بڑھی اور گلی سے نکل کر تیز رفتاری سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

○

نوکھا کی لاش ہال کمرے میں چارپائی پر پڑی تھی۔ شاہ پری لاش سے لپٹی بلک بلک کر رو رہی

نی۔ شاہ پری اور ان کا ساتھ افغانستان سے تھا۔ وہ نوکھا سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ ان ب نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔ کسی ایک کو معمولی سی تکلیف بھی ہوتی تو سب تڑپ اٹھتے اور اب نوکھا کی زخموں سے چور لاش دیکھ کر رضیہ اور شاہ پری اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ شاہ پری کی حالت تو بہت خراب تھی۔ رضیہ کو شارق اس کمرے میں لے گیا جہاں اس نے زخمی ثینہ کو لٹایا تھا۔

اتفاق سے دو دن پہلے رضیہ نے بازار سے کچھ ایسی دوائیں منگوالی تھیں جو ایسے موقع پر کام آسکتی تھیں۔ رضیہ نے ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے شارق کو باہر نکل جانے کا اشارہ کیا اور شاہ پری کو اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا۔

وہ تقریباً ”آٹھ گھنٹے بعد باہر نکلیں۔ شارق نوکھا کی لاش کے پاس کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ رضیہ کو دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ رضیہ نے کہا۔ ”گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے ڈریسنگ کر دی ہے چند روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔“

شارق ثینہ کے کمرے میں آگیا۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ شارق کو دیکھ کر وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے نوکھا کے پاس لے چلو پلیز؟“

شارق چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ ثینہ کو سہارا دے کر ہال کمرے میں لے آیا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ ثینہ نے زخمی ٹانگ آگے کو پھیلا لی تھی۔ نوکھا کی لاش دیکھ کر ثینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

عرفان اور طفیل بھی آنسو بہا رہے تھے۔ شاہ پری تو چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی تھی۔

”طفیل۔“ شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ حاجی سے مقابلے کے بعد تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو گے۔“

”ہاں شارق باؤ۔“ طفیل بولا۔ ”میں صبح ہی اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”صرف تم ہی نہیں ہم سب۔“ شارق بولا۔ ”حاجی کا گروہ ختم ہو گیا ہے اور حاجی کے خاتمے کے ساتھ ہی ہمارا مقصد بھی پورا ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی اور حاجی پیدا ہو گا تو اس کا راستہ

روکنے کیلئے کوئی اور شارق اور نوکھا بھی آجائے گا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا جائے۔ تم سب لوگوں کا کیا خیال ہے۔“

وہ تقریباً ”ایک گھنٹے تک مشورہ کرتے رہے اور پھر سب نے شارق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر

گیٹ پر کھڑے ہوئے پولیس والے مستعد ہو گئے۔ ایک انسپٹر بیورو کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تقریباً "پچاس گز آگے جا کر شارق نے بیورو روک لی۔ وہاں ڈی آئی جی اور پولیس کے کئی اعلیٰ افسران کھڑے تھے۔ ان میں ایس پی سہیل بھی تھا۔ شارق نے انجن بند کر دیا۔ چند لمحے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا اور پھر نیچے اتر آیا۔ عرفان اور طفیل نے بھی نیچے اتر کر نوکھیا کی لاش کو گاڑی سے نکال کر نیچے رکھ دیا۔

اور پھر ان سب نے اپنی اپنی رائفلیں بیورو سے نکال لیں۔ ایس پی سہیل ڈی آئی جی کے ساتھ کھڑا تھا۔ سب سے پہلے شارق نے آگے بڑھ کر اپنی رائفل ایس پی سہیل کے قدموں میں رکھ دی۔ ثمینہ اور عرفان وغیرہ نے بھی اس کی تقلید کی اور پھر ان سب نے اپنے ہاتھ آگے بڑھ دیئے۔ ڈی آئی جی نے اشارہ کیا۔ شارق اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ ان آفیسروں کے ساتھ اخبارات کے رپورٹر بھی کھڑے تھے۔ انہوں نے شارق اور ثمینہ کو گھیر لیا لیکن شارق اور ثمینہ نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ جب انہیں پولیس کی گاڑی میں سوار کر لیا جانے لگا تو شارق نے ایس پی سہیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میری خواہش ہے کہ نوکھیا کی تدفین پورے احترام سے کی جائے اور مجھے اس کے جنازے میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ ثمینہ زخمی ہے اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ اسے مناسب علاج کی ضرورت ہے اور شاہ پری افغان لڑکی ہے اسے ہم افغانستان سے لے کر آئے تھے یہ بے گناہ ہے اور میری ماں اور بہن کا خیال رکھا جائے۔

"شارق صاحب۔" ایک پریس رپورٹر چیخا۔ "آپ اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"اس وقت صرف اتنا کہوں گا کہ کسی شریف آدمی کو جرم کے راستے پر نہ دھکیلا جائے۔ پولیس میں بدعنوان اور راشی لوگوں کی نہیں ایس پی سہیل جیسے ذمہ دار، دیانتدار اور فرض شناس لوگوں کی ضرورت ہے۔ باقی مجھے جو کچھ بھی کہنا ہے عدالت میں کہوں گا۔ اگر مجھے کسے کی اجازت دی گئی تو۔"

وہ لوگ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی حرکت میں آ گئی۔ ڈھائی سال پہلے ایک معصوم بچے پر ظلم و استبداد سے جو ڈرامہ شروع ہوا تھا وہ اپنے پیچھے ایک طویل خونچکاں داستان چھوڑ کر ختم ہو گیا۔

ختم شد

لیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شارق بیورو پر کہیں چلا گیا۔ اس کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ بیورو میں ایک بوری رکھی ہوئی تھی جس میں سونے کے بٹکت بھرے ہوئے تھے۔ یہ سونا تھا جو تقریباً "چار مہینے پہلے قصور کے علاقے میں حاجی کے آدمیوں سے چھینا گیا تھا۔ اور پھر تین بجے کے قریب شارق ٹیلی فون پر ایس پی سہیل سے بات کر رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا شارق۔" ایس پی سہیل کہہ رہا تھا۔ "چھ آدمیوں کا قتل کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ صبح جب یہ خبر اخبارات میں چھپے گی تو پورے شہر میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔"

"ہنگامہ نہیں جشن۔" شارق نے کہا۔ "حاجی کے قتل اور اس کے گروہ کے خاتمے پر لوگ جشن منائیں گے۔"

"میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنے آپ کو روک لو شارق۔" سہیل نے کہا۔ "اب تم وقت ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ۔"

"میں نے آپ کا مشورہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" شارق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ساتھیوں سمیت صبح چھ بجے اپنے آپ کو آپ کے سامنے سرنڈر کرنے کو تیار ہوں۔ صبح چھ بجے مینار پاکستان کے سامنے۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھئے کہ اگر اس وقت پولیس والے نے ہم پر رائفل اٹھانے کی کوشش کی تو ہم بلا لحاظ فائر کھول دیں گے اور مرنے سے پہلے تمہیں آدمیوں کو ختم کر دیں گے۔"

"تم فکر مت کرو ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔" سہیل نے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب تاثر تھا۔ "مجھے تمہارے اس فیصلے پر خوشی ہوئی۔ میں ابھی ڈی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں لیکن ایسا نہ ہو کہ آخری وقت پر تم اپنا فیصلہ بدل دو۔"

"میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بدل نہیں سکتا۔" شارق بولا۔ "صبح ٹھیک چھ بجے مینار پاکستان کے سامنے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

اور پھر ٹھیک پانچ بجے وہ کوٹھی سے نکل گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شارق تھا اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر ثمینہ اور شاہ پری۔ پچھلی سیٹ پر رضیہ، عرفان اور طفیل تھے۔ آخری سیٹ کی جگہ سفید چادر سے ڈھکی ہوئی نوکھیا کی لاش پڑی تھی۔

مینار پاکستان کے سامنے سڑک پر دور تک پولیس کے مسلح جوان کھڑے تھے۔ گیٹ کے ا دو سوچ لان میں بھی پولیس والے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ سڑک پر بسوں اور دوسرے ٹریفک آمدورفت جاری تھی۔

شارق نے شاہی قلعہ کے عین سامنے مینار پاکستان کے لان والے گیٹ میں بیورو موڑ